ندوۃ المصنفین دہلی کا علمی و دینی ماہنامہ

بُرہان

مُرتّبہ

سعید احمد اکبرآبادی

ندوۃ المصنفین کی دینی اور اجتماعی کتابیں

اسلام کا اقتصادی نظام

وقت کی ایک اہم انقلاب انگیز کتاب جس میں اسلام کے معاشی نظام کا جامع نقشہ پیش کیا گیا ہے، چوتھا ایڈیشن۔ قیمت عہ، مجلد سے

اسلام کا نظام مساجد

نظام مساجد کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث اور اسکی منفعتوں اور برکتوں کی تفصیل۔

قیمت ہے مجلد للعہ

اسلام میں غلامی کی حقیقت

مسئلہ غلامی کی تحقیق پر ندوۃ المصنفین کی معرکۃ الآرا کتاب جس میں انفرادی اور اجتماعی غلامی کے ایک ایک پہلو پر اسلام کا نقطۂ نظر پیش کیا گیا ہے، قیمت سے، مجلد للعہ

قرآن اور تعمیر سیرت

ایک عظیم الشان اصلاحی کتاب

قرآن مجید کی تعلیم و تربیت کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور اس تعلیم کے ذریعہ سے اس سیرت و کردار کا کس طرح ظہور ہوتا ہے یہ متبرک کتاب خاص اسی موضوع پر لکھی گئی ہے۔ ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساس کمتری کے اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتے کو مضبوط کرنے میں چراغ راہ کا کام دے گی۔

قیمت عہ، مجلد سے

ارشادات نبوی کا لاثانی ذخیرہ

اردو زبان میں

ترجمان السنہ:- ہماری زبان میں حدیثوں کی ایسی جامع اور مستند کتاب آج تک وجود میں نہیں آئی تھی اس میں عربی متن مع اعراب بھی ہے اور صاف و سلیس ترجمہ بھی، ساتھ ہی محققانہ تشریحی نوٹ بھی ہیں۔ ترتیب میں کتاب التوحید کو پہلے رکھا گیا ہے اور پھر اسی مناسبت سے پوری کتاب کی ترتیب قائم کی گئی ہے پہلی جلد کے شروع میں کئی سو صفحات کا ایک مقدمہ ہے

جلد اول قیمت عـ٥ مجلد عـ٥ — جلد دوم قیمت لعہ مجلد لعہ

فہم قرآن: قرآن مجید کے آسان ہونے کے کیا معنی ہیں کلام ربانی کا قطعی منشاء معلوم کرنے کے لئے آنحضرت کے ارشادات و اقوال کا معلوم کرنا کیوں ضروری ہے اس کتاب کا اصل موضوع یہی ہے ایک بہترین تبلیغی اور اصلاحی کتاب ہے۔

وحی الٰہی: مسئلہ وحی کے تمام گوشوں پر دل پذیر بحث، وحی کی حقیقت اور اس کی صداقت سمجھنے کے لئے لاجواب کتاب۔

قیمت سے مجلد للعہ

مینیجر ندوۃ المصنفین اردو بازار جامع مسجد دہلی

برہان

جلد ۳۳ — شمارہ ۱

جولائی ۱۹۵۴ء مطابق ذیقعدہ ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

مدارسِ عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

از

(سعید احمد)

(۲)

جو ہونا تھا وہ ہو چکا: اور واقعہ یہ ہے کہ بہت سی فروگذاشتوں اور کوتاہیوں کے باوجود مدارسِ عربیہ نے ہندوستان میں دین و علم کی جو خدمات انجام دی ہیں وہ بحیثیت مجموعی اپنی جگہ پر بہت شاندار اور قابلِ قدر ہیں اور ان کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہو سکتا ہے جب کہ ہندوستان کے مسلمانوں کے علمی و مذہبی حالات کا موازنہ و مقابلہ اسی زمانہ کے ممالک اسلامیہ کے ساتھ کیا جائے لیکن بہرحال اب جدید حالات اور قومی و بین الاقوامی انقلابات و تغیرات کا شدید تقاضا ہے کہ مدارس عربیہ اپنی ہیئت و ترکیب اور اپنے نظام پر از سر نو دیدہ وری کے ساتھ غور کریں، اور جہاں تبدیلی کی ضرورت ہو تبدیلی پیدا کریں۔

دینی تعلیم کا مقصد

اس سلسلہ میں سب سے پہلے معلوم یہ کرنا چاہئے کہ دینی تعلیم کا مقصد کیا ہے؟ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں کہ مدارس عربیہ میں دینی تعلیم کا اصل مقصد یہ ہے کہ دین کے اصل سرچشموں سے براہِ راست واقفیت پیدا کر کے دینی احکام و مسائل کا علم علیٰ وجہ البصیرت حاصل کیا جائے تاکہ اس پر دو نتیجے مرتب ہوں ایک یہ کہ جب احکام و مسائل کا علم علیٰ وجہ البصیرت ان کے مآخذ اور منابع کی روشنی میں ہوگا تو اس سے خود صاحبِ علم کے عمل میں پختگی، مضبوطی اور استحکام و رسوخ

پیدا ہو گا اور دوسرا یہ کہ وہ دوسروں کو جن کی رسائی دین کے اصل سرچشموں تک نہیں ہے۔ اور اس بنا پر یا تو سرے سے ان میں عمل کا ہی فقدان ہے یا عمل ہے تو بغیر علم کے جس کو حدیث میں "ضلال" کہا گیا ہے، ان کو دینی احکام و مسائل بتائے جا سکیں۔ عدم علم کے باعث ان کے عقیدہ میں جو خامی اور کمزوری ہے وہ دور کی جا سکے اور جن کے دماغ میں کسی وجہ سے کچھ تشکوک و شبہات ہیں ان کو دور کیا جا سکے۔ اسی کو مختصر لفظوں میں اس طرح کہہ سکتے ہیں کہ دینی تعلیم کا مقصد مسلمانوں کی علمی و عملی رہنمائی ہے، اگرچہ اس رہنمائی کا ابتدائی تعلق مسلمانوں سے ہے، لیکن چونکہ اسلام ایک تبلیغی مذہب ہے۔ وہ تمام بنی نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لئے ہے اور علما اس امانت کے امین ہونے کی وجہ سے اللہ کی طرف سے اس پر مامور ہیں کہ وہ اسلام کی آواز دنیا کے ہر گوشہ میں پہنچائیں اس بنا پر دینی تعلیم کا مقصد جہاں مسلمانوں کی رہنمائی ہے دنیا کو دعوت الی الحق دینا بھی ہے۔

حصول مقصد کے طریقے

اس مقصد کو حاصل کرنے کے طریقے مختلف ہو سکتے ہیں، لیکن چونکہ ذکر مدارس عربیہ کا اور ان کے فارغ التحصیل طلبار کا ہے اس لئے ان کی مناسبت سے ہم یہاں صرف انھیں طریقوں کا ذکر کریں گے جو جو مدارس عربیہ کے دائرۂ اختیار و عمل میں آتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے مقدم یہ امر ہے کہ علوم دینیہ کی تحصیل کیوں کر کی جائے یہ ظاہر ہے کہ دین کا اصل سرچشمہ صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ! آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جن چیزوں کی تبلیغ کی ان کا ماخذ صرف یہی دو چیزیں ہیں۔ فقہ اگرچہ اپنی اصل کے اعتبار سے ساتھ ساتھ آیا لیکن باقاعدہ مذاہب اربعہ کی شکل میں اس کی ترتیب و تدوین بعد میں ہوئی، اس بنا پر اس میں کوئی شبہ نہیں کہ علوم دینیہ میں کتاب و سنت کے علاوہ فقہ اور اس کے متعلقات بھی شامل ہیں اور ہونے چاہئیں لیکن ان تینوں میں جو طبعی ترتیب ہے ان کے مطالعہ و درس میں بھی وہی ترتیب قایم رکھنی چاہیے اور ان تینوں میں جو

فرقِ مراتب ہے ذہنی اور فکری طور پر اس فرق کو مرعی رکھنا چاہئے گویا ہمیں قرآن و سنت کا
مطالعہ کرتے وقت یہ حقیقت فراموش نہ کرنی چاہئے کہ دین کا اصل ماخذ یہی دو چیزیں ہیں
اور نہ صرف مذاہبِ اربعہ بلکہ ان کے علاوہ فقہ کے اور بھی بہت سے مذاہب و مسالک
جو اب دنیا سے ناپید ہو چکے ہیں یا جن کے ماننے والے خال خال ٹیونس، الجزائر، مغربِ اقصیٰ
یا نجد و شام اور یمن و عمان کے علاقوں میں پائے جاتے ہیں ان سب کا استخراج و استنباط
بھی انھیں سرچشموں سے ہوا تھا اور اس بنا پر ان دونوں کی حیثیت جو ماخذ اور متبوع ہونے
کی ہے وہ قایم رکھنی چاہیے۔ مدارسِ عربیہ میں عام نقص یہ ہے کہ جب طالب علم قرآن یا
سنت کا مطالعہ شروع کرتا ہے تو شعوری یا غیر شعوری طور پر اس کے دماغ پر یہ خیال مسلط
ہوتا ہے کہ وہ حنفی ہے یا شافعی ہے، مالکی ہے یا حنبلی ہے اور اس احساس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے
کہ وہ قرآن و سنت کے تمام نصوص و عبارات کو اسی ایک نگاہ سے دیکھتا اور اسی کے مطابق
فیصلے کرتا چلا جاتا ہے اس بنا پر اس کا نقطۂ نظر محدود، اور اس کی قوتِ استخراجِ مسائل پابند
اور اس کا طریقۂ افہام و تفہیم غیر وسیع اور جمود آشنا ہوتا ہے اور زیادہ افسوسناک یہ ہے
کہ قرآن و سنت میں دیدہ وری و بصیرت کوشی کی نوبت ہی کم آتی ہے۔ وہ مذاہبِ فقہ
کی موشگافیوں اور ان کی نکتہ آفرینیوں میں ہی الجھ کر رہ جاتا ہے۔ قرآن و سنت سراپا
نور ہیں، سرتاسر ہدایت ہیں، زندگی کے ہر شعبہ پر ان کی تعلیمات حاوی اور مشتمل ہیں اس بنا
پر ظاہر ہے کہ جب ان کا مطالعہ اصل کی حیثیت سے وسعتِ نظر اور غیر جانب داری کے
ساتھ ہوگا تو دین کے افہام و تفہیم کے لئے بھی نئے نئے میدان ہاتھ آئیں گے اور دین کی
جامعیت۔ افادیتِ عامہ اور اس کی ہمہ گیری کا یقین و اذعان پیدا کیا جا سکے گا۔

قرآن و سنت کی تعلیم و تدریس سے متعلق اگر بنیادی طور پر مذکورۂ بالا اصول کو صحیح مان
لیا جائے تو پھر لامحالہ یہ ماننا پڑے گا کہ چونکہ قرآن اور سنت کا سب ذخیرہ عربی زبان میں
ہی ہے اس بنا پر جب تک عربی زبان میں مہارت اس کے مختلف اسالیبِ بیان

سے مکمل واقفیت اور زبان کے نکات ورموز کا صحیح ذوق نہیں ہوگا قرآن وسنت کا مطالعہ خاطر خواہ طریقہ پر نہیں ہوسکتا۔ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ صرف عربی سے اردو میں ترجمہ کی صلاحیت واستعداد اس مقصد کو حاصل کرنے کے لئے کافی نہیں ہے۔ زبان کے سینکڑوں ہزاروں نکات واسرار ہیں جو اس زبان میں مہارت اور مادری زبان کی طرح اس کا ذوق پیدا کئے بغیر نہیں معلوم ہوسکتے۔ بعض اوقات ایک جملہ اپنی ترکیب کے اعتبار سے جملہ مثبتہ ہوتا ہے لیکن درحقیقت اس کے معنی نفی کے ہوتے ہیں کبھی ایک جگہ دیکھنے میں موکدہ ہوتا ہے۔ اس میں مبالغہ کا صیغہ استعمال کیا جاتا ہے لیکن ایک صاحب ذوق بتائے گا کہ یہاں نہ تاکید مراد ہے اور نہ مبالغہ مقصود ہے۔ بلکہ تاکید اور مبالغہ کا استعمال کسی ایک ایسے امر خارجی کی وجہ سے ہوا ہے جس کا نسبت رابطہ یا حکم کلام کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہے۔ مثالیں بہت سی پیش کی جاسکتی ہیں لیکن ہم یہاں صرف ایک مثال اور وہ بھی قرآن سے پیش کرتے ہیں اصول فقہ کی عام کتابوں میں قرآن مجید کی آیت "لَكُمْ دِينُكُمْ وَلِيَ دِينِ" کی نسبت لکھا ہوا ہے کہ یہ منسوخ التلاوۃ نہیں بلکہ منسوخ الحکم ہے حالانکہ سیاق صاف طور پر بتا رہا ہے کہ اس آیت کا مفہوم تخییر نہیں بلکہ یہ بطور زجر وتوبیخ ہے اور یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ ایک باپ اپنے بیٹے کو سمجھاتا ہے کہ فلاں کام نہ کرو۔ مگر بیٹا نہیں مانتا تو باپ جھنجلا کے اور بگڑ کے کہتا ہے کہ "اچھا! جو تمہارے جی میں آئے کرو۔ تم جانو تمہارا کام" ظاہر ہے کہ باپ کے اس کہنے کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہوتا کہ اس نے بیٹے کو آزادی دے دی ہے اور اب اس کو اختیار ہے کہ وہ باپ کی نصیحت کے خلاف جو چاہے کرے بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ جہاں تک فہمائش کا تعلق ہے اس نے اپنا فرض ادا کردیا ہے اب اگر اس پر بھی وہ نہیں مانتا تو اس کے عواقب ونتائج کا ذمہ دار وہ خود ہوگا! یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسا کہ قرآن مجید میں ایک مقام پر مجرم کو خطاب کرکے فرمایا گیا ہے۔

ذُقۡ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَزِیۡزُ الۡكَرِیۡمُ

اس بنا پر قرآن مجید کی آیت مذکورہ کی نسبت یہ کہنا کہ وہ منسوخ الحکم ہے صحیح نہیں ہے بلکہ وہ اپنی جگہ پر قایم ہے

اب غور کیجئے کہ ہمارے مدارس میں عربی زبان کا ذوق پیدا کرنے کے لئے کیا کچھ کیا جاتا ہے؟ اور اس پر کیا نتایج مرتب ہوتے ہیں؟

مدارسِ عربیہ میں صرف ونحو کی تعلیم اس طرح دی جاتی ہے کہ گویا وہ خود اصل مقصود ہیں اور طالب علم کا مطالعہ بجائے فنی کے کتابی ہو کر رہ جاتا ہے اس کو کافیہ ازبر ہوتا ہے، شرح جامی کے مباحث پر نوک زبان ہوتے ہیں لیکن اول تو یہ سب کچھ پڑھ لینے کے بعد فنی معلومات اوران کی تمرین وممارست کتنی ہوتی ہے؟ اور پھر جہاں تک زبان کے ذوق کا تعلق ہے وہ اس میں کتنا پیدا ہوتا ہے؟ اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ اصل مقصد زبان کی تحصیل ہے صرف ونحو تو اس کے لئے صرف بمنزلہ آلہ وذریعہ کے ہیں تو پھر کیا یہ افسوس ناک بات نہیں ہے کہ وسیلہ وذریعہ پر ہی اس قدر وقت صرف کیا جاتا ہے کہ طالب علم اس میں الجھ کر رہ جاتا ہے اور اصل مقصد درمیان سے غایب ہو جاتا ہے

ہمارے درسِ نظامی میں صرف ونحو کی جو کتابیں شامل ہیں وہ ایک ایسے دور کی لکھی ہوئی ہیں جو مسلمانوں کے انحطاط کا دور تھا اور اس بنا پر ان میں غیر ضروری طباعی وذہانت اور حد درجہ موشگافی ونکتہ آفرینی کا جو مظاہرہ کیا گیا ہے ان کا تعلق صورت وظاہر سے زیادہ اور حقیقت ومعنی سے کم ہے حالانکہ خود راقم الحروف کا اپنا تجربہ ہے کہ ایک متوسط درجہ کی استعداد و ذہانت رکھنے والے طالب علم کے لئے دو سال صرف ونحو کی تکمیل اور ان کے مسائل پر مبصرانہ نگاہ رکھنے کے لئے کافی ہیں۔

ان کے علاوہ یہ بھی دیکھنا چاہئے کہ مدارسِ عربیہ میں صرف ونحو کی تعلیم جس طرح دی جاتی ہے اس سے قرآن فہمی کی استعداد کتنی پیدا ہوتی ہے ان سب پر کتنا وقت خرچ

ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں جو علم حاصل ہوتا ہے وہ کتنا ہوتا ہے اور جو علم حاصل ہوتا ہے اس کی عملی افادیت کس قدر ہوتی ہے بحث کو مرتب و منظم کرنے کے لئے مدارس عربیہ میں جو علوم پڑھائے جاتے ہیں ہم ان کو تین حصوں پر تقسیم کرتے ہیں۔

(۱) علوم عربیہ۔

(۲) علوم دینیہ۔

(۳) علوم غیر دینیہ۔

اب ہم فرداً فرداً ان میں سے ہر ایک پر نمبروار گفتگو کریں گے۔ (باقی آئندہ)

۱

حقیقتِ تصوف

فقر و احسان یا رہبانیت و خانقاہیت

از

(جناب مولوی محمد قطب الدین احمد صاحب حیدرآباد دکن)

یہ مقالہ Academy of Islamic studies حیدرآباد دکن کی Cultural Study circle کے دوسرے اجلاس میں ۲۹ مارچ ۵۲ء کو پڑھا گیا۔

زذوقِ ما نشود باخبر مذاقِ سقیم　　　درست ذائقہ داند مذاقِ شکرِ ما

توطیۂ مبحث

اصطلاحات کے گورکھ دھندوں سے گذر کر جب ہم اسلامی تصوف کا ژرف نگاہی سے مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں تعلیماتِ اسلامی میں اُس کا مقام ایک مرکزی اہمیت کا حامل نظر آتا ہے۔ انسان کے جسم میں جو اہمیت قلب کو حاصل ہے کچھ اسی قسم کی مرکزیت تصوف کو اسلامی تعلیمات میں ہے حضورؐ کا ارشاد ہے کہ جسم میں ایک ٹکڑا ہے، اگر وہ درست رہے تو تمام اعضاء و جوارح اصلاح پذیر رہتے ہیں اگر اس میں کوئی خرابی واقع ہوئی تو جسم کا پورا نظام درہم برہم ہو جاتا ہے، ایک حدیث میں حضرت ابو بکرؓ کی فضیلت کا سبب نماز روزے کو نہیں بلکہ ان کی اعلیٰ قلبی کیفیت کو قرار دیا گیا ہے۔

مَا فَاقَ اَبُوْبَکْرٍ بِکَثْرَۃِ الصَّلٰوۃِ وَالصِّیَامِ	ابو بکرؓ نے کثرت صلوٰۃ و صیام سے فوقیت حاصل
وَلٰکِنْ بِشَیْءٍ وُقِرَ فِیْ قَلْبِہٖ وَلِھٰذَا	نہیں کی بلکہ یہ بلندرتبگی اس چیز کے سبب
ظَھَرَ مِنْ اَحْوَالِہٖ مَا لَمْ یَظْھَرْ مِنْ	ملی جو ان کے قلب میں ڈال دی گئی ہے جس

احوال غیرہ کے سبب سے ان کی ذات سے اپنے احوال وامور کا صدور ہو اجود دسروں سے نہ ہو سکا

تو سمجھا نہیں اے زاہد ناداں اس کو رشک صد سجدہ ہے اک لغزش مستانہ دل

مسند احمد ابن حنبلؒ میں اخلاق کی ستودگی کی بابت حضورؐ کا فرمان ہے کہ انسان حسن اخلاق سے وہ درجہ پا سکتا ہے، جو دن بھر روزہ رکھنے اور رات بھر عبادت کرنے سے حاصل ہوتا ہے۔ حضورؐ سے کسی نے سوال کیا کہ دین کیا ہے اس کے جواب میں ارشاد ہوا حسن اخلاق اور پسندیدہ خصائل۔ ترمذی کی ایک حدیث میں کامل الایمان اس کو قرار دیا گیا ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں معجم طبرانی میں ایک روایت کے بموجب پاکیزہ اخلاق بندوں کو محبوبیت الٰہی کا درجہ عطا کیا گیا ہے الفاظ اس طرح ہیں: اللہ کے بندوں میں سب سے پیارا وہ ہے جس کے اخلاق سب سے اچھے ہوں قرآن میں تزکیہ باطن اور تعلیم کتاب وحکمت کو نبوت کے اولین کاموں میں شمار کیا گیا ہے وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ تصوف کی اساسی تعلیم اسی اصلاح باطن سے متعلق ہے۔ ابوالحسن نوریؒ تصوف کی ان الفاظ میں توضیح کرتے ہیں: تصوف نہ رسوم ہیں نہ علوم، بلکہ وہ صرف اخلاق فاضلہ کا نام ہے، ابو علی قزوینیؒ مختصراً اس کی یوں تعریف کرتے ہیں

التصوف هو الاخلاق الرضيه — تصوف پسندیدہ اخلاق کا نام ہے۔

ابو محمد الجریری کا قول ہے کہ تصوف نیک خصلتوں سے خود کو آراستہ کرنا اور بری عادتوں سے قلب کا تخلیہ کرنا ہے۔ حضورؐ نے اپنی بعثت کا مقصد مکارم اخلاق کی تتمیم بیان فرمائی ہے، قرآن حکیم دین ودنیا کی صلاح وفلاح کا انحصار تزکیہ اخلاق کو قرار دیتا ہے قَدْ أَفْلَحَ مَنْ زَكَّاهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسَّاهَا قلب کے تخلیہ، تصفیہ، تجلیہ اور تحلیہ کی تمام تر کوششیں اسی کی صحت وسلامتی کو برقرار رکھنے اور ترقی دینے کے لئے جاری رہتی ہیں، کیونکہ حیات عبادت ہے دل زندہ سے:۔

مجھے یہ ڈر ہے دل زندہ تو نہ مر جائے ۔۔۔ کہ زندگانی عبارت ہے تیرے جینے سے

اس چیز کو پیش نظر رکھ کر جب ہم صوفیاء کے اشغال و اعمال پر نگاہ ڈالتے ہیں، تو ہمیں معلوم ہوتا ہے کہ ان کی تمام تر مساعی اسی مرکز کے گرد گھوم رہی ہیں۔ ان حضرات نے قلب کی اصلاح کے مختلف ذرائع و تدابیر اختیار کیں اور وقت کے تقاضوں اور ہر شخص کے لئے اس کے ذوق و صلاحیت کا اندازہ کر کے، مختلف علاج تجویز کرتے رہے، ان گوناگوں طریقہ ہائے علاج کو کبھی اور کسی وقت اساسی حیثیت نہیں دی گئی، چنانچہ یہی وجہ ہے کہ باہم مختلف المزاج افراد کی اصلاح و درستگی کسی ایک ہی طریقہ پر نہیں کی گئی اور پھر یہ طریق علاج مختلف عہدوں اور ملکوں میں حالات، اور تمدن و معاشرت کے لحاظ سے بدلتے رہے کسی وقت اوراد و اشغال پر زور دیا گیا کسی عہد میں مراقبات و مجاہدات کی گرم بازاری رہی، اور کسی زمانہ میں عشق و سرمستی کی چاک دامانی و دل باختگی۔ ذہنِ انسانی کی اصل گمراہی یہی ہے کہ وہ اپنی کوتاہ اندیشی سے ذرائع کو مقاصد سمجھ بیٹھتی، اور اصل و نقل میں فرق و امتیاز کرنے سے قاصر رہتی ہے جیساکہ عارف رومیؒ نے کہا ہے:۔

ہر ہلاک امت پیشیں کہ بود ۔۔۔ زانکہ بر چندل گماں بردند عود

اس قصور فہم کا نتیجہ مختلف گمراہیوں کی صورت میں ظہور پذیر ہوا کسی نے تصوف کو یونانی افکار و خیالات کا نتیجہ قرار دیا اور اشراقیت و رواقیت کے رنگین آبگینوں سے اسے دیکھنا شروع کیا کسی نے زرتشتیت اور سمنیت سے آلودہ دیکھا اور کسی نے برہمنیت اور ویدانتی فلسفوں کو اس پر اثر انداز پایا یہ ساری غلط اندیشیاں ان کے ظن و تخمین کی نقش آرائیاں تھیں اور یہ اپنے قلب و نظر کے عکس زار میں خود اپنی ہی تصویریں دیکھ رہے تھے۔

ہر کسے از ظن خود شد یارِ من ۔۔۔ وز درونِ من نہ جست اسرارِ من

صوفی کا مادۂ اشتقاق

یہاں ہم بالاجمال تصوف کے مادۂ اشتقاق پر روشنی ڈالتے ہیں۔ اس خصوص میں ارباب تحقیق کے اقوال

اتنے مختلف اور باہم دگر متباین ہیں کہ ان میں سے ہر ایک اپنے لئے ایک نئی راہ کا شیدائی نظر آتا ہے، کوئی اس کو اہلِ صفہ سے منسوب گردانتا ہے، کوئی بھیا سوفی سے ماخوذ بتلاتا ہے، کوئی لفظِ صف سے کوئی صفا سے، کوئی صفوت القفاد سے، اور کوئی صوف سے اس کو مشتق بتلاتا ہے لیکن جیساکہ شیخ ہجویریؒ نے کہا ہے کہ ان میں سے کسی نے بھی مقتضائے لغت کی طرف توجہ نہیں کی، لغتِ عرب کی رو سے اگر یہ لفظ ان مادوں سے بنتا تو اس کی شکل کچھ اور ہوتی۔

عام طور پر اربابِ تصوف اس پر متفق ہیں کہ یہ لفظ صوف سے نکلا ہے جیساکہ کتاب اللمع میں ابونصر سراجؒ نے کہا ہے کہ "صوفیا اپنے ظاہری لباس کی وجہ سے صوفی کہلائے یہ اس لئے کہ بھیڑوں کی اون کے کپڑے پہننا انبیاء، اولیاء اور برگزیدہ ہستیوں کا ہمیشہ سے شعار رہا ہے، کہا یہ جاتا ہے کہ لفظ صوفی کا اطلاق سب سے قبل، دوسری صدی ہجری کے وسط میں، شیخ ابوہاشم کوفیؒ کے لئے ہوا۔ نفحات الانس میں جامیؒ نے اپنی یہی تحقیقات پیش کی ہے" اول کسیکہ وے را صوفی خواندہ اند وے بود پیش از وے کسے را باین نام نخواندہ بودند" لیکن بعض سندوں سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس لفظ کا استعمال پہلی صدی ہجری میں شروع ہوچکا تھا، امیر معاویہ نے گورنر مدینہ کے نام ایک خط لکھا تھا جس میں لفظ صوفی کو کسی شعر میں بطور تمثیل استعمال کیا گیا تھا۔ امام قشیری نے اس لفظ کے آغاز کے متعلق اپنے رسالہ میں اس طرح تشریح کی ہے:۔

"رسول اللہ کے بعد برگزیدہ مسلمانوں کا صحابہ کے سوا اور کوئی لقب قرار نہیں دیا گیا، کیوں کہ شرفِ صحبت سے بڑھ کر اور کوئی شرف نہیں ہوسکتا تھا، پھر جن لوگوں نے صحابہ کی صحبت پائی، ان کو تابعین کہا گیا اس کے بعد لوگ تبع تابعین کے لقب سے پکارے گئے پھر لوگوں کے مختلف درجے ہوتے گئے اس لئے جن بزرگوں کی توجہ دین کی طرف زیادہ ہوئی ان کو زاہد و عابد کے لقب سے پکارا گیا لیکن جب بدعات کا ظہور ہوا اور مختلف فرقے پیدا ہوئے، تو

ہر فریق نے یہ دعویٰ کیا کہ ان میں زہاد پائے جاتے ہیں اس لئے خواص اہل سنت صوفیار کے نام سے ممتاز ہوتے اور دوسری صدی سے پہلے ان بزرگوں نے اس نام سے شہرت پائی۔"

تصوف کا سرچشمہ و ماخذ

فقر و شاہی وارداتِ مصطفٰےؐ ہست — ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفٰےؐ است
ایں دو قوت از وجودِ مومن ہست — ایں قیام و آں سجودِ مومن است

تصوف کا سرچشمہ و ماخذ اصلاً کتاب و سنت ہے قرآن کی متعدد آیات و نصوص سے صریحاً اس کا ثبوت ملتا ہے اور اگر اعتبارات و اشارات کو بھی کام میں لایا جائے تو کتاب الٰہی کا ایک زائد حصہ اس سے مملو نظر آئے گا۔ حضور رسالتؐ کی حیاتِ طیبہ کے مختلف پہلوؤں پر اگر غور کیا جائے، جو چشم بصیرت میں از سرتاپا اس کتاب مبین کی ایک جیتی جاگتی تفسیر تھی تو اس مرقع میں ہمیں فقر و احسان کے نمایاں خد و خال ہر محل پر دعوت فکر و نظر دیتے ہیں ذاتِ رسالت تمام انسانی کمالات اور صفاتِ حسنہ کا کامل مجموعہ تھی، اور ہر وصف اپنے درجۂ کمال پر پہنچا ہوا تھا۔ اب عالم انسانیت کو نمونہ و مثال کے لئے کسی دوسری طرف نظریں دوڑانے کی ضرورت نہیں رہی

دست قمر شگاف تو کرد آستیں نشیں — از انفعال معجزہ دست کلیم را

آپ دنیائے انسانیت اور تمام زمانوں کے لئے ہدایت و رحمت اور ہادی و پیشوا بنا کر مبعوث کئے گئے تھے اس لئے سیرت پاک میں ہر شخص اور ہر وقت کے لئے ایک جامعیت موجود ہے جس کی جیسی کچھ طلب و صلاحیت ہے، اور زمانہ جن باتوں کا متقاضی ہے، اس کو یہاں ہر چیز ضرورت کے مطابق پوری پوری مل جاتی ہے۔ حضور کا اسوہ حسنہ ہر ایک کے آگے کتاب و سنت کی صورت میں بین الدفتین موجود ہے، جس وصف اور فن میں جو کوئی کمال حاصل کرنا چاہتا ہے اس کی سب تشنگی اسی سرچشمہ سے دور ہو سکتی ہے اور جو کوئی کسی ایک وصف کے علاوہ دیگر اوصاف میں بھی اختصاص و کمال حاصل کرنا چاہتا ہے،

وہ بھی اسی درسگاہ سے سندِ فضیلت حاصل کرسکتا ہے۔ اس کارگاہِ عالم میں ذاتِ اقدس کی مثال ایک سراجِ منیر کی سی ہے، جس کے نور سے ہر گوشہ میں علم و عمل کی محفلیں ترتیب دی ہوئی ہیں۔

یک چراغ ست دریں خانہ کہ از پرتوِ آں — ہر کجا می نگرمی انجمنے ساختہ اند

کہا جاتا ہے اور نہایت بے باکی سے، محل بے محل اس کا اظہار ہوتا رہتا ہے کہ اسلامی تصوف یونانی، عجمی اور ہندی خیالات و افکار کا رہینِ منت ہے۔ تصوف کے خلاف اس قسم کی پہلی آواز جو اٹھی وہ مستشرقین یورپ مثل نکلسن، ڈوزی اور فان کریمر وغیرہ جیسے لوگوں کی طرف سے تھی۔ اہل اللہ کے اشغال و اعمال کی حقیقت کو یہ لوگ کیا جانیں، جن کی سرگذشتِ حیات تراشیدم، پرستیدم، شکستم کی مصداق اور ساری تگ و دو اس دوروزہ زندگی کی عیش کوشیوں اور کام جوئیوں میں بسر ہوتی ہے۔

در بہاراں زاد و مرگش در دی است — پشہ کے داند کہ بستاں از کی است

یورپین اہلِ فکر کا ہمیشہ سے یہ وطیرہ رہا ہے کہ وہ اسلام کے متعلق ایسی چیزوں کی تلاش میں رہتے ہیں، جو سابقہ ادیان و ملل یا فلسفیانہ مکاتب خیال میں مشترک رہی ہوں جب ایسی کوئی چیز انھیں مل جاتی ہے تو وہ بلا توقف و تحقیق، فاتحانہ انداز میں اسلام کو ان کا خوشہ چیں اور مقلد قرار دینے لگتے ہیں۔ حالانکہ اگر اس معاملہ میں ذرا غور و فکر سے کام لیں تو صرف اس کے لئے اتنی دیدہ ریزی کی چنداں ضرورت نہیں۔ اسلام کا از اول تا آخر یہ دعویٰ ہے کہ وہ کوئی نئی چیز دنیا کے سامنے پیش نہیں کر رہا ہے۔ اس کی تمام چیزیں از آدم تا ایں دم حیات و کائنات کی وہ چند بنیادی صداقتیں ہیں، جن کی تعلیم و تلقین تمام انبیا اور صاحبِ عزم و یقین ہستیاں دیتی چلی آئی ہیں۔ اسلام نام ہے ان ہی چند بنیادی صداقتوں کے مجموعہ کا جن کا مختلف عہدوں میں انبیاء کی طرف سے اعلان ہوتا رہا۔ تصوف کے متعلق بھی مستشرقین کی خوش فہمیاں اسی نوعیت کی ہیں۔ مگر اب اس قسم کے خیالات کی خود ان ہی میں سے

بعض لوگوں نے تردید شروع کردی ہے چنانچہ لوئی میسی نون، ولبر فورس کلارک اور آربری کا رجحان اسی طرف ہے۔ ان میں سے مقدم الذکر، جو مستشرقین یورپ میں تصوف اسلام پر سب سے بڑا عالم مانا جاتا ہے بڑی تحقیق سے یہ ثابت کیا ہے کہ تصوف کا ماخذ قرآن و حدیث ہے اور یہ تحریک خالصتاً اسلامی ہے۔ آربری نے بھی اپنی کتاب صوفزم (Sufism) میں یہی تحقیقات پیش کی ہے، ہمیں ان کے اعتراف و قبول سے نہ خوشی ہوتی ہے اور نہ رد و انکار سے دل تنگی، حقیقت اپنی جگہ ثابت اور اٹل ہے، خواہ اسے کوئی مانے یا نہ مانے۔

از رد و ہم قبولِ تو فارغ نشستہ ایم　　اے آنکہ خوبِ ما نشناسی ز زشتِ ما

ہم چاہیں تو اپنے اس دعوے کی تائید میں کہ تصوف قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے، ان تمام تعلیماتِ اخلاق کو پیش کر سکتے ہیں، جن کا کتاب و سنت میں مختلف مقامات پر ذکر آیا ہے۔ فضائلِ اخلاق کی جتنی بھی تعلیم ہے ان کا تمام تر تعلق فقر و احسان یعنی تصوف ہی سے ہے۔ مقام و وقت کی تنگ دامانی اس امر کی متقاضی نہیں کہ ہم یہاں ایسی ان تمام آیتوں اور حدیثوں کا احصار کریں جو فضائلِ اخلاق پر مشتمل ہیں ہم وارفتگانِ تفصیل و اطناب کو امام نوویؒ کی کتاب ریاض الصالحین کی طرف رجوع کرتے ہیں جس میں تصوف کے مہماتِ مسائل سو سے زائد عنوانات کے تحت نصوصِ قرآنی اور احادیث رسولؐ سے موثق و مستند کئے گئے ہیں۔

ایک سیدھی سادی بات، جس کا ادراک ایک معمولی فہم والا بھی بآسانی کر سکتا ہے، یہ ہے کہ اطاعت و انقیاد کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں۔ ایک اطاعت اس قسم کی ہے کہ بس حکم کی تعمیل کردی جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ نہ صرف تعمیل کی جائے بلکہ اس امتثال امر میں پوری تندہی، دلچسپی اور حسن و خوبی کو کام میں لایا جائے اور کوشش اس امر کی ہو کہ جو کچھ سر انجام پائے وہ قلب و دماغ کی پوری یکسوئی، جسم و جان کی کامل ہم آہنگی اور ذوق و نظر کی ساری دل آویزی کے ساتھ منازلِ تکمیل تک پہنچے اس اندازِ عبودیت کا نقشہ ایک حدیث میں اس

طرح کھینچا گیا ہے،

أُعْبُدْ رَبَّكَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ فَإِنْ لَمْ تَكُنْ تَرَاهُ فَإِنَّهُ يَرَاكَ

اپنے رب کی بندگی اس طرح کر کہ گویا تو اس کو دیکھ رہا ہے، اگر تو اس کو نہیں دیکھتا تو یہ سمجھ کہ اس کی نظریں تجھ پر ہیں۔

بندگی وطاعت کی ایسی ہی صورت کو قرآن وحدیث میں احسان سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی سنوارنے اور حسن و خوبی پیدا کرنے کے ہیں، تصوف اپنی مختلف تدبیروں اور طریقوں سے بندگی و عبادت میں یہی والہانہ انداز پیدا کرنا چاہتا، اور مجبوری کی تلخیوں کو حضوری کی لذتوں سے بدلنا چاہتا ہے، تاکہ طاعت کسی نوع سے بھی ایک عمل کبیر یا بارِ گراں ہونے کے بجائے، ایک قلبِ خاشع کے لئے آنکھوں کی ٹھنڈک، روح کی سکینت اور قلب کی طمانینت بن جاتی ہے، جیسا کہ اقبالؔ نے کہا ہے۔

پس طریقت چیست اے والا صفات
شرع را دیدن بہ اعماقِ حیات

فاش می خواہی اگر اسرارِ دیں
جز بہ اعماقِ ضمیر خود مبیں

گر نہ بینی، دینِ تو مجبوری است
ایں چنیں دیں، از خدا مہجوری است

تصوف وطریقت کی اصل حیثیت کو سمجھنے کے بعد یہ کہنا کس قدر حقیقت فراموشی ہے کہ یہ دین و شریعت کے مغائر ومنافی ہے۔ جس طرح فقہائے ظاہر نے قرآن وحدیث سے - - - - - - ظاہر و قالب کے شرعی احکام مستنبط کئے ہیں، ایسے ہی فقہائے باطن، صوفیا نے قلب و باطن کے شرعی احکام کتاب و سنت سے مرتب و مدون کئے ہیں یہ دونوں شریعت ہی کے دو رخ ہیں۔

بہار عالم حسنش دل وجاں تازہ می دارد
برنگ اصحابِ صورت را، بہ بو اربابِ معنی را

مولانا تھانویؒ نے اپنے ایک رسالہ میں اس تعلق پر بڑی خوش اسلوبی سے روشنی ڈالی ہے

"شریعت کے اندر جن اعمال کے کرنے اور جن کے نہ کرنے کا حکم دیا گیا ہے، وہ دو قسم

کے ہیں، بعض کا تعلق ظاہر بدن اور ظاہری چیزوں سے ہے جیسے کلمہ پڑھنا، نماز روزہ حج زکوٰۃ ماں باپ کی خدمت ان کو مامورات کہتے ہیں۔ اور کلمات کفر کہنا، شرک کے افعال کرنا، زنا، چوری، سود خواری، رشوت وغیرہ ان کو ممنوعات کہتے ہیں بعض اعمال ایسے ہیں جن کا تعلق باطن سے ہے جیسے ایمان و تصدیق، عقائد حقہ، صبر و شکر و توکل، رضا بقضا، تفویض و اخلاص، محبت خدا و رسول وغیرہ ان کو مامورات و فضائل کہتے ہیں۔ اور عقائد باطلہ، بے صبری، ناشکری، ریا و تکبر عجب وغیرہ یہ مناہی و رذائل ہیں جن سے شریعت نے منع کیا ہے۔"

"جس طرح قرآن میں اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ موجود ہے اسی طرح یا ایّھا الذین اٰمنوا اصبروا اور واشکروا اللہ بھی موجود ہے۔ اگر ایک مقام پر کُتِبَ عَلیکم الصیام اور للہ علی الناس حج البیت پاؤگے۔ تو دوسرے مقام پر یحبھم ویحبونہ اور والذین اٰمنوا اَشَدُّ حُبًّا للہ بھی دیکھوگے، جہاں اذا قاموا الی الصلوٰۃ قاموکسالیٰ ہے اسی کے ساتھ یراؤن الناس بھی موجود ہے۔"

"اس بات سے کون مسلمان انکار کرسکتا ہے کہ جس طرح اعمال ظاہرہ حکم خداوندی ہیں، اسی طرح اعمالِ باطنہ بھی حکم خداوندی ہیں کیا اقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ امر کا صیغہ ہے اور اصبروا واشکروا امر کا صیغہ نہیں، کیا کتب علیکم الصیام سے روزہ کی مشروعیت اور مامور بہ ہونا ثابت ہے اور والذین اٰمنوا اشد حبا للہ سے محبت کا مامور بہ ہونا ثابت نہیں، بلکہ اگر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا ظاہری اعمال سب ہی باطن کی اصلاح کے لئے ہیں اور باطن کی صفائی مقصود موجب نجات اور اس کی کدورت موجب ہلاکت ہے

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَکّٰھَا ۝ وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰھَا	بے شک جس نے نفس کو صاف کیا کامیاب رہا اور جس نے اس کو گندہ کیا ناکام رہا۔
یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ اِلَّا مَنْ	جس دن مال و اولاد کام نہ آئیں گے، مگر جو شخص

اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ — اللہ کے پاس سلامت قلب لے کر آیا

دیکھو پہلی آیت میں تزکیۂ باطن کو موجب فلاح اور دوسری میں سلامتی قلب کے بغیر مال و اولاد سب کو غیر نافع بتلایا ہے ایک جگہ خشوع فی الصلوٰۃ کو مومنوں کے لئے وسیلۂ نجاح و فلاح گردانا گیا ہے۔ قد أفلح المومنون ۰ اَلَّذِیْنَ ھُمْ فِیْ صَلٰوتِھِمْ خَاشِعُوْنَ۔

"ایمان و عقائد جن پر سارے اعمال کی مقبولیت منحصر ہے قلب ہی کا فعل ہے اور ظاہر ہے کہ کہ جتنے اعمال ہیں سب ایمان ہی کی تکمیل کے لئے ہیں پس معلوم ہوا کہ اصل مقصود دل کی اصلاح ہے الا وان فی الجسد مضغۃ اذا صلحت صلح الجسد کلہ واذا فسدت فسد الجسد کلہ الا وھی القلب کے یہی معنے ہیں کہ بدن کے اندر جو قلب ہے اگر وہ بنا تو سب کچھ ٹھیک ہے اور اگر وہ بگڑا تو سب چیزیں فساد پذیر ہو جاتی ہیں۔

عشق و محبّت

تصوف کے جس زاویہ سے بھی دیکھو اس کے ہر گوشہ میں عشق و محبت کی دنیائیں آباد نظر آتی ہیں یہ عشق ہی کی کرشمہ سازیاں ہیں جو ایک مشتِ خاک کو محیر العقول کاموں پر ابھارتیں اور عقلِ مصلحت اندیش کے لئے سامانِ حیرت فراہم کرتی رہتی ہیں جب دل کی دنیا عشق سے جگمگا اٹھتی ہے تو کائنات کا ہر ذرہ جلووں سے معمور نظر آتا ہے، عشق وہ دروازہ ہے جس سے گذرے بغیر انسان، انسان نہیں ہو سکتا جس کے دل و جگر میں ٹیس اور آنکھوں میں نمی نہ ہو، اس کو معنی انسانیت سے کیا واسطہ! جو قلب لذت آشنائے درد نہ ہو وہ برف کی ایک قاش ہے جس کو پانی بنتے دیکھا گیا، مگر آگ میں جلتے ہوتے کبھی نظر نہ آئی، حالانکہ انسانیت کا مفہوم یکسر سوز و گداز ہے۔ جن کے دل محبتِ الٰہی سے سرشار رہتے ہیں، وہ راہِ خدا میں کانٹے کی ہر چبھن میں ایسی لذت حاصل کرتے ہیں جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹنے سے بھی نہیں ملتی اور عشق و شیفتگی کا یہ عالم ہوتا ہے کہ درد و اذیت کی ہر دکھن ان کی زندگی کا سرور اور دھڑکن بن جاتی ہے جس کے لئے وہ بعد

ذوق ہمہ وقت آرزومند رہتے ہیں

آنانکہ با حلاوت دردِ تو خو کنند　　زخمے بدل زنند و نمک آرزو کنند

عشقِ الٰہی کی اولین شرط یہ ہے کہ ماسوا سے آنکھیں بند کر لی جائیں۔ محبتِ الٰہی کا جذبہ جب انسان کے دل میں گھر کر لیتا ہے تو فکر و عمل کا کوئی گوشہ اس سے اثر پذیر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ عشق و محبت کی یہ تعلیم ہمیں قرآن ہی سے ملتی ہے، اہلِ ایمان کی تعریف "اشد حب" سے کی گئی ہے والذین آمنوا اشد حبا للہ اور اس محبت کے لئے ایک آسان نسخہ یہ تجویز کیا گیا ہے کہ جو اللہ تعالیٰ کا سب سے زیادہ محبوب ہے اپنی زندگی کو اس کے رنگ میں رنگ لو تو اللہ تعالیٰ کے سچے عاشق ہی نہیں بلکہ محبوب بھی بن جاؤ گے۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔ اقبال نے کس قدر حقیقت میں ڈوب کر یہ اشعار کہے ہیں۔

محبت از نگاہش پائیدار است　　سلوکش عشق و مستی را عیار است

مقامش عبدہٗ آمد و لیکن　　جہانِ شوق را پروردگار است

اتباعِ کتاب و سنت

استادانِ فرنگ کی قیاس آرائیوں کو وحی منزل سمجھ کر نام نہاد روشن خیال طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ تصوف کتاب و سنت سے ہٹی ہوئی ایک جداگانہ چیز ہے۔ حالانکہ حقیقت حال اس کے بالکل برعکس ہے، صوفیاً کتاب و سنت سے سرِمو تجاوز کو گناہِ عظیم تصور کرتے تھے، اس منزل کی رسم و راہ کے شناسا سید الطائفہ جنید بغدادیؒ، جو سلکِ تصوف کے واسطۃ العقد، اور چمنستانِ معرفت کے گل سرسبد ہیں، راہ طریقت کے حدود کا تعین اس طرح فرماتے ہیں۔ ایں راہ کے یابد کہ کتاب بدست راست گرفتہ باشد و سنت مصطفےٰؐ بدست چپ، و در روشنائی ایں ہر دو شمع می رود تا نہ در مغاک شبہت افتد و نہ در ظلمت بدعت۔ حضرت چراغ دہلیؒ اس سے بھی آگے بڑھ کر یہ اعلان کرتے ہیں کہ مشربِ پیر حجت نمی شود، دلیل از کتاب و حدیث می باید۔ حضرت مخدوم جہانیاں کا ارشاد ہے کہ ایک ولی کے لئے ممکن ہے کہ وہ ہوا میں اڑے، پانی پر

چاہے اس کے لئے زمین و آسمان کی طنابیں کھینچ جائیں لیکن وہ اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ وہ اپنی گفتار، رفتار اور کردار میں رسول اللہؐ کا سچا پیرو نہ ہو۔ حضرت اشرف جہانگیر سمنانی کا قول ہے کہ کوئی شخص اس وقت تک ولی نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ ظاہراً۔ باطناً، قولاً فعلاً، اعتقاداً اور حالاً شریعت کا پابند نہیں ہے۔ حضرت گیسو دراز کا قول ہے کہ مرید کو چاہیے کہ اپنے پیر کی باتوں کو شریعت کی میزان میں تولے، اگر اس کے مطابق ہو تو عمل کرے اور اگر کوئی بات بظاہر خلافِ شرع ہو تو اس پر غور و تامل کرے۔ شیخ سرہندیؒ کس قطعیت کے ساتھ غیر اسلامی مجاہدات و ریاضات کی نفی فرماتے ہیں: ریاضات و مجاہدات کہ بجا ورا تقلید سنت اختیار کنند معتبر نیست کہ جوگیہ و براہمہ ہند و فلاسفہ یونان دریں امر مشارکت دارند، وآں ریاضات در حق ایشاں جز ضلالت نمی افزاید و بغیر خسارت راہ نمی نماید۔ اتباع کتاب و سنت میں حکیم سنائی کے یہ اشعار ارباب تصوف کے دلی جذبات کی کیسی سچی ترجمانی کر رہے ہیں:۔

گرد قرآں گرد، زانکہ ہر کہ از قرآں گرفت	آں جہاں است از عقیدت، ایں جہاں است از فتن
گرد نعل اسپ سلطان شریعت سرمہ کن	تابود نورِ الٰہی باد و چشمت مقترن
ترہ در چشم سنائی تیر بادا چوں سناں	گر زمانے زندگی خواہد سنائی بے سنن

ارباب صحو و تمکین سے قطع نظر، جن کی زندگی کا ایک ایک لمحہ احکام شریعت کی تعمیل اور سنن و مستحبات کی پیروی میں بسر ہوتا تھا، ارباب سکر و حال کے احترام شریعت کا اندازہ بھی کچھ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کو شیخ محدث دہلویؒ نے اخبار الاخیار میں، بو علی قلندر پانی پتی کے تذکرہ میں سپرد قلم کیا ہے "وقتے شوارب وے بغایت دراز شدہ بود ہیچ کس را مجال آں نبود کہ بولے امر بقص آنہا کند، مولانا ضیاء الدین سنامی کہ جوش شریعت در بر داشت مقراض برگرفت و محاسن شریفش را در دست گرفتہ قص شوارب کرد گویند کہ بعد ازاں شیخ ہمیشہ محاسن خود را بوسیدے و گفتے کہ ایں در راہ شریعت محمدی گرفتہ شدہ است۔ یہ ان مجاذیب کی کیفیت تھی جو اپنے ہوش و خرد کا سرمایہ معشوق حقیقی کی نذر کر چکے تھے اور بایں سرمستی و بےخودی

اپنی ڈاڑھی صرف اس لئے چومتے رہتے تھے کہ وہ کسی وقت راہِ شریعت میں پکڑی گئی تھی،
کیا شرع و سنت کے ساتھ شیفتگی کا اس سے بھی بلند مقام کوئی اور ہو سکتا ہے؟

زخم چوں از تو رسد با ہمہ آزار خوشم — کے ز آزارِ تو بے زار شود جان حسیں

ارادت و ارشاد

طریق بیعت کوئی نو زائیدہ چیز نہیں۔ اخبار و آثار کی روشنی میں عہد رسالت ہی سے اس کا ثبوت ملتا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے اپنی کتاب القول الجمیل میں بیعت کی مختلف صورتوں کی اس طرح توضیح کی ہے :-

"رسول اللہ صلعم کے دست مبارک پر صحابہ بیعت کیا کرتے تھے، کبھی یہ بیعت ہجرت کے لئے ہوتی تھی اور کبھی جہاد کی غرض سے بعض اوقات ارکانِ اسلام کو پابندی سے ادا کرنے کے لئے بیعت لی جاتی تھی اور کبھی میدانِ جنگ میں کفار کے خلاف ثابت قدمی کے ساتھ لڑنے کے لئے بیعت کی صورت میں عہد و قرار ہوتا، اور کبھی سنت کو مضبوطی سے پکڑنے، بدعات سے محترز رہنے، اور طاعات و عبادات کو زیادہ سے زیادہ شوق و رغبت سے ادا کرنے کے لئے بھی بیعت لی جاتی تھی، الغرض یہ سب معاملات جن کے متعلق آں حضرتؐ نے بیعت لی ان کا تعلق محض خلافت سے نہیں ہو سکتا، بلکہ ان کا تعلق تزکیۂ اخلاق، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر وغیرہ جیسے امور سے ہے۔"

طریق تعبیر اور اصطلاحات کے تنوع سے فہم حقیقت میں کسی قسم کی غلطی نہ ہونی چاہئے۔ اس کو کسی دائرہ میں استاد و شاگرد سے تعبیر کیا جاتا ہے کسی مقام پر یہ نسبت رہبر و رہرو کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے اور کسی جگہ اس کو قائد و پیرو کا نام دیا جاتا ہے۔ نام گو مختلف ہیں، مگر نسبت و تعلق کی جو روح ان سب میں کارفرما ہے، اس کی نوعیت ایک ہی ہے۔ کیا کوئی علم بلا استاد کے، یا کوئی ہنر بلا کسی ہنرمند کے، یا کوئی راہ بلا کسی راہبر کے طے کی جا سکتی اور منزل مقصود تک پہنچا جا سکتا ہے، جب ہر دائرۂ عمل میں کسی واقف کار اور شناسا کی ضرورت ہے تو تصوف کے دائرہ میں کیوں اس کی ضرورت لاحق نہ ہو، مرشد و مرید کا بھی بس ایسا ہی تعلق ہے۔ زندگی کے دیگر دوائرِ عمل سے زیادہ معاملہ کی نزاکت اور راہ کی دشواریوں کے سبب۔ یہاں تو قدم قدم پر رہنما کی ضرورت ناگزیر ہے۔ ایسے ہی ہادی طریق کو اصطلاح میں

پیر یا مرشد کہا جا سکتا ہے۔

بیعت وارشاد کے معاملہ میں وحدت شیخ پر جو شدت وتاکید کی جاتی ہے وہ زیادہ تر دور انحطاط کی پیداوار ہے۔ اگر کسی شیخ کی صحبت وتعلیم سے خدا رسیدگی اور خاطر خواہ فیض واثر حاصل نہ ہو رہا ہو، تو واجب ہے کہ اس کو چھوڑ کر کسی دوسرے مرشد طریق سے وابستگی حاصل کی جائے، کیوں کہ اصل مقصود خدا تک پہنچنا اور اس کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اگر یہ طریقِ عمل اختیار نہ کیا جائے تو معبود ومقصود شیخ نہ کہ خدائے تعالیٰ ! شیخ عزیزاں رامیتنی انتخاب شیخ کے معاملہ میں اس طریقِ عمل کی ہدایت کرتے ہیں:-

با ہر کہ نشینی ونشد جمع دلت   وز تو نرمید صحبت آب وگلت
زنہار ز صحبتش گریزاں می باش   ورنہ نکند روح عزیزاں بحلت

اس کے علاوہ شیخ کی زندگی میں یا اس کے وصال پر کسی دوسرے شیخ سے بھی نسبتِ ارادت قایم کی جا سکتی اور دوسرے شیوخ سے استفادہ واستفاضہ کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے اولیار کے تذکرے بھرے پڑے ہیں۔ اثنائے کسب واکتساب میں یہ دنیائے اسلام کے مختلف گوشوں میں گھومتے پھرتے تھے اور ہر آستانہ اور مرکز ارشاد پر حاضر ہو کر فیض حاصل کرتے، اور جب خود ہدایت وارشاد کے منصب پر فائز ہو جاتے تو کسی ایک مقام کو منتخب کر کے اپنے فیوض وانوار سے ایک جہان کو منور کرتے رہتے تھے۔

مقصود ما ز دیر وحرم جز حبیب نیست   ہر جا کنیم سجدہ بداں آستاں رسد۔

مجدد الف ثانیؒ نے حضورؐ کے وصال کے بعد صحابہ کے خلفائے راشدین کے ہاتھ پر یکے بعد دیگرے بیعت کرنے کو اس امر کے جواز میں بطور استدلال کے پیش کیا ہے کہ اگر بیعت کوئی ایسی چیز ہوتی جو کسی کے ہاتھ پر ایک مرتبہ کی جانے کے بعد دوسرے کے ہاتھ پر نہ کی جا سکتی تو صحابہ حضرت ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ، علیؓ کے ہاتھوں پر کبھی بیعت نہ کرتے ان حضرات کی بیعت محض دنیوی امور کے لئے نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ کسب کمالات باطنی بھی اس کا مقصود تھا۔

اے سرو بتو شادم شکلت بہ فلاں ماند   اے گل بتو خرسندم تو بوئے کسے داری

(باقی)

عثمان رضؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

از
ڈاکٹر طٰہٰ حسین
مترجم
(مولانا عبد الحمید صاحب نعمانی)

(۲)

آپ کے خلفار نے بھی چاہا تھا کہ ایسا ہی کریں لیکن وہ نہ کر سکے حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اعلان کر رکھا تھا کہ جس افسر سے بھی کسی کو بلا وجہ تکلیف پہنچے گی وہ اس کا بدلا چکانے کے لئے تیار رہے، کہا جاتا ہے کہ حج کے موقع پر حضرت عمرؓ سے ایک شخص نے شکایت کی کہ ان کے گورنر نے بلا وجہ اس کو مار اپٹیا ہے، تحقیق کے بعد آپ نے فیصلہ کر دیا کہ فریاد دار اپنا بدلہ لے لے اب افسروں میں اس فیصلے سے بڑی بے چینی پھیلی اور انھوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ وہ گورنر کو معاف کر دیں اس لئے کہ بدلا چکانے کا فیصلہ حکومت کے وقار کو کم کر دے گا اور پھر عوام کا حوصلہ افسروں کے خلاف بڑھ جائے گا۔ حضرت عمرؓ نے باوجود انتہائی اصرار کے اس دلیل کو ماننے سے انکار کر دیا لیکن آخر کار اس بات پر آپ راضی ہو گئے کہ اگر فریادی رضامند ہو جائے تو میں معاف کر دوں گا کہ گورنر سے بدلہ نہ لیا جائے چنانچہ گورنر نے فریادی کو رضامند کر لیا اور قصاص سے بچ گیا حضرت عمرؓ کا کہنا یہ تھا کہ امت میں سب سے زیادہ برگزیدہ ہونے کے باوجود آنحضرت صلعم نے بدلا دیا ہے پھر یہ کس طرح ہو سکتا ہے کہ آپ کے خلفا اور حکمراں بدلا چکانے کی جگہ شاکی کو

رضامند کرلیا کریں یا بدلا پیش کرنے میں اپنے جبرو اکراہ کا اظہار کریں حضرت عثمانؓ سے جھگڑا کرنے والے اپنی دلیل میں پیش کرتے تھے کہ نبی کریم صلعم نے اپنی طرف سے بدلا چکایا ہے اور حضرت عمرؓ نے افسروں کی طرف سے رعایا کو بدلا دلانے کی کوشش فرمائی ہے لیکن حضرت عثمانؓ نے ان کی بات نہیں مانی، جو لوگ آنحضرت صلعم کی سیرت پر نظر رکھتے ہیں اور جو آپ کے سنن سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ آپ کسی بات میں بھی اپنے ساتھیوں پر اپنی برتری تصور نہیں فرماتے تھے، بجز ایک بات کے اور وہ وحی الٰہی کا آپ پر نازل ہونا۔ چنانچہ آپ اپنے اصحاب سے مشورہ کرتے تھے ان کا مشورہ قبول فرماتے تھے۔ ساتھی اگر جنگ کرتے تو آپ بھی لڑتے اور جب وہ صلح کرتے تو آپ بھی صلح کی باتیں کرتے، انھیں کے ساتھ مل کر مسجد کی تعمیر کرتے، خندق کھودتے، زمین کھودتے اور عمارت بنانے میں جو مشقت تھی اس میں تخفیف کے خیال سے صحابہ کے ساتھ آپ بھی نغمات گنگناتے، انھیں کے ساتھ پتھر اٹھاتے، مٹی ڈھوتے غرض اپنے آپ کو انھیں میں سے ایک تصور فرماتے ہاں امتیاز تھا تو صرف یہ کہ اللہ نے آپ کو نبوت عطا کی تھی چنانچہ آپ اس سے زیادہ کسی امتیاز کے روادار نہ تھے سنن اور سیرت کی روایات بتاتی ہیں کہ مرض الموت میں آپ نے سونے کی وہ تھوڑی مقدار جو مسلمانوں کے مال میں سے آپ کے پاس بچ رہی تھی منگوایا اور لوگوں کے حوالے کر دیا اور دنیا سے اس طرح رخصت ہوتے کہ نہ سونے کے مالک تھے اور نہ چاندی کے اس معاملے میں آپ نے اپنے نفس پر انتہائی سختی کی، خدا نے بھی یہ شدت روا رکھی اور چونکہ آپ کے ارشادات ذاتی خواہشوں کی بنا پر نہیں بلکہ وحی الٰہی کے تقاضے سے ہیں اس لئے نہ صرف یہ کہ صحابہ میں آپ نے اپنے لئے کسی امتیاز کو گوارا نہیں کیا بلکہ اپنے گھر والوں کو بھی اپنی طرح پابند رکھا اور فرمایا

نحن معاشر الانبیاء لا نورث ما ترکناہ صدقۃ

ہم انبیاء لوگ کسی کو وارث نہیں بناتے ہم نے جو کچھ چھوڑا ہے وہ صدقہ ہے،

آپ کی وفات کے بعد حضرت فاطمہؓ حضرت ابو بکرؓ کے پاس باغ فدک باپ کی وراثت میں مانگنے آئیں تو آپ نے دینے سے انکار کر دیا اور مذکورہ بالا حدیث ان کو پڑھ کر سنائی۔

پس سیرت نبوی نے لوگوں کے باہمی تعلقات میں اپنے اور لوگوں کے تعلقات میں نیز اپنے اہل بیت اور عام مسلمانوں کے تعلقات میں انصاف کو بنیاد قرار دیا تھا آپ کے خلفاء نے پوری کوشش کی کہ اپنے بس بھر آپ ہی کا راستہ چلیں بلکہ حضرت ابو بکرؓ نے تو اپنی طاقت سے باہر کام کرنے کا ارادہ فرمالیا اور چاہا کہ بیک وقت مسلمانوں کے امام بھی رہیں اور اپنے گھر کے کاروباری بھی، خلافت کے کاموں کے لئے بھی اپنا وقت اور قوت وقف رکھیں اور اپنے اہل وعیال کے لئے روزی کمانے کی مشقت بھی اٹھائیں مسلمانوں نے ایک دن دیکھا کہ آپ معمول کے مطابق کچھ سامان اٹھائے بازار کی طرف لیکے جارہے ہیں تاکہ اسے فروخت کر کے کچھ چیزیں خریدیں تب مسلمانوں نے توجہ کی یا باختلاف روایات خود حضرت ابو بکرؓ نے محسوس فرمایا کہ وہ بیک وقت خلافت اور فکر معاش دونوں ذمہ داریاں پوری نہیں کر سکتے اس لئے مسلمانوں نے ان کے لئے بیت المال سے کچھ مقرر کر دیا اور اس میں بھی فراخی یا فیاضی کی شان نہ تھی اتنی ہی مقدار مقرر کی جس سے گذر بسر ہو سکے،

نبی کریم صلعم کی سیرت کی اتباع میں حضرت ابو بکرؓ نے اپنے لئے حرج تصور فرمایا کہ دنیا سے ایسی حالت میں جائیں کہ ان کے پاس مسلمانوں کا کچھ مال رہ جائے چنانچہ آپ نے گھر والوں کو حکم دیا کہ ان کے پاس جو ھنات[1] رکھے ہیں وہ عمرؓ کو دے دیئے جائیں، حضرت عمرؓ انھیں دیکھ کر رونے لگے، عبدالرحمن بن عوف نے مناسب نہ سمجھا کہ حضرت عمرؓ انھیں دے لیں لیکن حضرت عمرؓ نے جس بات کو اپنے لئے حرج تصور فرمایا اسے اپنے ساتھی کے لئے بھی منظور نہیں کیا اور یہ نہ ہونے دیا کہ ابو بکر اپنے رب سے ایسی حالت میں ملیں کہ وہ ان سے سوال کرے کہ کیا تم نے ھنات عمر کو واپس کر دیئے تھے پھر ابو بکر جواب دیں کہ میرے گھر والوں نے

---

[1] معمولی سامان

تو پیش کر دیا تھا لیکن عمرؓ نے لینے سے انکار کر دیا۔

انصاف قائم کرنے کے لئے نبی کریم صلعم اور حضرت ابو بکرؓ کی آرزو اور حرص میں شدت کا یہ عالم تھا کہ پاکبازی اور نیک نیتی کی نگاہ میں جو بات حرج کی نہ تھی اس سے بھی احتیاط فرماتے تھے بلاشبہ اگر حضرت ابو بکرؓ کی خلافت کا زمانہ کچھ طویل ہوتا تو ہم حیرت انگیز واقعات پڑھتے، جب کہ دس ہی سال کے فرق نے حضرت عمرؓ کے دور میں وہ کچھ کر دکھایا جس کی تصدیق لوگوں کے لئے مشکل ہے چنانچہ بعض لوگ خیال کرتے ہیں کہ حضرت عمرؓ سے متعلق راویوں نے اپنی طرف سے اضافہ کر دیا ہے اور ان کی شدت اور احتیاط کے بیان میں مبالغے سے کام لیا ہے، لیکن جو لوگ سنن اور طبقات میں نیز تاریخ کی کتابوں میں حضرت عمرؓ کی سیرت پڑھتے ہیں وہ نہایت آسانی سے واقعات اور حوادث میں یہ پتہ چلا سکتے ہیں کہ حضرت عمرؓ کا مزاج اور ان کی افتادِ طبع کیا ہے؟ اور راویوں کا اضافہ کتنا۔

واقعہ یہ ہے کہ خدا کی ذات سے متعلق معاملات میں حضرت عمرؓ لوگوں کے لئے بڑے سخت گیر تھے، لیکن اپنی ذات کے لئے ان کی شدت لوگوں سے کہیں زیادہ تھی انسانیت کی پوری تاریخ میں میں نے بجز اولوالعزم کے کوئی فرد عمرؓ جیسا زندہ دل، حساس اور محتاط نہیں پایا جو نہ ڈرنے والی باتوں سے اپنے لئے خطرہ محسوس کرتا ہو جو اپنی ذات میں ان باتوں کو عیوب اور قصور تصور کرتا ہو جو عیب ہیں نہ قصور جو اپنے اوپر وہ سختی اور پابندی عائد کرے جو کوئی نہیں کرتا لوگ اچھی طرح جانتے ہیں کہ عام الرماد میں جب حضرت عمرؓ نے عوام کی تنگدستی اور فقر کو دیکھا تو خود انتہائی تنگدستی اور فقر و فاقہ کی زندگی جینے لگے،

جب آپ کو پتہ چلا کہ لوگوں کو گھی نہیں مل رہا ہے تو آپ نے اس کا استعمال چھوڑ دیا، سوکھی روٹی اور تیل پر صبر کرتے رہے پھر یہ تیل بھی آپ پر گراں گذرنے لگا آپ کو خیال آیا کہ شاید تیل پکنے کے بعد اپنی تیزی کھو دے اور ہاضم ہونے کے ساتھ لذیذ بھی ہو جائے چنانچہ اپنے غلام کو تیل پکانے کا حکم دیا لیکن جب آپ نے کھایا تو سخت تکلیف ہوئی اس کی وجہ

سے آپ کی صحت پر بھی بُرا اثر پڑا حتیٰ کہ آپ کا رنگ ... بدل گیا لیکن مسلمان آپ کو اس سے نہ روک سکے۔ اس لئے کہ آپ نے اپنی خوش خوراکی سے اس وقت تک کے لئے انکار کر دیا جب تک کہ عام مسلمان خوش حال نہ ہو جائیں۔

حضرت عمرؓ کے دل میں کبھی یہ خیال نہیں گذرا کہ وہ اتنی بڑی عظیم الشان طویل اور عریض سلطنت چلا رہے ہیں جو اپنے اندر غیر معمولی وسعت اور فتوحات رکھتی ہے وہ تو اس کو ایک حیرت کی بات خیال کرتے تھے اور تنہائی میں اپنے نفس کو یاد دلاتے تھے کہ اے خطّاب کے لڑکے آج تو امیر المومنین بن گیا ہے کل تک اسلام سے قبل تو ایک چرواہا تھا اور اپنے باپ خطّاب کی بکریاں چراتا تھا لوگ ابھی بھولے نہیں ان کو تو وہ جگہ بھی معلوم ہے جہاں تو جانور چراتا تھا اور یہ بھی یاد ہے کہ خطّاب تجھ سے کتنی سخت محنت اور کڑی خدمت لیا کرتا تھا حضرت عمرؓ مسلمانوں کے کسی کام میں خواہ وہ کتنا ہی سخت اور شاق ہو پہلو تہی نہیں فرماتے تھے چنانچہ ایک دن وہ صدقات کے اونٹوں کے باڑے میں چلے گئے اور ان کی کیفیت اور گنتی کا بڑی باریک بینی سے مطالعہ کر کے حضرت علیؓ کو بتاتے اور حضرت علیؓ حضرت عثمانؓ سے رجسٹر میں درج کرواتے حضرت علیؓ فاروق اعظمؓ کی اس کارروائی سے بہت محظوظ ہوتے اور قرآن مجید کی وہ آیت جو حضرت شعیبؑ کی لڑکی کی زبانی ہے یا ابت استأجرہ ان خیر من استأجرت القوی الامین اس کے بعد فرمایا قوی امین یہ ہیں، لوگوں نے دیکھا کہ حضرت عمرؓ چرواہوں اور معمولی آدمیوں کی طرح اونٹ کے بیٹھنے کے مقامات پر قطران[1] لگا رہے ہیں اور ایسا کرنے میں کوئی تکلیف اور حرج تصور نہیں فرماتے اپنی ذات پر اتنی سختی برداشت کرنے کے بعد گھر والوں کو بھی مجبور کرتے تھے۔ جب کبھی عوام میں کسی بات کی ممانعت کا اعلان فرماتے اور متنبہ کرتے کہ خلاف ورزی پر سزا دی جائے گی تو گھر والوں کو اکٹھا کرتے اور ان سے فرماتے کہ میں نے مسلمانوں کو فلاں کام سے منع کیا ہے اور خلاف ورزی

---

[1] بعض درختوں سے نکلنے والے روغنی مادے

پر سزا دینے کا اعلان کیا ہے لوگ میرے تعلق کی وجہ سے تم پر نظر رکھیں گے اگر مجھے پتہ چلا کہ تم میں سے کسی نے خلاف ورزی کی ہے تو اسے دوہری سزا دوں گا،

عام الرمادہ کے زمانہ قحط میں حضرت عمرؓ اپنے گھر کے کھانے پر بڑی کڑی نگرانی رکھتے تھے اگر کوئی اچھا کھانا یا زیادہ کھاتا تو بڑی سختی کے ساتھ اس کو روکتے، پھر جب خود سختی اٹھاتے گھر والوں کو برداشت پر مجبور کرتے تو اس میں کچھ مضائقہ نہ دیکھتے کہ لوگوں کے ساتھ وہ طرز عمل اختیار کیا جائے جس میں سختی ہو لیکن جبر نہ ہو، نرمی ہو لیکن وہ کمزوری کا پہلو نہ رکھتی ہو،

روایت ہے کہ ایک دن حضرت عمرؓ لوگوں میں کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے آپ کے گرد وپیش لوگوں کا غیر معمولی ہجوم ہو گیا اتنے میں سعد ابن ابی وقاص بھی آگئے اور ہجوم کو چیرتے پھاڑتے حضرت عمرؓ تک پہنچ گئے سعد ابن ابی وقاص کا دربار نبوی میں جو درجہ ہے وہ سب جانتے ہیں پھر فارس کی فتح کے سلسلے میں ان کی قربانیاں مسلّم ہیں، لیکن حضرت عمرؓ نے درّے سے ان کی خبر لی اور فرمایا

ان لم تهب سلطان الله فی الارض	زمین پر اللہ کی قوت سے تجھے خوف نہیں تو میں
فاردت ان اعلمك ان سلطان	تجھے بتانا چاہتا ہوں کہ اللہ کی قوت بھی تجھ سے
الله لا يهابك	نہیں ڈرتی۔

اس طرح حضرت عمرؓ حریصانہ آرزو رکھتے تھے کہ لوگ آپس میں برابری کا سلوک کریں اور خود اور ان کے گھر کے لوگ بھی عام مسلمانوں کے بالکل برابر ہوں،

یہ تمام باتیں حضرت عمرؓ کی خاص زندگی کے روزانہ معمولات سے متعلق ہیں اور ان میں خواہ کتنی ہی شدّت اور مشقّت کا پہلو ہو لیکن پھر بھی وہ آسان ہیں البتہ آپ کا وہ عام طرز عمل جسے آپ نے اپنے اور خلافت کے لئے ایک دستور العمل کی حیثیت دے دی تھی، ایک مشکل مہم تھی، جس کا ایک گوشہ آپ کا وہ طریق کار ہے جو جلیل القدر صحابہ اور اکابر انصار و مہاجرین سے تعلقات میں آپ نے برتا یہ لوگ دربار نبوت کے مقربان خاص اور اسلام

کے سابقین اولین میں تھے مسلمانوں کے تمام معاملات کی گتھی یہی سلجھاتے تھے، حضرت عمرؓ عوامی معاملات میں اپنے تمام اقدامات کی منظوری ان حضرات سے لے لیتے تھے، اور تمام اہم امور میں ان سے مشورہ فرماتے تھے آپ خیال کرتے تھے کہ میں ان کا والی ہوگیا ہوں لیکن رسول اللہ صلعم کے یہ صحابہ مجھ سے زیادہ بہتر ہیں تو اب مجھے کیا روش اختیار کرنی چاہیے اور ان کے لیے میرے طرز عمل کی نوعیت کیا ہو آپ نے سبھوں کے ساتھ نرمی اور دوراندیشی کا معاملہ کیا اور سب کو اپنا ساتھی، مخلص، یار غار اور مشیر بنالیا پھر بھی آپ ہر وقت چوکنا تھے کہ کہیں ان حضرات پر کوئی مصیبت نہ آپڑے یا یہ خود کسی مصیبت کا سبب نہ بن جائیں چنانچہ آپ نے ان سبھوں کو مدینہ منورہ ہی میں روک رکھا اور بغیر اجازت کہیں باہر جانے نہیں دیا۔ مفتوحہ ممالک میں بھی اجازت کے بغیر انھیں جانے کا حکم نہیں تھا، حضرت عمرؓ کو اول تو یہ اندیشہ تھا کہ کہیں لوگ ان کے گرویدہ نہ ہوجائیں پھر یہ کہ کہیں یہ لوگ عام مسلمانوں کی عقیدت کے فریب میں نہ آجائیں اور آخری یہ کہ کہیں ان تمام چیزوں کا خمیازہ حکومت کو نہ بھگتنا پڑے، اور یہ واقعہ ہے کہ بہت سے صحابہ اور خصوصاً مہاجرین پر یہ قید و بند بڑی شاق تھی اور اس کا پتہ اس طرح چلتا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہوتے ہی یہ بندش اٹھادی اور ان کو باہر جانے کی اجازت دے دی اور وہ مختلف مقامات پر جا بسے اور حضرت عثمانؓ کی اس پالیسی سے بہت خوش ہوئے لیکن ابھی زیادہ عرصہ نہیں گذرا تھا کہ انھیں لوگوں نے حضرت عثمانؓ کی جان ضیق میں ڈال دی اور وہی مصیبت پیش آئی جس سے حضرت عمرؓ ڈرتے تھے۔

حضرت عمرؓ نے ہر صحابی کو اس کے مرتبے، اسلام سے اس کی اسبقیت اور نبی صلعم سے اس کی قربت کے اعتبار سے روزینہ مقرر کردیا تھا اور ان کی رائے یہ تھی کہ یہ روزینہ مزید کاروبار سے ان کی بے نیازی کا باعث ہونا چاہیے لیکن انھوں نے اس وظیفے کے باوجود تجارت کی اور دولت کمائی اور تجارت واکتساب سے متمول اور دولت مندی میں غیر معمولی

اضافہ کرلیا اور وظیفہ کی مقدار بھی ترقی پذیر رہی۔ حضرت عمرؓ دیکھتے تھے لیکن وہ ان کو روک نہیں سکتے تھے اس لئے کہ وہ لوگ عہد نبوی میں بھی کاروبار اور تجارت کرتے تھے اور نبی کریم صلعم نے ان کو نہ کسی کاروبار سے روکا اور نہ تجارت سے، حضرت عمرؓ صحابہ اور غیر صحابہ کی اس قسم کی دولت وثروت کو اس فضل خداوندی کا ثمرہ تصور فرماتے تھے جو مال غنیمت اور سالانہ عطیات کی شکل میں ان پر تقسیم ہوتا تھا پس جو کچھ ہو رہا تھا اس سے وہ خوش نہ تھے چنانچہ فرمایا کرتے تھے۔

لو استقبلت من امری ما استدبرت	جو کام میں نے بعد میں کیا اگر پہلے کرتا تو
لاخذت من الاغنیاء فضول	دولت مندوں سے ان کی بڑھی ہوئی
اموالھم فرددتھا علی الفقراء	دولت لے کر غریبوں میں تقسیم کر دیتا۔

اور اگر حضرت عمرؓ کچھ دن اور زندہ رہتے تو تاریخ اسلامی ہمیں حیرت انگیز واقعات سناتی، فتوحات کی بدولت عہد فاروقی میں مسلمانوں میں مال و دولت کی ایسی بہتات ہوئی کہ حضرت عمرؓ دنگ ہو گئے اور صحابہ سے مشورہ کیا حضرت علیؓ نے گذشتہ روایات کی پابندی کرنے کا اور بدلے ہوئے حالات سے متاثر ہونے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ آیا ہوا سب مال تقسیم کر دیا جائے اور سال کے آخر میں ایک درہم و دینار بھی بیت المال میں ایسا نہ رہ جائے جو اس کے مستحق کے پاس نہ پہنچ گیا ہو حضرت عثمانؓ کی رائے تھی کہ دولت کی موجودہ کثرت سے مجھے خدشہ ہے اگر اس کا نظم قائم نہیں کیا گیا تو معاملات کا شیرازہ بکھر جائے گا پھر حضرت عمرؓ نے رجسٹر تیار کرائے لوگوں کے لئے روزینے مقرر کئے اور جو کچھ بچ رہا اسے مسلمانوں کے عام مصالح اور مفاد کے لئے بیت المال میں محفوظ رکھا۔

ابھی زیادہ وقت نہیں گذرا تھا کہ واقعات نے حضرت عثمانؓ کی رائے کو صحیح ثابت کر دیا جو ایک متمدن یا متمدن بننے والی حکومت کو پیش آنے والے معاملات کے موافق تھی جب عام الرماد میں قحط کے دن آئے تو حضرت عمرؓ بیت المال کے اندوختہ سے عوام کو اس

وقت تک مدد پہنچاتے رہیے جب تک دوسرے صوبوں سے امداد نہیں پہنچ گئی فاروق اعظمؓ فرمایا کرتے تھے کہ ہم بیت المال سے مسلمانوں کو کھلاتے رہیں گے اور جب دیکھیں گے کہ بیت المال خالی ہو چکا ہے تو محتاجوں کو حسب حیثیت دولت مندوں کے گھروں میں داخل کر دیں گے اس طرح ہم کسی مسلمان کو بھوکا نہیں رہنے دیں گے،

مال اور دولت کے متعلق حضرت عمرؓ کی اس پالیسی نے ان کے کام کو بڑی حد تک آسان کر دیا اور آپ کو زیادہ سے زیادہ اس کا موقع ملا کہ عوام کے ساتھ نرمی کا برتاؤ کریں اور بے لاگ انصاف کی روح ان میں پھونک دیں لیکن مالیات میں حضرت عمرؓ کا اس کے علاوہ ایک نقطۂ نظر تھا جس پر ان کی گہری اور تفصیلی نظر تھی، میں خیال کرتا ہوں کہ متمدن قومیں آج اس نقطۂ نظر تک پہنچنے کی کوشش کر رہی ہیں لیکن وہ شاید بڑی مشکل سے اس میں کامیاب ہوں گی۔

حضرت عمرؓ اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو خراج، جزیہ اور محاصل سے رقمیں آتی ہیں یہ سب کی سب تمام مسلمانوں کی ملکیت ہیں کسی ایک فرد یا ایک جماعت کو یہ نہیں دی جا سکتیں آپ کا یہ بھی خیال تھا کہ اس مال کی حفاظت اور مستحق تک اس کو پہنچا دینے کی ذمہ داری انھیں کے سر ہے، چنانچہ فرماتے تھے کہ اگر صدقات کے اونٹوں میں سے کوئی اونٹ زمین کے دور دراز حصہ میں کہیں بھاگ جائے یا اسے کہیں تکلیف پہنچ جائے تو میں ڈرتا ہوں کہ قیامت کے دن خدا مجھ سے اس کے متعلق بازپرس کرے گا، آپ فرمایا کرتے تھے کہ اگر میں زندہ رہا تو وہ دن آئے گا جب جبل صنعا کے ایک چرواہے تک اس مال سے اس کا حصہ پہنچے گا۔

آپ نے بیت المال سے ہر ایک کا روزینہ مقرر کر دیا تھا مردوں کے لئے عورتوں کے لئے بچوں کے لئے خستہ حال بوڑھوں کے لئے معذوروں کے لئے سب کے لئے الگ الگ، اور مطمئن تھے گویا جس انصاف کی آرزو رکھتے تھے وہ پورا ہو گیا لیکن ایک رات جب آپ

راہ سے گذر رہے تھے ایک بچے کو روتے ہوتے سنا اور چلے گئے، جب دوسری بار گذرے تو پھر رونے کی آواز سنی آپ نے اس کی ماں سے رونے کا سبب پوچھا اس نے یوں ہی کچھ کہہ کر ٹال دیا۔ لیکن جب آپ تیسری بار ادھر سے گذرے اور بچے کو روتا پایا تو اصرار کے ساتھ وجہ دریافت کی، ماں نے کہا اجی میں اس کا دودھ چھڑا رہی ہوں اس لئے کہ عمرؓ بچوں کا روزینہ اسی وقت مقرر کرتے ہیں جب وہ دودھ چھوڑ چکا ہو، یہ جواب سن کر بے تاب ہوگئے اور صبح ہوتے ہی اعلان کر دیا کہ بچوں کا دودھ چھڑانے میں جلدی نہ کی جائے ہم بچوں کے لئے پیدائش کے بعد ہی سے روزینہ مقرر کرتے ہیں۔

حضرت عمرؓ صدقات کی وصولی میں احکام خداوندی نافذ فرماتے تھے لیکن وصولی اور تقسیم میں حد درجہ احتیاط اور شدید پابندی فرماتے تھے لوگ جانتے ہیں کہ ایک اعرابی نے کسی دن نبی کریم صلعم سے دریافت فرمایا کہ کیا خدا نے آپ کو حکم دیا ہے کہ یہ مال آپ ہمارے دولتمندوں سے وصول کریں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیں حضرت نے جواب دیا۔ ہاں

اس کے پیش نظر حضرت عمر وصول کرنے والوں کو سخت تاکید فرماتے تھے کہ وہ جس قبیلے سے بھی صدقات اکٹھا کریں وصولی میں عدل وانصاف کی پوری شدت کے ساتھ پابندی کریں اور ہر قبیلے کے فقرار کو اس کے صدقات واپس کئے جائیں تاکہ وہ سوال کرنے کی ذلت سے بچ سکیں، پھر جو کچھ رقم بچ جائے اسے واپس کر دیں اس قسم کی بچی ہوئی رقم جب واپس آتی تو آپ اس کو ان مصارف کے لئے محفوظ کر لیتے جن کا تذکرہ قرآن مجید نے کیا ہے چنانچہ اس سے فقیر، مسکین، مسافر اور مقروضوں کی امداد فرماتے،

مجھے نہ اشتراکیت سے بحث ہے اور نہ شیوعیت سے اس لئے کہ حضرت عمرؓ نہ سوشلسٹ تحریک کے علمبردار تھے نہ کمیونسٹ تحریک کے لیڈر انھوں نے تو ملکیت کو تسلیم کیا ہی جس طرح نبی اور قرآن نے اس کو تسلیم کیا ہے انھوں نے سرمایہ داری اور دولت مندی کی اجازت دی جس طرح قرآن اور نبیؐ نے اجازت دی ہے مجھے تو یہ عرض کرنا ہے کہ سماجی انصاف ملکیت کو باطل اور سرمایہ داری

کو حرام کئے بغیر بھی قایم کیا جا سکتا ہے، جس کے لئے آج بعض جمہوریتیں کوشاں ہیں اور چاہتی ہیں کہ مالکوں کی ملکیت اور دولت مندوں کی سرمایہ داری کے باوجود سماجی انصاف عملی طور پر پیش کر دیں۔

میرے سامنے بیچ کا نظریہ ہے جس نے کوشش کی کہ حکومت عوام کو بلا آلۂ کار بناتے ان کی معاش اور ضروریات زندگی کی ضامن ہے وہ بے کاری اور ذلت سے دور رکھ کر ان کے لئے باعزت زندگی کا سامان کرلے،

میرے سامنے موجودہ جمہوریت کے دعوے اور حوصلے ہیں اور ان کی درماندگی اور ناکامی پھر میری نگاہ حضرت عمرؓ کے ارادوں اور ان کی تکمیل کی طرف جاتی ہے بلا تردد زبان سے نکل جاتا ہے کہ شاعر نے آپ کے مرثیے میں بالکل سچ کہا،

جزی اللہ خیرا من امام و بارکت
ید اللہ فی ذاک الادیم الممزق
فمن یجر او یرکب جناحی نعامة
لیدرک ما ادرکت بالامس یسبق
قضیت امورا ثم غادرت بعدها
بوائق فی اکمامها لم تفتق

حضرت عمرؓ کو اللہ تعالیٰ جزائے خیر اور برکت عطا فرمائے نعامہ پر سوار ہو کر بھی اگر کوئی چاہتا کہ جو کچھ آپ نے حاصل کیا ہے وہ پالے تو وہ پیچھے ہی رہ جاتا آپ نے بہت سے کام انجام تک پہنچائے لیکن بعض باتیں کھل کر سامنے نہ آسکیں،

اور پھر حضرت عمرؓ اپنے عاملوں اور والیوں کے ساتھ نرمی اور چشم پوشی کا برتاؤ روا نہیں رکھتے تھے بلکہ ان پر بڑی کڑی نظر رکھتے تھے، عامل بناتے وقت اس کے تمام مال و جائداد کی ایک فہرست تیار کروالیتے اور سبکدوشی کے موقع پر سخت جانچ فرماتے اگر فرق پاتے تو اس کے دو حصے کر کے ایک حصہ بیت المال میں داخل کر دیتے علاوہ ازیں بڑی باریک بینی سے یہ دیکھتے کہ ان عاملوں کا رعایا کے ساتھ کیا سلوک ہے اور ان کو خفیہ اور کھلم کھلا سخت

تاکید فرماتے کہ مسلمانوں کو کسی قسم کی تکلیف نہ پہنچائیں نہ جسمانی اور نہ مالی اس سلسلے میں آپ نے اپنے بعض عاملوں کو سرزنش بھی اور فرمایا

مذ کم تعبدتم الناس وقد ولدتھم امھاتھم احرارا؟ تم نے کب سے لوگوں کو غلام بنا لیا ہے ان کی ماؤں نے تو ان کو آزاد جنا تھا۔

روزانہ جب کوئی اہم اور مشکل امر پیش آجاتا آپ مدینہ میں رہنے والے صحابہ کو مشورہ کے لئے طلب فرما لیتے حج کے موقع پر اپنے عاملوں سے ملاقات اور بات کے لئے جگہ اور وقت مقرر فرما دیتے پھر رعایا کی باتیں عاملوں سے اور عاملوں کے بارے میں رعایا سے حالات سنتے اور تمام معاملات کا ٹھیک انتظام فرماتے میں یقین کے ساتھ کہہ سکوں گا کہ اگر حضرت عمرؓ کی زندگی کچھ اور وفا کرتی تو بلاشبہ آپ مسلمانوں کے شوریٰ کا ایک ایسا نظم تیار کر جاتے جو باقی رہتا اور مسلمانوں کو فساد و اختلاف سے اور حاکموں کو ظلم و تکبر سے بچاتا۔

میں نے ان مصائب اور مشکلات کا تذکرہ نہیں کیا جو حضرت عمرؓ کو مسلمانوں کے معاملات کے ٹھیک کرنے میں پیش آئیں اور جن کے بعد انھوں نے ملک پر ملک فتح کئے اور بڑے بڑے شہر بسائے اور ایک عظیم الشان عربی اسلامی حکومت کی بنیاد ڈالدی۔ اس لئے کہ میرے پیش نظر حضرت عمرؓ کی تاریخ لکھنا نہیں ہے اور نہ ان کے سوانح کا تذکرہ میرا مقصود ہے ان سطروں میں تو مجھے صرف یہ دکھانا تھا کہ نبی کریم صلعم نے جو زندگی پیش فرمائی اور جس کی اتباع کی آپ کے دونوں ساتھیوں نے کوشش کی اس زندگی کی جوہری بنے وہ بے لاگ اور سچا یہی انصاف تھا جو حق کے اظہار میں کسی ملامت کرنے والے کا اثر قبول نہیں کرتا۔ اور جس کی موجودگی میں دن ہو یا رات ظاہر ہو یا پوشیدہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے خدا دیکھ رہا ہے اور نگرانی کر رہا ہے اور وہ بازپرس کرے گا، اور پھر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لوگ بھی تاک میں لگے ہیں اور ان کو حکم ہے کہ ہر وقت جانچ کرتے رہیں اور خلیفہ کی اطاعت ان پر اسی وقت تک ہے جب تک وہ سیدھی راہ پر چلے اگر وہ غلطی کر رہا ہو

تو اسے براہِ راست پر لائیں اگر اس کے کردار کے بارے میں شکوک و شبہات ہوں تو اس سے سوالات کریں اور یہ سب اس لئے کہ خلیفہ کی فرماں برداری علم و آگہی کے ساتھ ہو بصیرت کی روشنی میں اس کو مشورہ دیا جا سکے، پختہ ارادے اور معقول اسباب کی بنا پر اس کی مخالفت کی جا سکے،

پس کیا یہ سیرت جو نبی کریم صلعم نے پیش کی اور جس کی روشنی میں چلنے کی آپ کے صاحبین نے اپنے بس بھر کوشش کی، فوری نفع کے حریص اور فطری طور پر خود غرضی اور طمع کے دلدادہ انسان کے مناسب حال تھی اور کیا اس سیرت میں ایسی قدرت تھی کہ وہ برقرار رہے تا آنکہ انسانوں کی طبیعتیں بدل دے؟ (باقی آئندہ)

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(ایک سیاح کے مشاہدات)

شام

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم۔اے)

(۳)

یہ ملک مغربی جانب بحر متوسط پر پھیلا ہوا تھا اور مشرقی جانب جزیرۂ عرب کے ریگستان پر شمال مغرب میں اس کی سرحدیں بازنطینی حکومت سے ملتی تھیں قدرتی وسائل سے یہ ملک مالا مال تھا یہاں قدرتی گرم چشمے تھے، مرمر کی کانیں تھیں اور تجارت فروغ پر تھی یہاں ایسے مقامات بہت تھے جن کی مسلمان، یہودی اور عیسائی سب تعظیم کرتے تھے سوائے اس گرم حصہ کے جو شراۃ اور حولہ کے وسط میں واقع تھا اور جہاں نیل، کیلے اور کھجور کی پیداوار ہوتی تھی تمام ملک کی آب وہوا معتدل تھی " اس ملک میں دولت ہے، ارزانی ہے، تجارت ہے، ہنر اور صنعت ہے فقیہ، ادیب اور طبیب بھی ہیں لیکن یہاں کے لوگ ہر لحہ بازنطینی حملہ کے خوف میں مبتلا رہتے ہیں اور محفوظ مقامات کو ہجرت کا سلسلہ ہر وقت جاری رہتا ہے اس کی سرحدوں پر عیسائیوں کا قبضہ ہو چکا ہے، باشندے علم و فضل، مذہبیت اور ذکاوتِ فہم میں عجمیوں سے کم ہیں۔ ان میں سے کچھ ترک اسلام کر چکے ہیں کچھ جزیہ دے کر بازنطینی حکومت کی رعایا ہو گئے ہیں انھیں نہ جہاد کا حوصلہ ہے نہ اسلامی حمیت کا جوش عوام جاہل ہیں علماء کم مگر ذمیوں کی کثرت ہے، مگر واعظوں کو ملک میں کوئی وقعت حاصل نہیں ہے،

فلسطین سے طبریہ تک سامرہ (سمیری نسل کے قدیم باشندے) چھائے ہوئے ہیں البتہ پارسی اور صابئی نہیں ہیں[1]

طرسوس اور اس کے ماتحت شہروں کو چھوڑ کر جنہیں بازنطینی قیصر نے فتح کر لیا تھا (یاقوت نے معجم البلدان میں اس فتح کی تاریخ ۳۵۴ ہجری دی ہے) شام چھ بڑے ضلعوں پر مشتمل تھا جن کے نام اُوپر کی سمت سے سلسلہ وار یہ ہیں:۔

۱۔ قنسرین (صدر مقام حلب) اہم شہر (۱) انطاکیہ (۲) بالِس (۳) حماہ

۲۔ حمص (صدر مقام بھی یہی تھا) اہم شہر اور قصبے:۔ (۱) سلمیہ (۲) کفر طاب (۳) لاذقیہ (۴) تدمُر الخناصرہ۔

۳۔ دمشق (صدر مقام بھی یہی تھا) اہم شہر اور قصبے:۔ (۱) بانیاس (۲) صیدا (بندرگاہ) (۳) بیروت (بندرگاہ) (۴) طرابلس (بندرگاہ) (۵) بعلبک (۶) حولہ۔

۴۔ اُردن (صدر مقام طبریہ) اہم شہر اور قصبے:۔ قدس (۲) صُور (بندرگاہ) (۳) عکا (بندرگاہ) (۴) بیسان (۵) اذرعات۔

۵۔ فلسطین (صدر مقام رملہ) اہم شہر اور قصبے:۔ بیت المقدس (۲) عسقلان (بندرگاہ) (۳) قیساریہ (۴) عمان۔

۶۔ شراۃ۔ (صدر مقام صُغر) اہم شہر اور قصبے:۔ (۱) مآب (۲) تبوک (۳) اذرح (۴) ویلہ (۵) مدین

۱۔ حلب

یہ ایک نہایت مستحکم، خوش آیند، پتھر سے بنا ہوا آباد شہر تھا، اس کے وسط میں ایک مضبوط وسیع قلعہ تھا جس میں حلب کے سلطان کا خزانہ اور خورد و نوش کا سامان

---

[1] مقدسی ص ۱۵۱-۲ و ۱۷۹

محفوظ رہتا تھا، یہاں کے لوگ مالدار، مہذب اور صاحب عقل تھے۔[1]

۲- حِمص

ایک زمانہ میں یہ شام کا سب سے بڑا شہر تھا لیکن بعد میں اس کی حالت خراب ہو گئی اور مقدسی کے وقت میں یہ تیزی سے ویران ہوتا جا رہا تھا۔ یہاں کے باشندے احمق تھے اس کے ماتحت حصے زبوں حال تھے البتہ یہاں بھاؤ سستے تھے۔[2]

۳- دِمشق

شام کا یہ عظیم الشان شہر ایک میدان میں واقع تھا جس کا عرض نصف فرسخ (ڈیڑھ میل) اور اتنا ہی طول تھا یہاں بنو امیہ نے ایک شاندار عمارتی ترکہ چھوڑا تھا جو ہنوز محفوظ تھا یہاں کے عام مکانات مٹی اور لکڑی سے بنے تھے بہت سی نہریں شہر میں سے گذرتی تھیں اور شہر کے گرد دور دور تک باغوں چمنستانوں اور سایہ دار درختوں کا دلفریب حاشیہ تھا نرخ سستے تھے اور برف بآسانی مل جاتا تھا بقول مقدسی، یہاں متضاد صفات پائے جاتے تھے، اس میں ایک طرف تو نہایت عمدہ، حمام، دل کش فوارے، اولوالعزم لوگ لطیف و خشک آب و ہوا اور روافر پھل تھے، اور دوسری طرف اس کے باشندے نہایت شوریدہ سر اور فتنہ پرور تھے پھل بدمزہ، گوشت سخت، مکانات اور کوچے تنگ و تاریک تھے روٹی خراب ملتی تھی اور ذرائع معاش بہت تنگ تھے حمص اور اس کے ماتحت شہروں کے برخلاف دمشق کے ماتحت سب شہر اور قصبے خوش حال اور ترقی پذیر تھے اس کے تین مستحکم، ساحلی شہر صیدا، بیروت اور طرابلس علم و ادب تہذیب و تمدن کی روشنی سے منور تھے اور سمندری تجارت سے بہرہ ور، بعلبک غلے اور انگوروں کے لئے خاص

---

[1] مقدسی ص۱۵۵ [2] مقدسی ص۱۵۶

شہرت رکھتا تھا جو ان گیہوں کے لئے، خولہ روئی اور پھولوں کے لئے، بانیاس جہاں کرد شہر سے بھاگے ہوئے مہاجر آباد ہو گئے تھے ترقی کی طرف تیزی سے گامزن تھا۔[۱]

۴۔ طبریّہ

اس شہر کی چوڑائی بہت کم تھی لیکن لمبائی تین میل کے قریب تھی۔ یہ طور پہاڑ اور بحیرہ (جھیل) کے درمیان واقع تھا۔ یہاں گرمی خوب ہوتی، مچھر اور بھڑیں بھی۔ یہاں قدرتی گرم پانی کے آٹھ حمام تھے۔ شہر میں پھل اور غلہ کی افراط تھی۔ اس کے دو ساحلی شہروں، صُور اور عکّا میں بحری تجارت ہوتی تھی اور صُور میں متعدد مصنوعات کے کارخانے بھی تھے اس کے ماتحت شہر بیسان میں چاول اور کھجور کی بڑی پیداوار تھی، اُردن اور فلسطین کی ساری ضروریات یہاں کے چاول سے پوری ہوتی تھیں اس کے ایک دوسرے ماتحت شہر کابل میں گنا پیدا ہوتا اور کھانڈ بنائی جاتی تھی۔[۲]

۵۔ رملہ

ساحل سمندر اور پہاڑ کے نزدیک لہلہاتے گاؤں اور باغوں کے بیچ میں یہ شاندار شہر آباد تھا۔ اس کی خوشنما عمارتیں پتھر کی تھیں اور یہاں کی جامع مسجد حسن و دل فریبی میں ساری دنیا میں اپنا ثانی نہ رکھتی تھی۔ یہاں کاروبار خوب نفع بخش تھا اور ذرائع معاش فراخ تھے یہاں پھل نہایت خوش ذائقہ اور افراط سے تھے، یہی نہیں، یہاں کے کھانے لذیذ اور روٹی عمدہ ہوتی تھی . . . . یہاں کے ہوٹل اور حمام صاف اور آرام دہ تھے مکانات کشادہ تھے سڑکیں فراخ اور شہر کا انتظام اچھا تھا۔ اس کے ماتحت شہر اور قصبے سب خوش حال اور ترقی پذیر تھے۔ البتہ یہاں مچھر بہت

---

[۱] مقدسی ص ۱۵۶-۱۶۰ و ۱۶۰ [۲] مقدسی ص ۱۶۴-۱۶۱

ستاتے تھے اور میٹھے پانی کی قلت تھی۔[1]

۶۔ بیت المقدس

یہ ہمارے سیاح کا وطن تھا لکھتے ہیں یہاں کے مکانات نہایت خوش اسلوبی سے بہترین پتھر سے بنائے گئے ہیں، آب وہوا معتدل ہے یہاں سے زیادہ پاک باز لوگ کسی دوسری جگہ نہیں ملیں گے، نہ یہاں سے زیادہ پُر لطف زندگی کہیں اور میسر ہوگی یہیں اس شہر سے زیادہ صاف ستھرے بازار بھی کہیں نہیں ہیں اور یہاں سے زیادہ فراخ مسجدیں بھی کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتیں اور نہ دنیا میں کوئی دوسری جگہ ایسی ہے جہاں ایسے مقدس مقامات ہوں، یہاں کے انگور نہایت اعلیٰ اور امرود بے نظیر ہوتے ہیں۔ میٹھے پانی کی افراط ہے ہر گھر میں حوض اور سرداب ہیں۔ اب اس کی کچھ برائیاں سیاح کی زبانی سنئے:۔ ایک حدیث کے بموجب توراۃ میں لکھا ہے کہ بیت المقدس سونے کا طشت ہے جس میں بچھو بھرے ہوئے ہیں چنانچہ اس کے حمام نہایت گندے ہیں اور روزی کا معاملہ بڑا سخت ہے اس کے علاوہ اہل علم وفضل بہت کم ہیں، عیسائیوں کی کثرت ہے جو بد خلق اکھڑ ہیں بازاروں اور ہوٹلوں میں جو اشیاء بکتی ہیں ان پر پولیس کی نگرانی میں بھاری ٹیکس لئے جاتے ہیں اور شہر کے ہر دروازہ پر مسلح سپاہی متعین ہیں جو سوداگروں کو صرف بازار میں بیچنے پر مجبور کرتے ہیں یہاں مظلوموں کی داد ہے نہ فریاد، غریب روزی کی مصیبت میں مبتلا ہیں، اور امیر اس اندیشہ میں کہ کہیں ان کی دولت چھین نہ لی جائے۔ فقراء کس میرسی کے عالم میں ہیں اور اہل ادب گوشہ خمول میں پڑے ہیں نہ کلامی مجلسیں ہیں نہ درسی حلقے، عیسائیوں اور یہودیوں کا بول بالا ہے، مسجدوں میں نہ جماعت ہے نہ سلسلۂ تدریس شہر مکہ سے چھوٹا لیکن مدینہ سے بڑا ہے، تاہم یہاں آبادی خوب ہے اور دور دور سے لوگ

[1] مقدسی صفحہ ۱۶۴

زیارت کرنے آتے ہیں[1]

فلسطین کے ماتحت شہروں میں تین بندرگاہ تھے:۔

۱۔ عسقلان: یہ شاندار شہر تھا مگر اس کا بندرگاہ غیر محفوظ تھا۔ پھل اور بالخصوص جمیز انجیر یہاں بکثرت ہوتے تھے اور اعلیٰ قسم کا ریشمی کپڑا (دفز) بنایا جاتا تھا شہر خوش حال تھا اور ذرائع معاش وافر تھے[2]

۲۔ یافہ: یہ شہر چھوٹا تھا مگر اپنے منافع کے لحاظ سے اہم تھا، فلسطین کا اکثر غلہ یہیں سے آتا تھا اور رملہ کی بحری تجارت اور آمد و رفت اسی کی معرفت ہوتی تھی۔

۳۔ قیساریہ: ساحل بحر متوسط پر شام میں اس سے زیادہ عظیم الشان اور پر منافع بندرگاہ کوئی دوسرا نہ تھا۔ بقول مقدسی یہاں نعمتیں ابلتی تھیں اور زندگی کے ضروریات و لذائذ بوجہ اتم موجود تھے[3]

عمان (اس وقت یہ اردن کا پایہ تخت ہے) یہ متوسط درجہ کا شہر حجاز کی سرحد پر واقع تھا، اس کے باہر گاؤں اور کھیت تھے یہاں سے غلہ اور بکریاں باہر بھیجی جاتی تھیں شہر میں متعدد آٹے کی چکیاں تھیں جو پانی سے چلتی تھیں، معاش آسان تھی اور پھل وافر تھے لیکن باشندے جاہل اور احمق تھے[4]

صُغَر

یہ شہر پانی اور آب و ہوا کی خرابی کی وجہ سے باہر کے لوگوں کے لئے سخت مُضر تھا ایک پردیسی نے گھر والوں کو خط لکھا تو اس طرح شروع کیا من سَقَرِ السُّفلیٰ إلی فردوس الأعلیٰ "جو شخص یہاں زیادہ دن ٹھہر جاتا بچتا نہ تھا۔ مقدسی کہتے ہیں کہ میں نے بہت سے وبائی خطے دیکھے لیکن ساری اسلامی دنیا میں ایسا مہلک شہر نہیں دیکھا

---

[1] مقدسی ص ۱۶۷ [2] مقدسی ص ۱۷۴ [3] ایضاً [4] مقدسی ص ۱۷۵

یہاں کے باشندے سیاہ فام اور ناتراشیدہ تھے پانی گرم اور مضرِ صحت تھا اور شہر جہنم کی طرح گرم اس کی اہمیت کا راز اس کی بڑھی ہوتی اور پُر نفع تجارت میں تھا۔[1]

مقدسی نے فلسطین میں آگ کے ذریعہ خبر رسانی کے ایک دلچسپ طریقہ کی تصریح کی ہے۔ ہر ساحلی شہر میں ایک منارہ تھا اور ایک محافظ فوج رہتی تھی جہاں سے صدر مقام تک مناسب فاصلوں پر مناروں کا ایک سلسلہ تھا جب باز نطینی جہاز مسلمان جنگی قیدیوں کو زرِ مخلصی لے کر رہا کرتے دور سے نظر آتے تو محافظ فوج کا عملہ اگر رات ہوتی تو منارہ پر آگ جلا دیتا اور اگر دن ہوتا تو دھوئیں کے بادل چھوڑ دیتا دوسرے منارہ پر جو لوگ متعین ہوتے وہ یہ آگ یا دھواں دیکھ کر اشارہ پا جاتے اور فی الفور اپنے منارہ پر آگ روشن کر دیتے اور بعد کے منارہ والے یہ آگ دیکھ کر اپنے منارہ پر آگ جلا دیتے اور یہ سلسلہ صدر مقام رملہ تک جاری رہتا اور باز نطینی جہازوں کے آمد کی خبر ایک گھنٹہ میں وہاں پہنچ جاتی رملہ کے منارہ پر فوراً نقارے بجنے لگتے اور شہر میں منادی کر دی جاتی کہ لوگ مسلح ہو کر ساحلی شہر کو جائیں اور اپنے عزیزوں کو چھڑا لائیں۔ مقدسی کے وقت میں ہر تین قیدیوں کو چھڑانے کے لئے سو دینار دینا پڑتے تھے یہ عمل تقریباً سب ساحلی شہروں میں ہوتا تھا۔[2]

تجارت

شام کی تجارت مفید تھی الگ الگ شہروں کی پیداوار اور برآمد کی تفصیل یہ ہے:-

(۱) فلسطین۔ ۱۔ زیتون کا تیل ۲۔ قطین نام کی انجیر ۳۔ کشمش ۴۔ خرنوب ۵۔ ریشم اور سوت سے بنے ہوئے کپڑے ۶۔ صابن ۷۔ تولیہ

(۲) بیت المقدس۔ ۱۔ پنیر ۲۔ روئی ۳۔ عُلینونی اور دُوری نام کی اعلیٰ کشمش ۴۔ سیب ۵۔ قضم قریش (پھل) ۶۔ آئینے ۷۔ قندیلیں ۸۔ سوئیاں

---

[1] مقدسی ص۱۶۲ [2] مقدسی ص۱۷۷

(۳) صُغر اور بیسان۔ ۱۔ نیل ۲۔ چھوارے ۳۔ چاول۔

(۴) عمّان۔ ۱۔ مختلف قسم کے غلے ۲۔ بکریاں ۳۔ شہد

(۵) طبریہ۔ ۱۔ چھوٹی دریاں ۲۔ کاغذ ۳۔ کپڑا

(۶) قدس۔ مُنیرہ اور بَلعیسی نام کے کپڑے ۲۔ رسیاں

(۷) صُور۔ شکر۔ سیپی۔ مخروط شیشہ۔

(۸) دِمشق۔ تازہ نکلا ہوا زیتون کا تیل ۲۔ بَلعیسی کپڑا ۳۔ دیباج (ساٹن) گھٹیا قسم کا بنفشہ ۵۔ پیتل کے برتن ۶۔ کاغذ ۷۔ اخروٹ ۸۔ قُطّین نامی انجیر ۹۔ کشمش

(۹) حَلَب ۱۔ روئی ۲۔ کپڑے ۳۔ سوڈا مغرہ نامی لال مٹی۔

(۱۰) بُعلبک۔ ملبن نامی مٹھائی۔

شام کی بے نظیر چیزیں

۱۔ قُطّین نامی انجیر ۲۔ رملہ کی میدہ اور تہ بند ۳۔ بیت المقدس کے مُغَفّہ امرود ۴۔ قضم قریش (پھل) ۵۔ عَینونی اور دُوری کشمش ۷۔ تریاق ۸۔ تسبیحین۔

محصولات

ہوٹلوں کو چھوڑ کر جہاں محصول بہت سخت تھے، شام میں تجارتی ٹیکس بالعموم معتدل تھے۔ لیکن یہاں ایک حفاظتی ٹیکس تھا جس کو حمایات کہتے تھے اور جس کے ذریعہ بازنطینی حکومت سے مقابلہ کے لئے بری اور بحری استحکامات کئے جاتے تھے، اس ٹیکس سے شامی خزانہ کو بارہ لاکھ دینار سالانہ کی آمدنی تھی۔[۱]

---

[۱] مقدسی ص ۱۸۹

مذاہب

عام لوگ سنی تھے۔ طبریہ نصف نابلس، قدس اور عمان کے اکثر حصہ میں شیعی مذہب رائج تھا مذہب اعتزال کے لئے ماحول سازگار نہ تھا حکومت اور مذہبی سیادت کی نظر میں معتزلی معتوب تھے، ملک میں مالکی اور داؤدی فقہ کے پیرو بھی نہ تھے، بیت المقدس میں کرامیہ فرقہ کی خانقاہیں تھیں جہاں کلامی اور فقہی مباحث کے ہنگامے رہتے اور ترکِ دنیا کی تبلیغ کی جاتی تھی، دمشق کی جامع مسجد میں محدث اوزاعی کے پیروؤں کا ایک درسی حلقہ تھا، شام پر فاطمیوں کے قبضہ سے پہلے یہاں کے لوگ زیادہ تر اہل حدیث تھے لیکن مقدسی کے وقت میں یہاں فاطمی فقہ اور اصول کے مطابق عمل ہوتے لگا تھا۔ بایں ہمہ ملک کا کوئی بڑا یا چھوٹا شہر ایسا نہ تھا جہاں امام ابو حنیفہ کے پیرو نہ ہوں اور کبھی کبھی تو اس فرقہ کے جج بھی مقرر ہوتے تھے۔

حکومت

مصر کے فاطمی خلفاء کی حکومت تھی۔

ذمی۔

عیسائی، یہودی اور سامرہ (Sumerians)

رسومات

شام کی مسجدوں میں ہمیشہ قندیلیں جلائی جاتی تھیں۔ ہر صدر مقام کی جامع مسجد میں بیت المال ہوتا تھا۔ بازاروں میں اور جامع مسجدوں کے دروازوں پر وضوء اور طہارت کا انتظام رکھا جاتا تھا نماز تراویح کی ہر دو رکعت کے بعد نمازی آرام کرتے تھے اور ایسے بھی لوگ

ؔ مقدسی صفحہ ۱۸۰-۱۷۹

تھے جو ایک رکعت کا وتر پڑھتے تھے ایلیا میں تراویح کی نماز صرف چھ رکعت پر مشتمل تھی، یہاں کے واعظ عالم نہ تھے، محض قصہ گو ہوتے تھے فقہ کا درس فجر اور مغرب کی نماز کے بعد ہوتا تھا اور قراء جامع مسجدوں میں درسِ قرآن دیتے تھے، سال کے موسموں کا شمار عیسائی تہواروں سے لگایا جاتا تھا اور سب لوگ رومی مہینے استعمال کرتے تھے عقلی و فلسفیانہ مباحث سے شام کے فقیہ بے گانہ تھے۔ شام اور مصر دونوں جگہ دفتروں کے اہل کار اور منشی اکثر و بیشتر عیسائی ہوتے تھے اس قاعدہ سے ضلع طَبَرِیَہ مستثنیٰ تھا، یہاں قدیم زمانہ سے مسلمان دفتری امور اور انشار پردازی میں مہارت حاصل کرتے چلے آتے تھے۔ ملک کے اکثر صراف، مہاجن، رنگ ساز اور چمڑہ صاف کرنے والے یہودی تھے اور اکثر عیسائی کلرک اور طبیب ہوتے تھے، شام کے لوگ عمدہ پوشاک کے شوقین تھے۔ گاؤن (gown) عالموں اور جاہلوں سب کا لباس تھا۔ گرمی کے موسم میں یہاں کے باشندے جوتوں کی جگہ ایک تلے کے چپل پہنتے تھے جب کوئی مرجاتا تو تین دن تک پورا قرآن ختم کرنے اس کی قبر پر جاتے تھے صرف بادشاہ اور اونچے منصب والے گھوڑے پر سوار ہو سکتے تھے، رَملہ میں کپڑے کے بڑے سوداگر زین کسنے کے مصری گدھوں کی سواری کرتے تھے۔ شام کے رسم ورواج بہت کچھ مصر کے رسم ورواج سے ملتے جلتے تھے لیکن عراق اور اقور کے رسم ورواج سے خاصے مختلف تھے[۱]

مصر

ہمارا سیاح ان الفاظ میں مصر کا تعارف کرتا ہے: مصر قُبّۃ الاسلام ہے، اس کا دریا سب سے بڑا اسلامی دریا ہے، حجاز کی خوش حالی اس کی مرہون ہے، اس کے باشندے حج کے زمانہ میں جوق در جوق جا کر حج کو رونق بخشتے ہیں، خدا نے اس کو دو سمندروں۔ بحر قلزم اور بحر متوسط کے درمیان آباد کیا ہے اور اس کی عظمت و عزت کا شرق و غرب میں غلغلہ ہے

[۱] مقدسی ص ۱۸۳-۱۸۲

شام اپنی تمام عظمتوں کے باوجود اس کا ایک قریہ ہے اور حجاز اپنی تمام فضیلتوں کے باوجود اس کا ذلہ ربا ہے۔ مصر امیر المومنین کا مسکن ہے اور قیامت تک اُس نے بغداد کی جگہ لے لی ہے اس کا پایۂ تخت فسطاط اسلامی شان و شوکت اور تمدن کا پر فخر کارنامہ ہے۔ بایں ہمہ یہ ملک قحط کی زد میں رہتا ہے اور قحط جب آتا ہے تو متواتر سات برس تک رہتا ہے۔ اس دوران میں لوگ مجبور ہو کر کتے کھاتے ہیں اور ہر قسم کی وبار کا شکار ہوتے ہیں اس کے علاوہ انجیر اور انگور یہاں مہنگے ہیں اور قبطیوں کے رسم و رواج رائج ہیں یہ شام کے ساحلی شہروں سے زیادہ گرم اور پہلے قبطی مہینہ طوبہ میں بہت سرد ہو جاتا ہے۔[1]

مقدسی نے مصر کو سات بڑے ضلعوں پر تقسیم کیا ہے جن کے نام سمت شام کی طرف سے یہ ہیں:-

۱- جفار (صدر مقام فرما) ۲-
۲- حوف (صدر مقام بلبیس)
۳- ریف (صدر مقام عباسیہ)
۴- اسکندریہ (یہی صدر مقام تھا)
۵- مقدونیہ (صدر مقام فسطاط)
۶- صعید (صدر مقام اُسوان)
۷- الواحات

فرما

یہ خوش حال اور آباد شہر بحر متوسط سے ۱½ میل دور ایک نشیبی دلدلی علاقہ میں واقع تھا اس کے اردگرد دسیوں کی بہت سی شکارگاہیں تھیں۔ یہاں کا پانی کھاری تھا، بازار

---

[1] مقدسی ص ۱۹۳ - ۲۰۲

بہت اچھے تھے اور عمدہ قسم کی مچھلی وافر تھی شہر قلعہ کے اندر تھا یہاں متعدد سڑکیں ملتی تھیں اس ضلع کے تمام شہر سنہرے ریت کے نخلستانی میدانوں میں واقع تھے اور سڑکوں کے ذریعہ ایک دوسرے سے منسلک تھے سڑکوں پر چھ چھ میل کے فاصلہ پر ایک دکان تھی [1]

مشتول

یہ حجاز کا خرمن تھا، یہاں بہت سی ہوائی چکیاں تھیں جن میں حجاز کا بیشتر آٹا پستا تھا ہمارے سیاح نے سال کے بعض حصوں میں یہاں سے حجاز کے لئے ہر ہفتہ ۳ ہزار اونٹوں پر آٹا اور دوسرے غلے جاتے ہوتے دیکھے۔ یہاں سے کیک اور بسکٹ بھی حجاز بھیجے جاتے تھے [2]

قلزم

یہ پرانا شہر بحر قلزم پر واقع تھا، نہایت خشک اور وحشتناک مقام تھا، جہاں پانی، گھاس، زراعت، مویشی، ایندھن، پھل کچھ نہ تھا پینے کا پانی کشتیوں اور اونٹوں پر بارہ بارہ میل دور سے لایا جاتا تھا شہر میں سخت گندگی اور بھیانک پن تھا اور یہاں کا سفر بھی نہایت دشوار تھا۔ تاہم اس کو تجارتی حیثیت سے بڑی اہمیت حاصل تھی، یہاں بہت سے شاندار محل تھے یہ مصر کا گودام تھا حجاز کا بندرگاہ اور حاجیوں کی رسدگاہ [3]

اسکندریہ

یہ عظیم الشان شہر بحر متوسط پر ایک نہایت مضبوط قلعہ میں واقع تھا جہاں نیک اور عبادت گذار لوگوں کی کثرت تھی اس کے حوالی میں بہت سے کھیت اور باغ تھے۔ سیاح نے یہاں کے پھلوں اور انگور کی تعریف کی ہے باڑھ کے وقت نیل کا پانی ایک بڑی نہر میں آ جاتا

---

[1] مقدسی ص ۱۹۵ [2] مقدسی ص ۱۹۶

تھا جس سے اہالی شہر اپنے اپنے حوض بھر لیتے تھے۔ اس کی آب و ہوا اور رسوم شام کی آب و ہوا اور رسوم سے مشابہ تھے یہاں مرمر کی متعدد کانیں تھیں باشندے مرمر کے صاف ستھرے مکانوں میں رہتے تھے، اس ضلع کے سارے شہر آباد اور خوش آیند تھے۔[1]

فسطاط

یہ حکومت مصر کا دار السلطنت اور خلفائے فاطمی کا مستقر تھا۔ سیاح لکھتا ہے یہ نیشاپور سے زیادہ آباد، بصرہ سے زیادہ پرشکوہ اور دمشق سے زیادہ بڑا تھا یہاں کھانے لذیذ ہوتے تھے اور مٹھائیاں سستی تھیں کیلے، تازہ کھجوریں، ترکاریاں اور ایندھن وافر تھے، یہاں کا پانی خوش گوار اور آب و ہوا صحت بخش تھی۔ یہاں سے شرق و غرب کو تجارتی قافلے جاتے تھے یہاں کے بازاروں میں ہر قسم کے نادر، عمدہ، قیمتی اور آرائشی سامان فروخت ہوتا تھا، اس کے علاوہ یہاں دنیوی اور علمی وجاہت کے لوگ بڑی تعداد میں موجود تھے اسلامی دنیا کی کسی جامع مسجد میں یہاں سے زیادہ بڑے درسی حلقے نہیں تھے، اور نہ کسی دوسری جگہ کے لوگ اتنے خوش لباس تھے، اور نہ کسی بحری ساحل یا دریائی شہر پر کشتیوں کا اتنا بڑا انبوہ تھا جیسا کہ اس کے کنارہ تھا۔ یہاں کے لوگ عافیت پسند اور حق دوست تھے یہ لوگ واعظوں اور مسجد کے اماموں کے صحیح انتخاب پر بہت زور دیتے تھے اور خرچ کی پرواہ کئے بغیر صحیح معنی میں لایق اور صالح آدمی مقرر کرتے تھے ان کا قاضی ہمیشہ بلند اخلاقی و علمی شخصیت کا مالک ہوتا تھا اور ان کے محتسب کو بادشاہ کا سا اقتدار حاصل تھا لوگوں کے چال چلن اور طور طریق پر وزیر اور خلیفہ کی کڑی نگرانی رہتی تھی اگر اس شہر میں بہت سی برائیاں نہ ہوتیں تو ساری دنیا میں اس کی نظیر نہ تھی شہر لمبائی میں ۲ میل سے زیادہ تھا اور محلے اس طرح واقع ہوتے ہیں کہ آبادی کی تہیں ایک دوسرے سے بلند تر ہوتی جاتی ہیں اور

---

[1] مقدسی ص ۱۹۷

مکانات چار چار یا پانچ پانچ منزل کے ہوتے ہیں، مجھے بتایا گیا کہ ایک مکان میں دو سو تک آدمی رہتے ہیں۔ میں نے یہ بھی سنا کہ جمعہ کے دن دس ہزار آدمی مسجد کے باہر (دکانوں، سڑکوں وغیرہ پر) امام کے آگے نماز پڑھتے ہیں۔ میں نے اس رپورٹ پر اعتبار نہیں کیا، پھر ایک جمعہ کو شوقِ التطیر ذرا جلدی پہنچ گیا تو دیکھا کہ مسجد کے باہر واقعی لگ بھگ یہی تعداد تھی یہ واقعہ ہے کہ فسطاط مسلمانوں کا سب سے زیادہ شاندار آباد اور پر فخر شہر ہے۔ گنجان آبادی کے باوجود میں نے پندرہ سیر کے قریب میدہ کی روٹی (صرف میدہ ہی یہاں پکائی جاتی ہے) ایک درہم (تقریباً ۹ آنے) میں خریدی ہے اور آٹھ انڈے ایک دانق میں (تقریباً ۱½ آنہ) اور ستر امرود ایک درہم میں۔ کیلے اور کھجوریں ارزاں ہیں اور یہاں شام اور افریقہ کے پھلوں کی ڈیوڑھ بندھی رہتی ہے، خراسان و ماوراء النہر سے قافلے یہاں آتے ہیں اور اسپین و بحر متوسط کے جہاز اس کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے ہیں، یہاں ہر قسم کا قیمتی آرائشی اور نادر سامان ملتا ہے، تجارت مفید ہے، دولت وافر ہے، یہاں سے زیادہ شیریں پانی، یا زیادہ نرم و منکسر لوگ، یا بہتر کپڑا یا زیادہ مبارک دریا کسی دوسرے ملک میں نہیں ملے گا۔ تاہم یہاں کے مکان تنگ، بودار اور گندے ہیں جہاں مچھروں کی تولید ہوتی ہے پھل کم ہیں، پانی گدلا ہے کنوئیں گندے ہیں اور کھٹملوں کی کثرت ہے یہاں کے لوگ مزمن خارش میں مبتلا رہتے ہیں گوشت مہنگا ہے، کتے کثرت سے ہیں، باشندے سنگین اور خوفناک قسمیں کھاتے ہیں، عجیب عجیب رسومات کے پابند ہیں ہمیشہ قحط اور نیل کے امساک سے ڈرتے رہتے ہیں۔ یہاں کے مشایخ علم و ادب شراب سے پرہیز نہیں کرتے اور ان کی بیویاں بد چلنی سے۔ عورتوں کے دو دو خاوند ہوتے ہیں۔ دو مذہبی فرقوں میں بٹے ہوتے ہیں ان کا رنگ سانولا ہے اور بولی ناپسندیدہ۔[1]

---

[1] مقدسی صفحہ ۲۰۰-۱۹۷

اُسوان

یہ صعید (بالائی مصر) کا صدر مقام، تجارت کی منڈی اور خوش حال شہر نیل کے کنارہ آباد تھا۔ کھجور اور انگور کی پیداوار خاص طور پر یہاں بہت تھی [۱]

اَلواحَات

یہ ضلع سوڈان کی سرحد سے مراکش تک پھیلا ہوا تھا، ایک زمانہ میں یہ نہایت زرخیز اور اہم تھا ہمارے سیاح کے وقت میں بھی یہاں سے مختلف قسم کے پھلوں، مویشیوں اور پیداوار کی برآمد تھی [۲]

تِنّیس

مصر کے سمندر (نیل کا وسیع و عریض دہانہ) میں ایک جزیرہ پر واقع تھا۔ شان و شوکت میں چھوٹا بغداد تھا یہاں کے باشندے جو زیادہ تر قبطی تھے خوب مال دار تھے، مقدسی نے اس کو سونے کے پہاڑ سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں عمدہ محل تھے، بازار خوش نما اور اشیاء سستی تھیں، مغرب اور مشرق کی تجارت کا مستقر تھا۔ یہاں ایک رنگین کپڑے بُلمونہ اور قیمتی چادروں کی بڑی صنعت تھی۔ تاہم یہ بہت گنجان اور گندا شہر تھا جہاں نجاستیں سڑکوں پر ڈال دی جاتی تھیں [۳]

دِمیاط

یہ بحری شہر بھی تنّیس کی طرح ایک جزیرہ میں واقع تھا دونوں شہروں میں چوبیس گھنٹے کی

---

[۱] مقدسی ص۲۰۱ [۲] مقدسی ص۲۰۱ [۳] مقدسی ص۲۰۱

مسافت تھی۔ تنیس کے مقابلہ میں سیاح نے اس کو زیادہ خوش آیند اور کشادہ پایا۔ یہاں پانی اور پھل بھی تنیس کی نسبت زیادہ تھے اور عمارتیں بھی زیادہ دل کش، یہاں کا کپڑا بھی زیادہ نفیس اور صاف اور دستکار نہ زیادہ ماہر تھے، شہر میں بیرونی حملہ سے بچاؤ کے لئے متعدد فوجی اسٹیشن تھے اور شہر کے گرد مضبوط قلعہ تھا۔[1]

شطا

دمیاط اور تنیس کے وسط میں ایک بحری گاؤں تھا۔ یہاں قبطی آباد تھے جو شطوی نام کا مشہور کپڑا بناتے تھے

طحا

یہ ضلع صعید کا ایک گاؤں تھا جہاں اعلیٰ قسم کا اونی کپڑا تیار ہوتا تھا۔ اسی ضلع کے ایک دوسرے قصبہ بہنسہ میں پردے، دریاں اور اعلیٰ روئی کا کپڑا تیار ہوتا تھا۔[2]

حکومت

مصر پر فاطمی خلفاء حکمراں تھے، ان کی حکومت میں انصاف ہوتا اور رعایا امن کی زندگی بسر کرتی تھی نزار عزیز باللہ جو مقدسی کی سیاحت کے وقت خلیفہ تھا (۳۸۶ - ۳۶۴) ایک طاقتور، اور مالدار بادشاہ تھا جس کے احکامات باقاعدگی سے نافذ ہوتے اور حکومت کے اہل کار اس کے مطیع و وفادار تھے۔[3]

ذمی

قبطی عیسائی جن کے علاوہ ایک اقلیت یہودیوں کی بھی تھی۔

---

[1] مقدسی ص۲۰۵ [2] مقدسی ص۲۰۲ [3] مقدسی ص۲۱۲

زبانیں

مسلمانوں کی عربی بے جان اور قاعدے قوانین کے معیار سے گری ہوئی تھی۔ قبطی عیسائی اور یہودی اپنی مادری زبان یعنی قبطی بولتے تھے۔

تجارت

مصر سے ذیل کی اشیاء باہر بھیجی جاتی تھیں۔

۱۔ فسطاط۔ ۱۔ ایک قسم کا موٹا، نرم چمڑا جو پانی میں گلتا نہ تھا ۲۔ ایک سرخ کپڑا جس کا استر لگایا جاتا تھا ۳۔ رسیاں۔

(۲) صعید۔ ۱۔ چاول ۲۔ اون ۳۔ کھجور ۴۔ سرکہ ۵۔ منقّیٰ۔

(۳) تنّیس۔ ۱۔ ملوّنہ کپڑے کی مختلف قسمیں۔

(۴) دمیاط۔ سونے اور چاندی کے تار۔

(۵) فیوم۔ چاول ۲۔ گھٹیا قسم کا سن۔

(۶) بُوصیر۔ اعلیٰ قسم کا سن،

(۷) فرما اور ماتحت شہروں سے ۱۔ مچھلی ۲۔ ٹوکریاں ۳۔ کھجور کے ریشوں سے بنے ہوئے عمدہ رسّے۔

مصری خصوصیات

۱۔ قلم ۲۔ توتیا ۳۔ مرمر ۴۔ سرکہ ۵۔ اون ۶۔ کینوس ۷۔ کپڑا ۸۔ روئی ۹۔ کھالیں ۱۰۔ جوتے ۱۱۔ کھجور کے ریشے جس سے رسّے بنائے جاتے تھے ۱۲۔ مرغابیاں ۱۳۔ کیلے ۱۴۔ موم ۱۵۔ قند ۱۶۔ زنگ ۱۷۔ دہاگہ ۱۸۔ سوڈا پوٹاش ۱۹۔ ہرسیہ (کھچڑا) ۲۰۔ بیذ (ایک قسم کا کھانا) ۲۱۔ مٹر ۲۲۔ کئی قسم کی ترکاریاں اور پھل ۲۳۔ گدھے ۲۴۔ گائیں ۲۵۔ بٹیاں

۲۶-بیمطرنم قرآن خوانی ۲۷-جمعہ کا اجتماع ۲۸-مچھلی ۲۹-تجارت ۳۰-خیرات ۳۱-روزگار

محصولات

ٹیکس بھاری تھے، بالخصوص تنیس، دمیاط اور ان شہروں میں جو دریائے نیل کے کنارے آباد تھے، ملونہ اور شطوی کپڑے کی صنعت سرکاری نگرانی میں تھی جس کے زیر اثر تیار کیا ہوا ایک تھان پانچ چھ سرکاری مرحلوں اور ٹیکسوں سے نکل کر بازار پہنچتا تھا اور اگر اس کی گانٹھ باہر بھیجی جاتی تو اس پر مزید نصف درہم ٹیکس لیا جاتا۔ تنیس سے جب جہاز روانہ ہوتے تو ان کی تفتیش کی جاتی زیتون کے تیل کی ہر مشک پر ایک دینار ٹیکس تھا اور ہر قسم کے تجارتی سامان کا کڑا جائزہ لیا جاتا تھا قسطاط کے ساحل پر بھی سخت ٹیکس تھے۔ تنیس کے ساحل پر مقدسی نے ایک افسر کو دیکھا جس کے پاس ایک ہزار دینار یومیہ محصول وصول کرنے کا سرکاری اجازت نامہ تھا اور اتنی ہی رقم ساحل صعید اور ساحل اسکندریہ سے ہر روز وصول کی جاتی تھی شمالی افریقہ و مراکش وغیرہ سے جو جہاز اسکندریہ کے ساحل یا شام سے فرما کے ساحل پر لنگر انداز ہوتے ان سے اتنی ہی رقم وصول کی جاتی تھی قلزم میں ہر بوجھ پر ایک درہم ٹیکس کی عام شرح تھی[1]

رسوم

مصر کی ہر جامع مسجد میں نماز فجر کے بعد امام قرآن سامنے رکھ کر کچھ حصہ پڑھتا اور نمازی اس کو ایسے ہی انہماک سے سنتے جیسا کہ واعظ کے وعظ کو، جامع مسجد میں مغرب کی نماز سے عشار کی نماز تک فقیہوں، ماہرین قرآت قرآن، ادیبوں اور فلسفیوں کے مختلف حلقے منعقد ہوتے تھے، ایسے علمی حلقے تقریباً ہر مسجد میں ہوتے تھے۔ مقدسی نے صرف جامع مسجد میں ایک سو گیارہ حلقے گنے کچھ مدرس اپنے لیکچر بہائی رات گئے تک جاری رکھتے تمام حلقوں میں سب سے زیادہ شاندار، باوقار اور کثیر التعداد وہ حلقے ہوتے جن میں قرآن اور قرآت قرآن کی تعلیم دی جاتی تھی۔ یہاں کے باشندے خوش لباس اور تملق پسند تھے اگرچہ ان کو گوشت سے زیادہ رغبت نہ تھی تاہم مچھلی کا سر اور کستورا مچھلی نہایت شوق سے کھاتے تھے جمعہ کے دن لوگ بہت کم دھلے کپڑے یا پرانے جوتے پہنتے تھے۔ لوگوں میں نماز کے دوران میں اشارہ کرنے ناک اور گلا صاف کرنے کی بہت زیادہ عادت تھی اور رسم یہ تھا کہ ناک اور منہ سے نکلا ہوا مادہ جانماز کے نیچے پونچھ دیتے تھے

---

[1] مقدسی صفحہ ۲۱۳ [2] ایضاً صفحہ ۲۰۵

حالاتِ حاضرہ

مسٹر چواین لائی کی آمد۔ عوامی چین اور ادارہ اقوام متحدہ۔ گوائی مالا کے سبق آموز واقعات

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد ایڈیٹر جد وجہد)

گذشتہ ماہ کے اواخر میں عوامی چین کے وزیر اعظم اور وزیر امور خارجہ، مسٹر چواین لائی، ہندیونین کے وزیر اعظم پنڈت نہرو کی دعوت پر ہندوستان تشریف لائے تھے۔ آج دنیا کا مقدم اور اہم ترین مسئلہ یہ ہے کہ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد سے، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے حکمراں حلقوں کی ملوکیت پسندانہ حکمت عملی کے تحت آزاد دنیا اور اس حکمت عملی کے تحفظ کے نام پر نت نئے جارحانہ اقدامات کی بدولت حقیقی جمہوریت پسند اور دنیا بھر میں قومی آزادی کے قیام اور استحکام کی حامی اور خواہش مند اقوام کو جو مشکلات پیش آرہی ہیں ان پر کس طرح قابو حاصل کیا جائے اور تیسری عالم گیر جنگ کے جو خطرات رونما ہو رہے ہیں انھیں کس طرح معدوم کیا جائے اور چونکہ آج براعظم ایشیا کی سرزمین ہی سرد اور آتشیں جنگ کا مرکز بنی ہوتی ہے اس لئے اس براعظم کے عوام اور رہناؤں پر ہی اس مسئلہ کو حل کرنے کی اہم ذمہ داری بھی عاید ہوتی ہے۔

چین ہندوستان کا ایک ہم سایہ یا بعر ایشیا کا ایک عظیم اور قدیم ملک ہی نہیں بلکہ ایک عظیم بین اقوامی طاقت بھی ہے اور عوامی حکومت کے قیام نے جہاں اس کی عظمت اور اہمیت میں اضافہ کیا ہے وہاں اس کی قومی اور بین اقوامی ذمہ داریوں کو بھی دہ چند کردیا ہے،

اس لئے یہ بات تو قطعاً واضح ہے کہ دہلی میں ہند اور چین کے وزرار اعظم کے مابین جو مذاکرات ہوئے وہ ایشیا کے مسائل کے علاوہ بقار امن عالم کے مسئلہ پر بھی محیط تھے اور امریکہ کے حکمراں حلقوں نیز ان حلقوں کی امداد پر زندہ رہنے والے چند ملکوں کے علاوہ دنیا کے ہر حصّہ نیں ان مذاکرات پر اطمینان اور مسرت کا اظہار کیا گیا لیکن ہندوستان میں مسٹر چواین لائی کی آمد کا دوسرا رخ بھی ہے اور اگر اس دوسرے رُخ کو پیش نظر رکھا جائے تو پنڈت نہرو اور مسٹر چواین لائی کی یہ ملاقات بین اقوامی زاویہ نظر سے ایک اہم ترین واقعہ بن جاتی ہے۔

اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ دوسری عالم گیر جنگ کے بعد سے دنیا کے ہر گوشہ میں برطانیہ کے اقتدار اور وقار کو جو شدید صدمات پہنچے ہیں وہ امریکہ کی اسی حکمت عملی کا منطقی نتیجہ ہیں جس کا ذکر سطور بالا میں کیا جا چکا ہے اور اگرچہ برطانیہ اپنی بعض مجبوریوں کے باعث اور خصوصاً اس لئے کہ وہ خود بھی اپنی خارجہ حکمت عملی کے اعتبار سے ایک ملوکیت پسند اور نو آبادیات خواہ ملک ہے بیشتر مسائل اور معاملات میں امریکہ کا موید اور معاون رہا ہے لیکن ان دونوں ممالک کے مابین بعض اہم مسائل پر شدید ترین اختلافات بھی موجود ہیں اور یہ اختلافات روز بروز بڑھتے ہی جا رہے ہیں۔

پھر اس بات سے بھی انکار کرنے کی گنجایش نہیں کہ ہندوستان دولتِ مشترکہ کا ایک رکن ہے اور دولتِ مشترکہ کا کوئی رکن دوسرے اراکین کے مشورہ کے بغیر کم از کم بین اقوامی معاملات میں کوئی اہم فیصلہ یا اقدام نہیں کرتا۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ پنڈت نہرو اور مسٹر چواین لائی کی اس ملاقات کو دولتِ مشترکہ کے اراکین اور خصوصاً برطانیہ کی حمایت حاصل تھی۔ پھر کیا یہ بات ممکن نہیں کہ اس ملاقات اور مذاکرات کے دوران میں کچھ ایسے مسائل بھی زیرِ بحث آئے ہوں جن کا اثر مستقبل میں برطانیہ اور امریکہ کے تعلقات پر بھی پڑے؟

کم از کم امریکہ کے حکمراں حلقے اس خدشہ کو محسوس کرتے ہیں اور پنڈت نہرو اور مسٹر

جولائی کے مذاکرات کے بعد انھیں یہ اندیشہ لاحق ہو گیا ہے کہ شاید آئندہ جب بھی ادارہ اقوام متحدہ میں عوامی چین کی شرکت کا مسئلہ زیر غور آئے گا برطانیہ شمولیت کی حمایت کرے گا اور اسی لئے مسٹر ڈولیس نے اس بات کا اعلان بھی کر دیا ہے کہ ادارہ اقوام متحدہ میں، عوامی چین کو شمولیت سے روکنے کے لئے امریکہ ویٹو کے حق کو استعمال کرنے سے بھی گریز نہ کرے گا۔

مختصر یہ کہ ہم ہند اور عوامی چین کے وزراء اعظم کی گذشتہ ملاقات کو ایشیا یا دنیا کے عام مسائل پر گفت وشنید ہی تک محدود نہیں کر سکتے بلکہ اس کے بین اقوامی اعتبار سے بھی اس کے دوررس نتائج برآمد ہوں گے اور برطانیہ اور امریکہ کے تعلقات کی نوعیت پر لازماً اس کا اثر پڑے گا۔

اس سلسلہ میں 'ادارہ اقوام متحدہ' میں 'عوامی چین کی شرکت کے مسئلہ پر بھی ایک نظر ڈال لینی چاہئے یہ مسئلہ اس وقت سے زیر بحث ہے جب ارض چین پر چیانگ کائی شک کی قومی حکومت کی شکست کے بعد وہاں عوامی حکومت قایم ہوئی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ایک بار پھر مستقبل قریب ہی میں' یہ مسئلہ ادارہ اقوام متحدہ میں پیش ہونے والا ہے۔

یہاں اس بات کو سمجھ لینا چاہیے کہ عوامی چین براعظم ایشیا ہی کی نہیں بلکہ دنیا کی ایک عظیم طاقت ہے اور اگر ادارہ اقوام متحدہ کے قیام کا مقصد یہ ہے کہ دنیا کی تمام عظیم طاقتوں کو متحد رکھ کر جنگ کے امکانات کو مسدود کیا اور اقوام عالم کو ان کی پر امن تعمیر اور ترقی کا موقع دیا جائے تو اس ادارہ سے کسی ایک عظیم طاقت کو باہر رکھتے ہوئے یہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا اور خصوصاً مشرق بعید کے مسائل کو ادارہ اقوام متحدہ میں عوامی چین کی شرکت کے بغیر حل نہیں کیا جا سکتا۔

ہندوستان میں، ریاست ہائے متحدہ امریکہ کے شعبۂ اطلاعات نے "ہند چین اور چین کی کمیونسٹ حکومت کے متعلق ریاست ہائے متحدہ امریکہ کی پالیسی" کے عنوان سے ایک کتابچہ شائع کیا ہے جس میں ان ممالک سے متعلق امریکہ کی حکمت عملی کو واضح کرتے ہوئے، ادارہ اقوام متحدہ میں عوامی چین کی شرکت کے مسئلہ پر

بھی روشنی ڈالی ہے اور اس مسئلہ میں امریکہ نے جو حکمت عملی اختیار کر رکھی ہے اس کی توضیح بھی کی گئی ہے یہاں اس کتابچہ پر تبصرہ مقصود نہیں لیکن اس کی حیثیت اور حقیقت کا اندازہ صرف اس ایک بات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے کہ مسٹر ڈولیس کے الفاظ میں ـــــ چین کی نیشنلسٹ حکومت فارموسا میں قایم ہے اور لاکھوں آزاد چینی اس کے حیطۂ اختیار میں ہیں ـــــ اس لئے امریکہ چین کی عوامی حکومت کو ادارہ اقوام متحدہ میں حق نیابت دینے کا مخالف ہے لیکن کیا یہ حقیقت نہیں کہ ارض چین میں جو عوامی حکومت قایم ہے اس کے تحت کروڑوں چینی نہ صرف تعمیر اور ترقی کی منازل ہی طے کر رہے ہیں بلکہ وہ حکومت خود ان کی ہی حکومت بھی ہے

مختصر یہ کہ امریکہ کا موجودہ حکمراں طبقہ عوامی چین کے استحکام سے بے حد خائف ہے اور اسی لئے وہ ادارہ اقوام متحدہ میں اس کی شمولیت کا شدید ترین مخالف بھی ہے لیکن حالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس بار جب یہ مسئلہ ادارہ اقوام متحدہ کے روبرو پیش ہوگا تو امریکہ کو اقوام عالم کی وہ حمایت حاصل نہ ہو سکے گی جو اب تک حاصل ہوتی رہی ہے۔

گواٹی مالا وسطی امریکہ کی ایک چھوٹی سی آزاد اور خود مختار ریاست ہے اور اس ریاست کی بیشتر اراضی پر غیر ملکی تجارتی کمپنیوں اور ملکی زمینداروں کا تسلط قایم ہے گذشتہ دو سال سے اس ریاست میں آربینز کی صدارت میں جو جمہوری حکومت قایم تھی اس نے عوام کی صلاح اور بہبود کو اپنا مطمح نظر بنا رکھا تھا لیکن یہ بات امریکی سرمایہ داروں اور برطانوی نوآبادیات خواہوں کے لئے ناقابل برداشت ثابت ہوئی اور انھوں نے جمہوریت اور عوامی فلاح و بہبود کے دشمنوں کے ساتھ سازش کر کے ماہ گذشتہ کے اواخر میں اس ملک پر حملہ کرا دیا ملک کی حکومت نہایت جرأت اور دلیری کے ساتھ اس جارحانہ اقدام کی مدافعت کرتی رہی اور اس کے ساتھ ہی اس نے مجلس تحفظ کو بھی اس جارحانہ حملہ کی طرف توجہ دلائی لیکن مجلس تحفظ نے گواٹی مالا کی حکومت کی درخواست پر کوئی فوری توجہ مبذول کرنے کی بجائے اس معاملہ کو پان امریکن کمیٹی کے سپرد کر دیا اور اس تاخیر کی بدولت گواٹی مالا کی جمہوری حکومت کو مستعفی ہو جانا پڑا

گواٹی مالا کی جمہوری حکومت کا سب سے بڑا جرم یہ تھا کہ اس نے ۱۹۵۳ء کے آغاز میں امریکی سرمایہ داروں کی ایک پھلوں کی کاشت کرنے والی کمپنی یعنی یونائیٹڈ فروٹ کمپنی سے جو اس ملک کی تین لاکھ ایکڑ اراضی پر قابض تھی دو لاکھ چونتیس ہزار ایکڑ اراضی اس لئے واپس لے کر اراضی سے محروم کاشتکاروں میں تقسیم کر دی تھی کہ یہ کمپنی اس سے کاشت نہیں کرتی تھی اس کے علاوہ اس نے انٹرنیشنل ریلوے اور مزدوروں کے درمیان رونما ہونے والے تنازعات میں مزدوروں کی حمایت بھی کی تھی اور چونکہ اس ریلوے کا بیشتر تعلق بھی یونائیٹڈ فروٹ کمپنی ہی کے ساتھ ہے اس لئے وہ اس معاملہ میں بھی گواٹی مالا کی حکومت کی شدید مخالف تھی اور اگرچہ ان دونوں تنازعات میں عدالت نے ملک کی حکومت کے حق میں فیصلہ کیا تھا۔ لیکن امریکہ کا سرمایہ دار طبقہ عدالتی فیصلہ پر بھی مطمئن نہیں ہو سکا تھا چنانچہ اس طبقہ نے گواٹی مالا کے ایک باغی اور جلاوطن فوجی افسر کے ساتھ سازش کر کے ملحقہ برطانوی ریاست "ہنڈوراس" اور "نکارگوا" وغیرہ کے علاقوں سے گواٹی مالا پر یورش کرادی اور اس جنگ میں انھیں اسلحہ اور دوسرا سامان بھی مہیا کیا ۔

گواٹی مالا میں جو کچھ ہوا ہم اسے افسوسناک ہی کہہ کر نظر انداز نہیں کر سکتے بلکہ گواٹی مالا کے واقعات دنیا بھر کے جمہوریت پسندوں کے لئے ایک درسِ عبرت کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان سے ایک مرتبہ پھر یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ امریکہ کا برسر اقتدار طبقہ سرمایہ دارانہ مفادات کے تحفظ کے لئے کتنے مذموم طریقے استعمال کر سکتا ہے اور وہ کس طرح عوام کی آزادی کو کچل سکتا ہے گواٹی مالا کی جمہوری حکومت کے خلاف کمیونسٹ ہونے کا الزام لگایا گیا تھا حالانکہ واقعات اس بات پر شاہد ہیں کہ صدر آر۔ بینز کی حکومت کمیونسٹ نہیں تھی لیکن وہ غیر ملکی سرمایہ داروں کے مفاد کو ملکی باشندوں کے مفاد پر مقدم بھی نہیں سمجھتی تھی بہرحال گواٹی مالا کی یہ جنگ اس دور کا ایک اہم حادثہ ہے اور اس حادثہ میں ادارہ اقوام متحدہ کے وقار پر ایک سخت ضرب لگائی ہے۔

ادبیات

خود دار بھکارن

از

(جناب بسملؔ شاہجہاں پوری)

غصہ تھا آفتاب کا حد سے بڑھا ہوا
گرمی سے کائنات کا پارا چڑھا ہوا

اُڑتے ہوئے غبار سے ہر چیز خاک تھی
چھاتی زمیں کی تابشِ پیہم سے چاک تھی

سبزہ تھا یا زمیں میں کانٹے گڑے ہوئے
پانی پہ بلبلے تھے کہ چھالے پڑے ہوئے

بادِ سموم تھی کہ جہنم کی سانس تھی
سورج کی ہر کرن دلِ ہستی میں پھانس تھی

کُتّے تلاشِ سایہ میں ہر سو رواں دواں
پھولی ہوئی تھی سانس تو نکلی ہوئی زباں

دستِ تپش میں اسپِ زمانہ کی باگ تھی
ہر ذرہ کے جگر میں جہنم کی آگ تھی

تپتا ہوا فلک تو سلگتی ہوئی زمیں
ہر کنکری پہ ہوتا تھا چنگاری کا یقیں

پھولوں کے دل میں کانٹوں کے نیزے گڑے ہوئے
ہر شاخِ سرنگوں میں پرندے چھپے ہوئے

تھا آفتاب سر پہ تو سایہ تھا پاؤں پہ
بالکل یقین تھا سیہ بختی کا چھاؤں پر

اک بارشِ شرارہ دلِ کائنات پر
کانٹے پڑے ہوئے تھے زبانِ حیات پر

یہ وقت اور ایک ضعیفہ خستہ حال
آنکھیں اداس چہرہ مکدر نظر نڈھال

پیروں پہ تھا ورم رخِ انور پہ گرد تھی
آئینۂ زمانہ میں تصویرِ درد تھی

رُکتا ہوا سکون مسرت خفا سی تھی
ہونٹوں پہ پاؤں پڑتی ہوئی التجا سی تھی

لب خشک "آنکھ تر" تو دلِ آشفتہ حال تھا
ہر چہرۂ نگاہ پہ رنگِ سوال تھا

گردن کی جنبشوں میں تھی حسرت ملی ہوئی ... چہرے کی زردیوں میں تھی سرسوں کھلی ہوئی
وہ حادثہ کہ موت ہنسے کھلکھلا اٹھے ... وہ سانحہ کہ دیکھ کے دل بلبلا اٹھے
قلب و جگر پہ تیرِ الم کھا رہی تھی وہ ... دستِ طلب دراز کیے جا رہی تھی وہ
مانا کہ احتیاج میں دیوانگی سی تھی ... لیکن سوال میں ابھی بیگانگی سی تھی
ہمت نگاہ کو ہو نہ جرأت زباں کرے ... کھل کر کسی سے حالِ زبوں کیا بیاں کرے
کیا جذبۂ شریف حمیت سے کہہ گیا ... دستِ سوال آہ اٹھا اٹھ کے رہ گیا
وہ خاندان جن کا ہے پیشہ گداگری ... غیرت سے مجتنب ہیں حمیت سے ہیں بری
جن کے نفس میں ہوتے ذلالت شریک ہے ... قسمت میں مفلسی ہے مقدر میں بھیک ہے
گائیں بجائیں روپ نئے سے نیا بھریں ... ہر طرح سے وہ اپنی طرف ملتفت کریں
لیکن یہ زخم خوردہ تقدیر کیا کرے ... جس کی نظر نہ اٹھ سکے تدبیر کیا کرے
وہ جس پہ تنگ عرصۂ انفاس ہو چکا ... وہ جس کا جزوِ زندگی افلاس ہو چکا
دنیا میں جس کا کوئی نہ پرسانِ حال ہو ... گر زندگی بلا ہو تو جینا وبال ہو
اس کی خبر بھی صاحبِ دولت نہ لے سکیں ... اک خوشہ اپنے خوانِ نعم سے نہ دے سکیں

بسمل نظر اٹھا چمن پائمال دیکھ
یہ وقت یہ ضعیفہ یہ دستِ سوال دیکھ

حقایق و معارف

از
(جناب الم مظفر نگری)

مستی و علم و نظر

وہ فلسفی ہو کہ صوفی ہو یا کہ ہو ملا
حرم نشیں ہو کہ دیرِ مغاں کا ہو شیدا

جو فیض مے کدۂ عشق سے رہا محروم
گناہ مستیٔ علم و نظر سے بچ نہ سکا

دل مکدّر

جو دل بہ جوہرِ غم با صفا نہیں ہوتا
قسم خدا کی کسی کام کا نہیں ہوتا
جمالِ یار نظر آئے کس طرح اس میں
مکدر آئینہ صورت نما نہیں ہوتا

خامیٔ عشق

خونبار نہیں دیکھا ابھی دیدۂ نمناک
شاید کہ نہیں زخم جگر حاملِ صد چاک
ہو جائے گی حاصل تجھے معراجِ محبت
بن جائے گی جس روز فغاں نالۂ بیباک

نقشِ حیات

سمجھ بہ فکرِ رسا معنیٔ حیات و ممات
زوال آپ ہے خود ضامنِ وجود ثبات
مٹا دیا تھا اسے موت نے جہاں اک دن
ابھر رہا ہے وہیں سے پھر آج نقشِ حیات

سبک روی

ہو بوئے گل کہ رنگ نغمہ ساز
سبک رو ہے یہاں ہر صاحبِ راز
کبھی صحنِ چمن کی وسعتوں میں
نظر آئی تجھے شبنم کی پرواز

تبصرے

حقیقت ذکر از مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی تقطیع متوسط طباعت وکتابت بہتر ضخامت ۲۷۲ صفحات قیمت مجلد عہ دو روپیہ بارہ آنہ پتہ :- کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

انسانی زندگی کی اصل سعادت وکامرانی کا حقیقی راز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ جو مبدأ فیاض اور منبع وسرچشمہ جمیع موجودات ومخلوقات ہے زیادہ سے زیادہ تقرب پیدا کیا جائے اور یہ تقرب بغیر ذکر کے جو زبان سے ہو یا قلب سے حاصل نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ مذہب کی تمام تعلیمات اور اس کی عبادات کا مقصد اور ان کی اصل روح بھی یہی ہے پھر چونکہ تقرب الی اللہ کے مدارج ومراتب مختلف بلکہ بے شمار ہیں اس بناء پر ضروری تھا کہ ذکر کے انواع واقسام بھی مختلف اور گوناگوں ہوں۔ چنانچہ بعض اذکار جو بشکل عبادات ہیں فرض ہیں کچھ سنت اور کچھ مستحب اور بعض واجب ہیں قرآن وسنت میں یہ تمام اذکار اور ان کے احکام وفوائد جگہ جگہ مذکور ہیں زیر تبصرہ کتاب میں ان سب کو بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ یکجا کر دیا گیا ہے۔ جس کے مطالعہ کے بعد تمام اذکار واجبہ ومسنونہ اور ان کے فوائد ومنافع کا علم بیک وقت ہو جاتا ہے اور ان کی روشنی میں اگر کوئی چاہے تو بڑی آسانی سے تذکیہ باطن کا سامان کر سکتا ہے اس طرح کے مباحث میں عام طور پر مستند اور غیر مستند روایات کو خلط ملط کر دیا جاتا ہے لیکن فاضل مصنف نے اس کا اہتمام کیا ہے کہ اس سلسلہ کی مستند روایات اور ان کی تشریح وتوضیح کے ضمن میں مشاہیر ائمہ کے اقوال وارشادات کو بھی جمع کیا ہے زبان صاف وسلیس ترتیب پسندیدہ اور انداز بیان مؤثر ودل نشین ہے۔ مسلمانوں کو اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھانا چاہئے کہ

درحقیقت ہر درد کی کامیاب دوا اور ہر غم کا مکمل علاج ذکر اللہ اور صرف ذکر اللہ ہی ہے

عروسِ نیل | تقطیع متوسط ضخامت ۱۹۴ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ۱؍۸ عہ پتہ :- مکتبہ جامعہ لمیٹڈ دہلی ۔

محترمہ سلطانہ آصف فیضی کو اپنے شوہر جناب آصف فیضی کے ساتھ جب کہ موصوف مصر میں ہندوستان کے سفیر تھے مصر میں قیام کرنے اور وہاں کے سماجی و معاشرتی حالات کا مطالعہ کرنے کا موقع ملا تھا اس کتاب میں محترمہ سلطانہ نے مصر کے اپنے انھیں چشم دید حالات و واقعات اور ان کے ساتھ وہاں کے مشہور تاریخی اہرام کا تذکرہ کیا ہے اگرچہ اس سے قبل لائق مصنفہ کی کوئی تحریر کبھی دیکھنے میں نہیں آئی ۔ لیکن اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اردو زبان کی پختہ مشق ادیبہ اور مصنفہ ہیں شروع سے آخر تک شگفتگی بیان کی وجہ سے کتاب اتنی دلچسپ ہے کہ ایک مرتبہ شروع کرنے کے بعد ختم کئے بغیر اسے ہاتھ سے رکھ دینے کو جی نہیں چاہتا یہ طرزِ تحریر مرزا فرحت اللہ بیگ کے طرزِ نگارش سے بہت ملتا جلتا ہے جہاں تک مصر کی موجودہ تہذیب و تمدن کا تعلق ہے تو اس کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر ہندوستان سے بھی گیا گذرا ہے یہاں کے بڑے سے بڑے مغرب زدہ مسلمان کو یہ جرأت نہیں ہو سکتی کہ وہ شادی بیاہ کے موقع پر جلسۂ عام میں اعلیٰ قسم کی شراب کا اہتمام کرے عورتیں اور مرد ساتھ بیٹھ کر بادہ نوشی کریں، دلہن مغربی لباس میں ہفت آرائش کئے ہوئے دولہا کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے مجمع عام میں جلوہ طراز ہو لیکن مصر جو قبۃ الاسلام ہے اور جہاں کہ شیخ ازہر کو اب بھی وہاں کی مذہبی و دینی قیادت حاصل ہے جسے حکومت بھی تسلیم کرتی ہے وہاں کے اونچے طبقہ میں یہ سب کچھ ہوتا ہے وہاں کا اعلیٰ تعلیم یافتہ طبقہ بالکل مغربی تہذیب و تمدن میں ڈوبا ہوا ہے اور اس کے عام اثرات پوری سوسائٹی پر چھائے ہوئے ہیں ۔ البتہ چونکہ کہنے کو ایک اسلامی ملک ہے اس لئے وہاں جو کام بھی کیا جاتا ہے اس پر اسلام کا لیبل لگا دیا جاتا ہے چنانچہ رمضان کے مقدس مہینہ میں مصر کی

مشہور فلم ایکٹر یسین، مغنیہ اور رقاصہ عورتیں جو ملک سے باہر ہوتی ہیں وہ بھی اس ماہ مبارک میں اپنے وطن لوٹ آتی ہیں اور پھر رقص گاہوں کی طرف سے عام اشتہار ہوتا ہے کہ فلاں فلاں رقاصائیں اور مسخرے رمضان کی خاطر لندن یا پیرس سے واپس آگئے ہیں اس لئے شہر رمضان کی تعظیم وتکریم میں آج شب کو فلاں رقص گاہ میں ان کا ناچ گانا ہوگا چنانچہ کچھ نیک اور دقیانوسی" لوگ جہاں افطار کے بعد تراویح اور نماز عشا میں اپنا وقت صرف کرتے ہیں۔ یاران زندہ دل ہجوم در ہجوم رقص گاہوں اور سینماؤں میں بیٹھ کر دل بہلاتے ہیں افسوس!

چو کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

بہرحال ادبی اور سفرنامہ کی حیثیت سے اور بعض تاریخی معلومات کے اعتبار سے کتاب بڑی دلچسپ اور پڑھنے کے لائق ہے۔

آہنگ حجاز از پنڈت بال مکند عرش ملسیانی تقطیع خورد ضخامت ۳۲ صفحات کتابت وطباعت اور کاغذ نہایت اعلیٰ اور دیدہ زیب، قیمت عہ، پتہ:- مرکز تصنیف وتالیف نکودر (پنجاب)

جناب عرش ملسیانی اردو زبان کے مشہور خوش گو اور شیوا بیان شاعر ہیں یہ کتابچہ جو بقامت کہتر وبقیمت بہتر کا مصداق ہے موصوف کی بارہ غزلوں کا مجموعہ ہے جن میں انھوں نے سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ قدس میں اپنے جذبات عقیدت وارادت کا نذرانہ پیش کیا ہے۔ حسن بہرحال حسن ہے اس کے اعتراف وافرار اور اس کے ساتھ محبت وستائش کا معاملہ کرنے کے لئے ملک وقوم اور مذہب ونسل کی کوئی قید نہیں صرف ایک دیدۂ بینا درکار ہے اس بنا پر کون کہہ سکتا ہے کہ پنڈت بال مکند اپنے تخلص کے معنوی استحقاق کو ثابت کرنے کے لئے اس مجموعہ سے زیادہ اور کیا دلیل وبرہان پیش کر سکتے تھے بقول مولانا شبلی کے نعت گوئی ایک سنگلاخ میدان ہے

لیکن جناب عرشؔ کی قدرتِ کلام نے سوزِ جگر کے ساتھ مل کر اس وادیٔ ہفتخواں کو بڑی خوبی سے طے کیا ہے جس پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کی قدر کر کے لائق مصنف کے فنی کمال و حسنِ طبع کی داد دیں گے۔ یہ مجموعہ دیکھنے اور پڑھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ لیکن دو شعر تو آپ بھی سنتے چلئے۔

زہے شانِ براہیمی کہ نمرودوں کی دنیا میں | وہ جس آتش کو بھی کہہ دے وہی گلزار ہو جائے
ہاں ہاں تمہیں تو ہو دلِ عالم کے دل نواز | دل دار و دل نشین و دل آرا تمہیں تو ہو

شروع میں مولانا عبد الماجد دریا بادی کے قلم سے تین صفحوں کا ایک پیش لفظ بھی پڑھنے کے لائق ہے۔

اسلامی زندگی از مولانا محمد احتشام الحسن کاندھلوی تقطیع خورد ضخامت ۳۲ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت ہم رپیہ:۔ کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی۔

اس رسالہ میں حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ارشادات و فیوض کی روشنی میں اسلامی زندگی کے دستور العمل کا ایک، خاکہ پیش کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اصل سعادت و کامرانی تعلق باللہ ہے اس تعلق کے مقتضیات کیا ہیں؟ اس تعلق پر کیا اثرات و ثمرات مرتب ہوتے ہیں اور یہ تعلق کیوں کر پیدا کیا جاتا ہے۔ اسلام کی اس بارہ میں تعلیمات کیا ہیں؟ اور ان تعلیمات کا انسان کی اجتماعی اور انفرادی زندگی پر کیا اثر ہوتا ہے اس کا مطالعہ مسلمانوں کے لئے مفید ہوگا۔

برہان

جلد ۳۳ شمارہ ۲

اگست ۱۹۵۴ء مطابق ذی الحجہ ۱۳۷۳ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

از

(سعید احمد)

(۳)

علوم عربیہ کسی ایک علم کے نصاب درسی پر غور کرتے وقت اصولاً تین چیزیں پیش نظر رکھنی چاہئیں۔

(۱) اس علم کی غرض و غایت کیا ہے؟

(۲) اس علم کی تعلیم کے لئے جو نصاب مقرر کیا گیا یا تجویز کیا جا رہا ہے اس سے اس علم کی غرض و غایت کہاں تک حاصل ہو سکتی ہے۔

(۳) اس علم کے مقررہ نصاب کی تعلیم کا جو طریقہ رائج ہے اس سے اس علم کی غرض و غایت کے حصول میں کہاں تک مدد ملتی یا مل سکتی ہے۔

اب ان امور سہ گانہ کے معیار پر ہمارے موجودہ مدارس کے نصاب علوم عربیہ کو جانچئے اور پرکھئے تو حقیقت خود بخود واضح ہو جائے گی۔

غرض و غایت علوم عربیہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ زبان عربی کا صحیح ذوق پیدا ہو۔ اس کا سمجھنا ایسا ہی آسان ہو جائے جیسا کہ کسی شخص کو اپنی مادری زبان کا ہوتا ہے۔ عام طور پر لکھتے ہیں کہ علوم عربیہ کی غرض و غایت یہ ہے کہ عربی میں بولنے اور لکھنے کا سلیقہ پیدا ہو جائے، لیکن یہ تصویر کا صرف ایک رخ ہے اور وہ بھی ناتمام ادھورا اور نامکمل! بہت سے لوگ ہوتے ہیں جو کسی ایک زبان میں تحریر و تقریر کی اچھی استعداد رکھتے ہیں لیکن وہ زبان کے نکتہ داں اور اس کے

اسالیبِ بیان کی باریکیوں کے محرمِ اسرار نہیں ہوتے۔ مدارسِ عربیہ میں علومِ عربیہ کی تعلیم کا مقصد صرف ادبی یا لسانی نہیں ہوتا بلکہ دینی بھی ہوتا ہے اور چونکہ دین کا اصل سرچشمہ اور منبع قرآن مجید ہے اور وہ ظاہر ہے کہ فصاحت و بلاغت کے مرتبۂ اعجاز کی آخری کڑی ہونے کے باعث عربی زبان کا سب سے بڑا اور سب سے اعلیٰ شاہکار ہے اسی بناپر قرآن مجید سے حقیقی اور پائدار و مستقل استفادہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ عربی زبان کا ذوق صحابۂ کرام جیسا پیدا کرنے کی کوشش کی جائے۔ حضرتنا الاستاذ مولانا سید محمد انور شاہ الکشمیری اکثر فرماتے تھے کہ جس طرح الفاظ میں ترادف اور معانی میں اشتراک نہیں ہے اور جن لوگوں نے اس کا دعویٰ کیا ہے وہ سرے سے وضع لغوی کی اصل حقیقت و ماہیت سے ہی واقف نہیں ہیں۔ اسی طرح ایک جملہ یا ایک فقرہ اور ایک عبارت کا اصل مطلب صرف ایک ہی ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے۔ ایک جملہ کے کئی کئی مطلب بیان کرنا۔ اس میں مختلف قسم کی تاویلیں کرنا "شد پریشاں خواب من از کثرت تعبیر ہا" کا مصداق ہے۔

صرف ونحو اب غور کیجئے علومِ عربیہ کی تعلیم کے لئے جو نصاب مقرر کیا گیا ہے اس سے یہ غرض و غایت کہاں تک حاصل ہو سکتی ہے؟۔

اس سلسلہ میں آغاز صرف ونحو سے ہوتا ہے۔ لیکن شروع میں ہی مبتدی کے ذہن و دماغ پر اتنا دباؤ ڈال دیا جاتا ہے کہ وہ گھبرا جاتا ہے اور گم شدہ و حیران ہو کر رہ جاتا ہے۔ کسی زبان کو پڑھانے کا طبعی طریقہ یہ ہے کہ اس زبان کے صرف ونحو کی تعلیم سے قبل طالب علم کو کسی حد تک اس زبان سے آشنا اور مانوس کیا جائے اور پھر ایک ہی قاعدہ کی مختلف مثالیں دے کر طالب علم کے ذہن میں استفسار و تجسس پیدا کیا جائے اور اس کے بعد اسی استفسار کے مطابق اس کو قواعد کی تعلیم دی جائے۔ آج کل کی اصطلاح میں اس کو Direct Method یعنی طریقہ راست کہتے ہیں۔ اس کے لئے ضرورت ہے کہ پہلے مبتدی کو بہت سے مفرد الفاظ مع ان کے معانی کے یاد کرا دیے جائیں۔ یہ الفاظ

اسما۔ افعال اور حروف پر مشتمل ہونے چاہئیں اس کے بعد آسان آسان جملے ایک ہی قسم کے بنا کر اس کے سامنے پیش کئے جائیں، اب طالب علم کے ذہن میں خود بخود سوال پیدا ہوگا کہ فلاں لفظ کی حالت ان تمام جملوں میں یکساں کیوں رہتی ہے؟ تو اب استاد کے لئے موقع ہوگا کہ وہ بتاتے کہ مثلاً فلاں لفظ چونکہ فاعل واقع ہو رہا ہے اس لئے وہ مرفوع ہے اور چونکہ فاعل ان سب جملوں میں مذکر غائب ہے اس لئے اس کے لئے مختلف جملوں میں جتنے بھی فعل آئے ہیں وہ سب اپنا ایک مخصوص وزن رکھتے ہیں۔ مثلاً فعل کے وزن پر ہیں؛ اسی طرح ہونا یہ چاہئیے کہ زبانِ عربی سے کسی قدر مانوس اور آشنا کرنے کے بعد صرف اور نحو کی تعلیم ایک ساتھ دی جائے اور وہ بھی اسی طرح کہ پہلے طالب علم کے ذہن میں استفسار پیدا کر دیا اور اس کے بعد اس کا جواب بتا دیا، علاوہ بریں ابتدائی تعلیم صرف زبانی ہونی چاہئیے اور اس کی مدد کے لئے بلیک بورڈ کا استعمال کرنا چاہئیے، بالکل شروع میں میزان و منشعب کا درس دینا نہایت غلط اور ناصواب طریقہ ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ وقت زیادہ صرف ہوتا ہے۔ ذہن پر غیر معمولی دباؤ پڑتا ہے اور اس کا حاصل معلوم! غور کیجئے! رباعی مجرد رباعی مزید فیہ۔ خماسی مجرد اور خماسی مزید فیہ کے ابواب و صیغ سے ایک طالب علم کو کتنا واسطہ پڑتا ہے؟ یہ اوزان نادر ہیں، قلیل الاستعمال ہیں اور بہت کم لفظ ہیں جو ان ابواب میں استعمال ہوتے ہوں، لیکن اس کے باوجود مدارس کے مبتدی طالب علم کے لئے ضروری ہے کہ ان سب ابواب کو مع ان کے صیغوں کے نوک زبان یاد کرے۔

• قواعد زبان کے لئے ہوتے ہیں اور زبان سے بنائے جاتے ہیں، لیکن ہمارے ہاں جو طریقہ رائج ہے اس نے قواعد کو اصل اور زبان کو ان کے تابع بنا دیا ہے۔

علاوہ بریں ایک ہی مضمون کو بار بار مختلف کتابوں کے ذریعہ پڑھانا اس قدر مفید نہیں ہے جتنا کہ اس مضمون کو اس طرح پڑھانا ہے کہ مضمون طالب علم کے بالکل ذہن نشین ہو جائے اور اس کا دماغ اس کو علیٰ وجہ البصیرت قبول کر لے اور یہ صورت اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب کہ قواعد کی تمرین و مشق طرح طرح کی مثالوں کے ذریعہ کرائی جائے۔ موجودہ نصاب اور

اس کے طریق تعلیم میں بڑا نقص یہ ہے کہ قواعد کے افہام و تفہیم کے لئے جو کتابیں تجویز شدہ ہیں ان کی عبارتیں چست، صاف اور رواں نہیں ہیں ان میں اغلاق اور پیچیدگی ہے اور پھر لے دے کی جو مثالیں دی جاتی ہیں وہ گنی چنی ہیں۔ مصر نے اس سلسلہ میں بڑے کامیاب تجربے کئے ہیں ان سے استفادہ نہ کرنا اور اسی پرانی لکیر کے فقیر بنے رہنا عہد حاضر کی عظیم الشان تعلیمی ترقیات و کامیاب تجربات کا مذاق اڑانا ہے۔

عربی ادب | صرف و نحو کے بعد عربی ادب کی باری آتی ہے اس سلسلہ میں نظم کی کتابیں مثلاً سبعہ معلقہ، متنبی اور حماسہ معیاری کتابیں ضرور ہیں لیکن ضرورت ہے کہ سہل سے مشکل کی طرف کے اصول کے مطابق اس میں بھی ترمیم اور اصلاح کی جائے " سبعہ معلقہ کا پہلا اور دوسرا اور تیسرا قصیدہ بہ نسبت باقی قصیدوں کے زیادہ مشکل ہیں اگر پڑھانے میں ان کی ترتیب بدل دی جائے تو شاید زیادہ فائدہ ہو بہر حال جہاں تک نثر کی کتابوں کا تعلق ہے ان کو یکقلم بدل دینے کی ضرورت ہے کسی زبان کا ادبی ذوق مقامات حریری جیسی کتابوں سے نہیں پیدا ہوتا جس میں صرف لفاظی، صنائع بدائع کی بھرمار اور نہایت پر تکلف عبارت آرائی ہے اس کے علاوہ مضمون و معنی کے اعتبار سے یہ کتاب ہرگز اس لائق نہیں ہے کہ ملت بیضا کے نوجوان اس کو پڑھیں، مکر و فریب، دجل و دسیسہ کاری، بہروپیے پن کے واقعات کے سوا اس میں اور کیا ہے جس کو پڑھ کر طالب علم کے اخلاق پر اچھا اثر پڑے آج نہج البلاغۃ، رسائل ابو العلا، معری کتاب الآداب، لجعفر بن شمس الخلافۃ مجد الملک۔ النظرات، العبرات، رسائل جاحظ جیسی سینکڑوں کتابیں موجود ہیں جو زبان و انشاء کے شاہکار بھی ہیں اور جن سے مختلف قسم کی علمی، ادبی، لسانی، تاریخی اور اخلاقی معلومات و فوائد بھی حاصل ہو سکتے ہیں، اور اگر کسی کتاب کو تمام ضرورتوں کی تکمیل کے لئے کافی و وافی نہ سمجھا جائے تو بہتر سے بہتر انتخاب بھی علامہ ابن خلدون کے چار ارکان ادب سے ہو سکتا ہے۔

عربی ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں ایک بڑا نقص مدارس عربیہ کے نصاب میں یہ ہے

کہ صرف نثر اور نظم کی چند کتابیں پڑھانے پر اکتفا کر لیا جاتا ہے۔ حالانکہ کسی زبان کے ادب سے متعارف ہونے کے لئے تاریخِ ادبیات، زبان کا عہد بعہد ارتقاء اس کے مختلف اسالیبِ بیان۔ ہر دور کے اسلوب کی خصوصیات۔ مختلف ادوار کے شاعروں کا اور خود ایک ہی دور کے دو متقابل شعرا کا تقابلی مطالعہ۔ جس قوم کی زبان ہے۔ اس قوم کی تاریخ۔ اس کے معتقدات عادات و اطوار، رسم و رواج۔ اس کے سماجی اور معاشرتی حالات۔ اس زبان پر آس پاس کی زبانوں کے اثرات۔ تمدنی اور تہذیبی جذب و انجذاب۔ ان سب چیزوں کا معلوم کرنا بھی ضروری ہوتا ہے۔ جس طرح تاریخِ ادب کا علم ضروری ہے اسی طرح عربی کی فیلالوجی کا جاننا بھی ضروری ہے اس سے صرف عربی ادب کے سمجھنے میں مدد نہیں ملے گی۔ بلکہ خود قرآن مجید کے فہم اور اس کے مطالب و معانی کے علیٰ وجہ البصیرت ادراک میں بھی بڑی سہولت پیدا ہو جائے گی

آج اگر کسی سے کہئے کہ قرآن مجید میں بعض الفاظ ایسے بھی ہیں جو خالص عربی النسل نہیں ہیں تو وہ شاید حیرت سے آپ کا منہ تکنے لگے گا لیکن واقعہ یہی ہے کہ ایسے الفاظ موجود ہیں اور علامہ جلال الدین سیوطی نے "المزہر" میں اور پروفیسر حتی نے اپنی تاریخ عرب میں ان کی فہرست بھی دی ہے۔ تو اب لامحالہ ہم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ یہ الفاظ اس زمانہ کے عربوں میں کس تقریب سے رائج ہوئے اصل زبان میں ان کے معنی کیا تھے اور عربی میں دخیل ہو کر ان سے کیا مراد لی جاتی تھی۔ اس سے دوسری قوموں کے ساتھ عربوں کے تمدنی و تہذیبی تعلقات پر روشنی پڑے گی۔ اور اس سے خود قرآن مجید کے سمجھنے میں مدد ملے گی۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا تھا "الشعر دیوان العرب" لیکن ہمارے طلبا عربی شعر کا مطالعہ اس طرح کرتے ہیں کہ چند شاعروں کے نام کے علاوہ انھیں اور کچھ معلوم نہیں ہوتا

علم معانی و بیان اس علم کی غرض و غایت یہ ہے کہ کلام کے محاسن و معائب مختلف اسالیبِ بیان کے مدارج و مراتب اور اس کے وجوہ کا علم ہو۔ اس فن کی تعلیم کے لئے متن میں تلخیص المفتاح اور شروح میں مختصر المعانی اور مطول کا درس دیا جاتا ہے۔ جہاں تک

تلخیص اور مختصر المعانی کا تعلق ہے اس میں شبہ نہیں کہ دونوں کتابیں بہت مفید اور عمدہ ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ ان کتابوں سے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت اور اس کے مرتبۂ اعجاز کے سمجھنے اور ان سے لطف اندوز ہونے میں کتنی مدد ملتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ فصاحت و بلاغت معانی و بیان کے جو اصول و آداب ہیں ان کو علم العروض کی طرح عربوں کے عام کلام کو سامنے رکھ کر وضع۔ مرتب اور مدون کیا گیا ہے اور پھر ان اصول کی روشنی میں قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کو پرکھا اور جانچا گیا ہے یہی وجہ ہے کہ فصاحت و بلاغت کی مزعومہ تعریف کی روشنی میں قرآن مجید کے بعض الفاظ "الماعهد" فصاحت سے خارج قرار پاتے ہیں تو اب دور از کار تاویل و توجیہ کے دامن میں پناہ لینی پڑتی ہے حالانکہ دراصل ہونا یہ چاہیے تھا کہ چوں کہ قرآن مجید فصاحت و بلاغت کی اعلیٰ ترین مثال اور عربی زبان کا سب سے بڑا شاہکار ہے اس بنا پر فصاحت و بلاغت اور معانی و بیان کے اصول خود قرآن مجید سے مستنبط کیے جاتے، گویا فصاحت و بلاغت کا معیار اور کسوٹی کلام عرب کو بنانے کے بجائے خود قرآن کو بنانا چاہیے تھا اس کا فائدہ جہاں ادبی، علمی اور تنقیدی ہوتا۔ دینی اور روحانی بھی ہوتا آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک موقع پر فرمایا ہے "النوم اخو الموت" بہ ظاہر یہ تین لفظوں کا مرکب ایک چھوٹا سا جملہ ہے لیکن اس کی بلاغت کا یہ عالم ہے کہ حضرتنا الاستاذ الکشمیریؒ فرماتے تھے اگر آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی کوئی اور دلیل میرے سامنے نہ بھی ہوتی اور صرف آپ کا یہ ارشاد ہوتا تو بے شبہ میں اسی کو سن کر آپ کی نبوت پر ایمان لے آتا۔ قرآن مجید کی آیت آیت ایک ایک فقرہ اور جملہ چمن زار فصاحت و بلاغت اور گل کدۂ اعجازِ معانی ہے پھر ہم میں کتنے ہیں جو اسے پڑھ کر سر دھنتے ہوں اور جن پر اس کی تلاوت کرتے وقت وجد و کیف کا ایک عالم طاری ہو جاتا ہو۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور دوسرے بعض صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کی نسبت روایات ملتی ہیں کہ چھوٹی چھوٹی سورتوں کے ختم کرنے میں ہی ان کو ہفتوں اور مہینے لگ جاتے تھے! تو کیا یہ روایات محض افسانے اور طلسم ہوش ربا قسم کی داستانیں ہیں؟ نہیں بلکہ حق یہ ہے

کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت ان بزرگوں کا حال یہ ہوتا تھا کہ

زفرق تا بقدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامن دل می کشد کہ جا این جاست

الفاظ کی سحر آفرینی اور اس کی غیر معمولی طاقت و قوت ایک مسلمہ حقیقت ہے جو کام بعض اوقات بڑی بڑی فوجیں اور عظیم لشکر نہیں کر سکتے وہ دو چار فقرے کر جاتے ہیں۔ جہاں تک عرب جیسی ضدی۔ درشت مزاج اور ان گھنی قوم کے یک بیک پلٹ جانے اور سر تا سر منقلب ہو جانے کا تعلق ہے تو کون کہہ سکتا ہے اسلام کی تعلیمات حقہ اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اسوۂ حسنہ کے علاوہ اس میں خود قرآن مجید کے اعجاز بیان و اسلوب ادا کو بڑا دخل نہیں ہے

پس اگر ہمارے علم معانی و بیان پڑھنے اور اس میں کئی سال صرف کرنے کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ قرآن مجید کی تلاوت کرتے وقت ہم کو اس میں غیر معمولی حظ آئے اور اس کی حقیقی عظمت سے ہمارے دل و دماغ دونوں متاثر ہوں تو ظاہر ہے کہ پھر اس پڑھنے پڑھانے کا فائدہ بھی کیا ہوا؟

اس سلسلہ میں مولانا حمید الدین فراہی کی کتاب جمہرۃ البلاغۃ۔ اپنی نوعیت کی پہلی کتاب ہے۔ جس میں قرآن مجید کو کسوٹی بنا کر بلاغت کے اصول و قواعد سے بحث کی گئی ہے، ضرورت ہے کہ مدارس عربیہ اس کی طرف توجہ کریں اس کے علاوہ امام رازی کی نہایۃ الایجاز۔ علامہ باقلانی کی "اعجاز القرآن" اور جعفر بن قدامہ کی "نقد النثر"، تفسیر روح المعانی کی اور تفسیر کشاف کی حسبۃ حسبۃ ادبی اور بلاغت سے متعلق بحثیں یہ سب اس لائق ہیں کہ علم معانی و بیان کا طالب علم ان سے استفادہ کرے اور باقاعدہ ان مضامین کا اس کو درس دیا جائے۔

اس سلسلہ میں سب سے بڑی قباحت اور دشواری یہ ہے کہ چونکہ مدارس میں تعلیم کا طریقہ بجائے فنی کے کتابی ہوتا ہے اور اس بنا پر استاد اور طالب علم دونوں کی توجہ کتاب کو سمجھنے اور اس کی چیستانوں کے حل کرنے پر مرکوز رہتی ہے اس لئے طالب علم کو فن سے متعلق نہ وسیع معلومات حاصل ہوتی ہیں اور نہ اس کو اس میں بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک سال پورا مختصر المعانی اور دوسرا ایک سال مطول کی نذر ہو جاتا ہے اب ظاہر ہے کہ صرف

تو ہوئے دو سال مگر حاصل صرف یہ نکلا کہ طالب علم نے سوا کتاب (مختصر پوری اور مطول ۱/۲) پڑھی، اس کے برخلاف اگر متن پڑھانے کے بعد معانی و بیان کے مباحث پر لکچروں کا انتظام کیا جائے، جیسا کہ کالجوں کی اونچی کلاسوں میں ہوتا ہے تو طالب علم کو فن پر عبور بھی حاصل ہوگا اور اس کی معلومات بھی وسیع ہوں گی۔

تنقید | تنقید آج کی دنیا کا نہایت ترقی یافتہ فن ہے لیکن اس فن میں عربوں کے جو کارنامے ہیں اور انھوں نے کسی کلام کے حسن و قبح کو پرکھنے اور جانچنے کے لئے جو اصول و ضوابط مدّن کئے ہیں وہ آج بھی مغربی اصولِ تنقید کے ساتھ دم فخر و مباہات مارنے کے لئے کافی ہیں۔ کسی کلام یا کلمہ کے حسن و قبح کا کوئی مخفی اور ظاہر اونچا اور اعلیٰ پہلو ایسا نہیں ہے جس پر عربوں نے دادِ تحقیق نہ دی ہو اور جس پر کمال ژرف بینی سے بحث نہ کی ہو۔ عربی ادب کی ضخیم مجلدات میں جا بجا یہ بحثیں بکھری پڑی ہیں، ان کے علاوہ ابن رشیق۔ ابو منصور ثعالبی۔ اور ابن قدامہ وغیرہم نے اسی موضوع پر مستقل کتابیں لکھی ہیں جو خوش قسمتی سے آج کل ملتی ہیں لیکن افسوس ہے کہ عربی ادب کی تعلیم کے سلسلہ میں اس فنِ تنقید کا مدارسِ عربیہ میں کہیں گذر نہیں ہے،

جدید عربی ادب | اگر آپ کسی زبان اور اس کے ادب کے فارغ التحصیل ہیں، اس کے فاضل کہلاتے ہیں۔ لیکن خود آپ کے زمانہ کا جو اس زبان کا ادب ہے آپ نہ تو اس سے واقف ہیں اور نہ اس زبان میں اہلِ زبان کے ساتھ بات چیت کر سکتے اور نہ اپنے خیالات کا اظہار کر سکتے ہیں تو یہ بالکل ایسا ہی ہے کہ آپ ایک تاریخی عمارت کو دیکھنے جائیں اور صرف اس کے عہد قدیم کے در و دیوار دیکھ کر واپس چلے آئیں اور اس میں عہد بعہد جو ترقیات ہوئی ہیں ان کی طرف کوئی اعتنا نہ کریں، مصر اور بعض اور ممالک عرب میں حال ہی میں جو ادبی۔ شعر اور نثر میں عظیم الشان ترقیات ہوئی ہیں۔ ضروری ہے کہ عربی ادب کا طالب علم ان سے واقف ہو۔ تاکہ اس طرح ان ممالک کے ساتھ کلچرل تعلقات کے قائم رکھنے اور ان کو ترقی دینے میں بھی مدد ملے اور آپ کو یہ بھی معلوم رہے کہ آج قرآن مجید

کی زبانِ عربی موجودہ دنیا کی اعلیٰ ترقی یافتہ زبانوں کے دوش بدوش کس طرح چل رہی ہے، بین الاقوامی معاملات میں اس زبان کا کیا عمل دخل اور نفوذ و اثر ہے اور اس نے اپنے ادب کے ذریعہ دوسری قوموں کے خیالات و افکار پر کیا اثرات کئے ہیں، جدید عربی زبان و ادب کا مطالعہ نہ صرف علمی۔ اور تمدنی حیثیت سے ضروری ہے بلکہ سیاسی اور سماجی حیثیت سے بھی ضروری ہے۔ چنانچہ شاید آپ کو معلوم ہو آج امریکا۔ کناڈا اور یورپ کے چھوٹے بڑے ملک عہدِ حاضر کے عربی ادب سے خاص طور پر دلچسپی لے رہے ہیں۔ اور اسی موضوع پر ریسرچ کرنے کے لئے طلباء کو گراں قدر وظائف دے کر ادھر اُدھر بھیج رہے ہیں!

(باقی آیندہ)

تفسیر مظہری (عربی)

کلام الٰہی کی بہترین تفسیر

علماء طلباء اور عربی مدرسوں کے لئے شاندار تحفہ

مختلف خصوصیتوں کے لحاظ سے تفسیر مظہری تفسیر کی تمام کتابوں میں بہترین سمجھی گئی ہے بلکہ بعض حیثیتوں سے اپنی مثال نہیں رکھتی یہ حقیقت ہے کہ اس عظیم الشان تفسیر کے بعد کسی تفسیر کی ضرورت نہیں رہتی، امام وقت قاضی ثناء اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کمالاتِ علمی کا عجیب و غریب نمونہ ہے۔

اِس بے مثال کتاب کا پورے ملک میں ایک نسخہ ملنا بھی دشوار تھا، شکر ہے کہ برسوں کی جد و جہد کے بعد آج ہم اس لایق ہیں کہ اس متبرک کتاب کے شایع ہونے کا اعلان کرسکیں، تقریباً تمام جلدیں زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں صرف آخری جلد جس میں دو پاروں کی تفسیر ہے زیر طبع ہے۔

ہدیہ غیر مجلد:- جلد اول ساتؔ روپے۔ جلد ثانی ساتؔ روپے۔ جلد ثالث آٹھ روپے۔ جلد رابع پانچ روپے۔ جلد سادس آٹھ روپے۔ جلد سابع آٹھ روپے۔ جلد ثامن آٹھ روپے۔ جلد تاسع پانچ روپے۔ جلد عاشر زیر طبع۔ ہدیہ کل جلد ترسٹھ... [illegible]

حقیقت تصوف

فقرو احسان یا رہبانیت و خانقاہیت

از

(جناب مولوی محمد قطب الدین احمد صاحب۔ حیدر آباد دکن)

(۲)

اتہام رہبانیت | یہ بھی کہا جاتا ہے کہ تصوف ترک دنیا، بے عملی اور رہبانیت کی تعلیم دیتا ہے۔ حالانکہ یہ دنیا نہیں بلکہ اس کے بے اعتدالانہ استعمال سے روکتا ہے۔ اس کی تعلیم ہے کہ انسان کو خدا کی عطا کردہ تمام نعمتوں سے استفادہ کرنا چاہئیے، لیکن اس طرح کہ ان کی محبت دل میں جاگزیں نہ ہونے پائے۔ جیسا کہ کسی عارف تام المعرفت کا قول ہے، دنیا در دل در دست و در دست دوار، یعنی آنجا عطا میشود داین جا عطا، امام احمد غزالی نے خواجہ ابو سعید ابو الخیر کے شاہانہ طمطراق اور کروفر کو دیکھ کر یہ اعتراض کیا کہ ہر وقت دوسروں کو دنیا اور اس کے تعلقات سے انقطاع و علیحدگی کی ترغیب و تحریص اور خود کی یہ حالت کہ مکان کا ہر گوشہ سرو سامانِ دنیوی سے معمور اور اصطبل اونٹوں اور گھوڑوں سے بھرپور ہیں جن کی طنابیں ابریشمی اور میخیں سنہری ہیں اس کا برجستہ جواب یہ دیا گیا کہ "میخ آں در گل زدہ ام نہ در دل" جب جامیؒ نے خواجہ عبید اللہ احرار سے پہلی دفعہ ملاقات کی تو ان کی امیرانہ شان و شوکت کو دیکھ کر یہ مصرع دبی آواز میں گنگنایا، نہ درویش آنکہ دنیا دوست دارد، خواجہ احرار نے فوری اس کا یہ جواب دیا، اگر دارد برائے دوست دارد، فقر و شاہی کو باہم سمونے میں یہ ایک مجتہدانہ شان رکھتے تھے چنانچہ تاریخِ تصوف میں یہ شعر ان کی اس حالت کا بہترین آئینہ دار ہے

چو فقر اندر لباسِ شاہی آمد زتدبیرِ عبید اللّٰہی آمد

• مقتضائے شریعت اور منشائے رسالت بھی یہی ہے کہ حدودِ الٰہی میں رہ کر دین و دنیا دونوں کو ساتھ ساتھ نبھایا جائے۔

اسی میں حفاظت ہے الغانیت کی کہ ہوں ایک جنیدی و اردشیری

• انسان کا دنیا اور نعائمِ دنیا سے تعلق اس مرغابی کی طرح رہے جو ہر وقت پانی میں رہتا ہے لیکن جب اُڑتا ہے تو ایک قطرۂ آب اس کے بال و پر سے چسپیدہ نہیں رہتا۔ آمیختہ ہمہ کس باش وآویختہ کس مباش۔

بگیر رسمِ تعلق دلا ز مرغابی کہ او از آب چو برخاست خشک پر برخاست

جو کچھ تباہی ہے وہ تعلقاتِ دنیوی سے وابستگی میں ہے، دنیوی نعمتوں سے نفع اٹھانے میں نہیں کیونکہ یہ طیبات اور زینت اللہ ہیں اور پیدا ہی انسان کے لئے کی گئی ہیں یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُلُوْا مِنَ الطَّیِّبٰتِ وَاعْمَلُوْا صٰلِحًا ط اور قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِیْنَۃَ اللّٰہِ الَّتِیْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِہٖ وَالطَّیِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ط اس روش اور اندازِ زندگی پر ناطق و شاہد۔

نہ تو زمیں کے لئے ہے نہ آسماں کے لئے جہاں ہے تیرے لئے تو نہیں جہاں کے لئے

عارف رومی نے اس صورتِ حال کا کس قدر بصیرت افروز نقشہ کھینچا ہے:-

آب در کشتی ہلاکِ کشتی است آب اندر زیرِ کشتی پشتی است

• حضرت محبوب الٰہیؒ کا یہ ملفوظ، جس کو حسن سنجری نے فوائد الفواد میں نقل کیا ہے، ترکِ دنیا کی اصل حقیقت کو کس خوبی کے ساتھ واشگاف کیا گیا ہے، "ترکِ دنیا آں نیست کہ کسے خود را برہنہ کند، لنگوٹہ بہ بندد بہ نشیند، ترکِ دنیا آنست کہ لباس بہ پوشد، و طعام بخورد و آنچہ میرسد روا بدارد، و بجمع آں میل نہ کند، و خاطر را متعلق چیزے مدارد، ترکِ دنیا ست۔"

کسی شخص نے ایک مالدار صوفی کو لکھا کہ تمہارے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے، یہ صحبتِ مار ہے جو کسی دن تمہیں ڈس جائے گی، اس کے جواب میں اُس نے لکھا کہ "صحبتِ مار کسے را

زباں کنند کہ افسونِ مار مید انند۔"

مال را اگر بہر دیں باشی حمول   نعم مالٌ صالحٌ گوید رسول

مطالباتِ نفس | نفس کے مطالبات دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک حقوق اور دوسرے حظوظ، حقوق وہ ہیں جو قوام بدن اور بقائے نسل وحیات کے لئے ناگزیر ہیں، اور حظوظ وہ ہیں جو جسم وجان کے لئے عیش ونشاط کا سر وسامان بہم پہنچاتے اور لذت اندوزیوں کا ساز وبرگ مہیا کرتے ہیں مگر جو زندگی کے قیام وبقا کے لئے لابدی نہیں، مجاہدہ کا خلاصہ یہ ہے کہ حقوق کو باقی رکھے اور حظوظ کے حصول کے درپے نہ ہو، اور ان کے اہتمام میں اپنا وقت ضائع نہ کرے، اور اگر یہ بلا مشقت حاصل ہوں تو ان سے اعراض نہ کرے کیوں کہ یہ کفرانِ نعمت ہے۔

کافر کی یہ پہچان کہ آفاق میں گم ہے   مومن کی یہ پہچان کہ گم اس میں ہیں آفاق

خواجہ نقشبندؒ کا یہ قول ہماری چشمِ بصیرت کو کس قدر کھولنے والا ہے "لقمہ چرب بخور وکار را خوب کن، بالجملہ مدار کار بر طاعت است، ہر قدر کہ ممد است مبارک است، وانچہ مخلِ ایں کار خانہ است ممنوع" بہرحال ہر معاملہ میں نیت اور خوشنودی رب پیش نظر رہے۔ مرزا مظہر جان جاناںؒ کے الفاظ ہیں، "طعام اگر بہ نیت اداے شکر با مزہ سازند، احسن می نماید، کہ در صورت بے مزگی شکر از تہ دل نمی آید۔ طعام لذیذ را بآمیزش آب بے مزہ ساختن نعمتِ الٰہی را بخاک انداختن است۔" ایک مرتبہ حاجی امداد اللہ مہاجر مکیؒ نے عارف تھانویؒ سے مخاطب ہوکر یہ کہا تھا کہ "اشرف علی پانی خوب ٹھنڈا پینا چاہیے، تاکہ ہر بن مو سے الحمد للہ نکلے اگر گرم پانی پیا جائے تو زبان تو الحمد للہ کہے گی مگر دل شریک نہ ہوگا۔"

دنیا اور اہل دنیا کے ساتھ صوفیاء کا طریق عمل | جس قرآن میں اللہ کی نعمتوں اور زینت اللہ کا بار بار ذکر کیا گیا ہو اور جن کو خدائے تعالیٰ بندوں پر اپنے احسانات میں شمار کرتا ہو، ان سے یہ خدا کے بندے کس طرح مجتنب رہ سکتے تھے۔ سماع کے جواز وعدم جواز سے قطع نظر اس سے اس امر کا اتنا تو ضرور ثبوت ملتا ہے کہ ان حضرات میں راہبانہ تقشف اور زاہدانہ یبوست

وخشک دماغی مطلقاً نہیں تھی۔ لحن وصوت کی دلآویزیوں سے کس کو انکار ہو سکتا ہے، خوش آویزی کے جو اثرات قلب وروح پر مترتب ہوتے ہیں اگر وہ کسی پاکیزہ مقصد کے لئے کام میں لائے جائیں تو بہت کچھ نفع حاصل ہو سکتا ہے۔ شاعری اور موسیقی ایک ہی حقیقت کے دو جلوے ہیں۔ زمرۂ صوفیاء میں جیسے باکمال شاعر ہوئے ہیں، ایسے ہی فن موسیقی میں بھی انھیں دستگاہ حاصل تھی، چنانچہ امیر خسرو، ملا عبدالقادر بدایونی، بحرالعلوم، شاہ عبدالعزیز دہلوی، مرزا مظہر جان جاناں اور خواجہ میر درد کو اس فن میں یدطولیٰ حاصل تھا۔ ابوالکلام آزاد نے فن موسیقی کی بابت بالکل سچ کہا ہے: "اس بات کی عام طور پر شہرت ہے کہ اسلام کا دینی مزاج فنون لطیفہ کے بالکل خلاف ہے اور موسیقی محرمات شرعیہ میں داخل ہے حالانکہ اس کی اصلیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ فقہا نے سد وسائل کے خیال سے اس بارے میں تشدد کیا، اور یہ تشدد بھی باب قضا سے تھا، نہ کہ باب تشریع سے، قضا کا میدان نہایت وسیع ہے جو چیز سوء استعمال سے کسی مفسدہ کا وسیلہ بن جائے، قضاءً روکی جا سکتی ہے لیکن اس سے تشریع کا حکم اپنی اصلی جگہ سے ہل نہیں سکتا قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ، ان لوگوں کے یہ ذوقی اشتغالات بھی محض نشاط آفرینیوں کے لئے نہیں ہوتے تھے بلکہ ان سے بھی وہ عشق الٰہی کے جذبات کو بھڑکانے کا کام لیتے تھے اور وجد وحال کی سرمستیوں میں اپنی زندگی معشوق حقیقی پر نچھاور کرتے سے بھی دریغ نہیں کرتے تھے اخبار الاخیار میں خواجہ قطب الدین بختیار کاکی کی رحلت کا واقعہ اس طرح درج ہے در خانہ شیخ علی سکری صحبت بود خواجہ در آنجا حاضر بود، قوال ایں بیت شیخ احمد جام بر خواند: کشتگان خنجر تسلیم را ہر زماں از غیب جانے دیگر است خواجہ را ایں بیت در گرفت وچہار شبانہ روز در تحیر بود دبریں بیت ذوق داشت وشب پنجم رحلت کرد

حاصل عمر نثار رہ یارے کردم شادم از زندگی خویش کہ کارے کردم

مردم گریزی اور کم آمیزی کا بھی الزام ان پر لگایا جاتا ہے۔ ان کے ہاں یہ چیز کیسے بار پا سکتی ہے جب کہ اسلام کی تعلیمات اس کے ہر ماننے والے کو یہ تلقین کرتی ہے کہ کشمکش حیات میں پوری

طرح حصہ لینے ہی سے انسان کی خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتیں اور ممکنہ قوتیں ابھرتی ہیں۔ جب یہ صورتِ حال ہو تو جن نفوسِ قدسیہ کی تمام تر زندگی کتاب وسنت کے سانچوں میں ڈھلی ہوئی تھی، وہ کیسے اس سے گریز کر سکتے تھے، اور زندگی کی ہما ہمی سے الگ تھلگ رہ کر آبادیوں سے دور غار وکوہ میں زاویہ نشینی اختیار کر سکتے تھے۔ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں حضورؐ کا ایک اثر پیش کیا ہے کہ:۔ "وہ مسلمان جو لوگوں میں مل جل کر رہتا ہے اور ان کی تکلیف دہی پر صبر کرتا ہے، اس سے بہتر ہے جو لوگوں سے نہیں ملتا، اور ان کی تکلیف دہی پر صبر نہیں کرتا، عارف رومی نے "رہبانیۃ فی الاسلام اور الجماعۃ رحمۃٌ" کے زیرِ عنوان اپنے ایک ملفوظ میں اس حقیقت کو یوں بر افگندہ نقاب کیا ہے، "مصطفےٰ صلعم کوشش در جمعیت نمود کہ جمع ارواح را اثرہاست بزرگ وخطیر در وحدت وتنہائی آں حاصل نشود وسر ایں کہ مسجد ہا بنا نہادہ اند آنست تا اہل محلہ آنجا جمع شوند تا رحمت وفائدہ افزوں باشد وخانہائے جداگانہ برائے تفریق وستر عیبہا د جامع را نہادند تا جمعیت اہل شہر آنجا باشد وکعبہ را واجب کردند تا اغلب خلق عالم از بلاد واقالیم آنجا جمع گردند۔ انبیاء علیہم السلام را بخلق مشغول کرد، مصطفےٰ صلعم را امر کرد کہ خلق را دعوت وصلاح کن ونصیحت دہ" خواجہ ابوسعید ابوالخیر کا قول ہے کہ "مرد آں بود کہ درمیان خلق نشیند وداد وستد کند، وزن خواہد وبا خلق در آمیزد ودمے از خدائے خود غافل نشود" کمال تقویٰ یہی ہے کہ پانی میں رہ کر دامن تر نہ کیا جائے اور کانٹوں میں الجھ کر زندگی کرنے کی خو پیدا کی جائے۔

صحبتِ دنیا مثالِ گلخن است   کہ از وحمام تقویٰ روشن است

چنانچہ یہی وجہ ہے کہ جو برگزیدہ ہستیاں مجتہدینِ فن اور اساطینِ تصوف شمار کی جاتی ہیں ان کی زندگیاں تہذیب وتمدن کے عین مرکزوں میں رہ کر اپنے ابنائے جنس کی اصلاح وارشاد میں بسر ہوئیں۔ عطار وسنائی۔ جنید وشبلی۔ شیخ جیلی وغزالی، بختیار کاکی ومحبوب الٰہی، مجدد الف ثانی وشاہ ولی اللہ دہلوی کے ارشاد وہدایت کی درسگاہیں بخارا وسمرقند، بغداد ودمشق اور لاہور ودہلی جیسی دار الحکومتوں میں تھیں۔ اگر ترک اور تیاگ تصوف کا نصب العین ہوتا تو یہ بھی اصحاب

کہف کی طرح کسی زاویۂ خول میں محو خواب ہوتے

دنیا کی عشاء ہو جس سے اشراق | مومن کی اذاں ندائے آفاق

فقرِ قرآن | قرآنی فقر تسخیر جہات، اور انفس و آفاق پر حکمرانی کی تعلیم دیتا ہے، غار و کوہ میں عزلت گزینی اور سبز بزیری کی نہیں۔ اسی فقر پر حضورؐ نے فخر و ناز فرمایا تھا، "الفقر فخری" یہی وہ فقر ہے جس پر اقبال نے حرف و صوت کے پردوں میں اس طرح زمزمہ سنجی کی ہے:۔

فقرِ قرآں احتساب ہست و بود | نے رباب و مستی و رقص و سرود
فقر مومن چیست تسخیر جہات | بندہ از تاثیرِ او مولا صفات
فقر کافر، خلوت دشت و دراست | فقر مومن لرزۂ بحر و بر است
زندگی آں را سکون غار و کوہ | زندگی ایں را ز مرگ با شکوہ
آں خودی را جستن از ترک بدن | ایں خودی را چوں چراغ افروختن
آں خودی را کشتن و واسوختن | ایں خودی را چوں چراغ افروختن
فقر چوں عریاں شود زیر سپہر | از نہیب او بلرزد ماہ و مہر
فقر عریاں گرمیٔ بدر و حنین | فقر عریاں بانگ تکبیر حسینؓ
فقر خیبر گیر با نان شعیر | بستۂ فتراک او سلطان و میر
فقر ذوق و شوق و تسلیم و رضاست | ما امینیم ایں متاع مصطفےؐ است
با سلاطیں در فتد مردِ فقیر | از شکوہ بوریا لرزد سریر
قلب او را قوت از جذب و سلوک | پیش سلطاں نعرۂ او لا ملوک

حکمت دیں دل نوازیہائے فقر
قوت دیں بے نیازیہائے فقر

دورِ تنزل و انحطاط | کوئی تحریک جب اپنے دورِ تنزل سے گذرتی ہے اور افراط و تفریط میں پڑ کر عمل و ردِ عمل کے اثرات سے مسخ ہو جاتی ہے تو برائیاں خوبیوں کی جگہ لے لیتی ہیں۔ پہلے جو باتیں عیب

شمار کی جاتی تھیں، وہ اب ہنر بن جاتی ہیں۔ فروعات کو اساسیات کا درجہ دیا جانے لگتا ہے۔ جتنی جو چیز حقیقت سے دور ہوتی ہے اس کو اتنی ہی سرگرمی کے ساتھ قبول کیا جاتا ہے، اور غیر ضروری امور پر شدت و تاکید کی جاتی ہے۔ یہی حال مختلف اسلامی علوم کا ہوا۔ فقہ اسلامی کو جب حیلہ بازیوں اور کام جوئیوں کا ذریعہ بنایا گیا، اور تقلید پرستیوں نے اجتہاد کے دروازوں پر قفل چڑھا کر متروک العہد پارینہ فرسودہ فیصلوں کو قانون و دستور کی صورت دے دی، تو مسلمانوں کی عملی زندگی جسد بے روح ہو کر رہ گئی۔ اسی طرح علم کلام میں جب تشکیک و شبہات کی گرم بازاری ہوئی تو عقائد متزلزل ہونا شروع ہوئے اور ایک عام ذہنی انتشار رونما ہوا۔ کچھ ایسی ہی صورتِ حال تصوف کو بھی پیش آئی۔ جب ظاہر و باطن اور شریعت و طریقت میں فرق و امتیاز کیا گیا تو دنیا پرستی سے گریز کو رہبانیت کی شکل دی گئی، اور مجاز پرستی، پیر پرستی اور قبر پرستی، نغمہ و سرود اور وجد و حال کو روحانی ترقی کے لئے لازمی گردانا گیا۔ توکل جس کا مطلب اسباب پر اعتماد نہ کرنا تھا، ترکِ اسباب سمجھا گیا، تفویض اور رضا بالقضاء کو جہولیت و بے دست و پائی کا رنگ دیا گیا۔

مسکینی و دل گیری و نومیدیِ جاوید — محکوم ہو سالک تو یہی اس کے مقامات

مختلف گمراہیوں کا علمِ تصوف آماجگاہ بن گیا، اور متعدد غیر اسلامی راہبانہ اور جوگیانہ طریقے رواج پذیر ہوئے دلق ہزار پیوند، تسبیح ہزار دانہ، خانقاہ نشینی و چلہ کشی، وجد و حال و قوالی، اور درگاہوں پر اعتکاف و مجاوری اصل مطلوب و مقصود بن گئی

تو تا کے گورِ مرداں را پرستی — بگردِ کارِ مرداں گرد درستی

تصوف کا ابتدائی زینہ علم تھا، درمیانی درجہ عمل، اور انتہائی مرتبہ موہبت من اللہ۔ اس کی ابتدائی و درمیانی حالتیں اکتسابی تھیں، اور آخری مرتبہ وہبی تھا۔ سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ جو کسی چیز کے لئے جدوجہد کرتا ہے تو اس کی کوششوں کا صلہ ضرور ملتا ہے۔

بجستجوئے نیابد کسے مراد ولے — کسے مراد بیابد کہ جستجو دارد

جو کسی کی راہ میں اپنا سب کچھ تج دے کر سعیِ پیہم کرتا رہتا، اور کسی کے دیدار کے لئے سرگرداں

رہتا ہے، تو وہ ضرور کسی نہ کسی وقت لطفِ دید سے شادکام ہوتا ہے

گر نشینی بر سرِ کوئے کسے عاقبت بینی تو ہم روئے کسے

لیکن دورِ تنزل میں علم و عمل سے بیگانہ ہو کر اس موہبت کو بھی ایک میراث سمجھا گیا اور خلافت و سجادگی نے ایک رسمی اور موروثی نوعیت اختیار کر کے عقابوں کے نشیمنوں کو زاغوں کے تصرف میں دے دیا۔ وسعتِ افلاک میں جن مردانِ خود آگاہ کی تکبیریں گونجتی تھیں ان کے مزاروں پر استخواں فروشی کرنے والوں نے آغوش خاک میں سر بزانو، خرقہ و عمامہ پہنے، ریش و کاکل چھوڑے ساری ریاکاریوں اور ظاہرداریوں کے ساتھ مصروف سبحہ خوانی، اور ساز و آواز کے میٹھے بولوں اور سریلے نغموں پر پائے کوب و دست افشاں اور وقف رامش گری تھے۔ ان کے اور ان کے اسلاف میں کرگس و شاہیں کا سا فرق تھا۔

پرواز ہے دونوں کی اسی ایک فضا میں کرگس کا جہاں اور ہے شاہیں کا جہاں اور

تسبیح و تہلیل میں یہ بھی رطب اللسان اور ان کے پیشروؤں کے کام و دہن بھی ان ہی اذکار سے لذت گیر تھے، مگر دونوں میں فرقِ زمین و آسمان کا۔

یا وسعت افلاک میں تکبیر مسلسل یا خاک کی آغوش میں تسبیح و مناجات

وہ مذہب مردانِ خود آگاہ و خدا مست یہ مذہب ملا و نباتات جمادات

مجاہدات، مراقبات و ریاضات محض ذرائع تھے حصول مقاصد کے، یہ خود مقصود بالذات نہ تھے جن مجاہدوں نے ان کے اسلاف کو تسخیر جہات اور جہانگیری کے گر سکھائے تھے ان میں سے ان نام نہاد پرستاران تصوف نے مسکینی و دل گیری کی تعلیم لینی شروع کی و در عروج میں جن چیزوں سے ترقی حاصل ہوئی تھی، زمانہ انحطاط میں شکست خوردہ ذہنیت، قنوطیت و یاسیت نے ان ہی سے ذل و مسکنت، گوسفندی و روباہی اور فلسفۂ میشی سیکھنا شروع کیا سحاب رحمت کی تراوش سے دنیا کا کون سا گوشہ خالی ہے، ایک ہی آب زلال سے باغ و چمن شاداب ہوتے ہیں اور صحرا و ریگ زار بھی، استعداد و صلاحیتوں کے تنوع سے کہیں لالہ و گل لہلہا اٹھتے اور کہیں

خس و خاشاک ابھر آتے ہیں

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست — در باغ لالہ روید و در شورہ بوم خس

وہی کتاب و سنت، اور وہی فقر و احسان، صرف نقطۂ نگاہ کے بدل جانے اور عملی صلاحیتوں سے تہی دامن ہونے نے یہ قلب ماہیت کر دی

ہر چہ گیرد علتی، علت شود — کفر گیرد کاملے، ملت شود

اقبال اگرچہ دلق و کلاہ، اور سرتراشی کی ظاہر داریاں نہ رکھتے تھے، مگر درویشی اور قلندری کے کوچوں سے خوب واقف تھے۔ راز درون خانہ کو کیا وا شگاف، اور دل کے روگوں کی کیسی صحیح نبض شناسی کی ہے۔

اک فقر سکھاتا ہے صیاد کو نخچیری — اک فقر سے کھلتے ہیں اسرار جہانگیری

اک فقر سے قوموں میں مسکینی و دلگیری — اک فقر سے مٹی میں خاصیت اکسیری

اک فقر ہے شبیری، اس فقر میں ہے میری — میراث مسلمانی، سرمایہ شبیری

زندگی کا جوش جب کسی قوم میں افسردہ و مردہ ہو جاتا ہے، تو وہ موت ہی کے آغوش میں پناہ ڈھونڈھتی ہے، چنانچہ گم گشتگان راہ طریقت نے درگاہوں اور مزاروں ہی کی آڑ پکڑی۔ جب تک حقیقی اسلامی تصوف کار فرما رہا، فقر و احسان کا میدان عمل حکومتوں کے پائے تخت تھے، لیکن جب قوائے عمل مضمحل ہو گئے تو تکیوں اور مرگھٹوں میں اس نے اپنا نشیمن بنایا اور خوئے گدائی و دریوزگی میں خود کو پختہ تر کر لیا۔

فقیراں تا بہ مسجد صف کشیدند — گریبان شہنشاہاں دریدند

چو آں آتش درون سینہ افسرد — مسلماناں بہ درگاہاں خزیدند

راہ توسط و اعتدال | شریعت اور اللہ کے مقرر کردہ حدود میں رہ کر جو کام بھی کیا جائے وہ مستحسن ہے صراط مستقیم یہی توسط و اعتدال کی راہ ہے۔ اس راہ سے ایک خفیف سا انحراف بھی گمراہی و ضلالت کی طرف لے جاتا ہے۔ یہی سبب ہے کہ حضور اقدس صحابہ کے عبادات میں بھی کسی قسم

کے توغل کو ناپسند فرماتے تھے۔ روایت ہے کہ چند صحابی ازواج مطہرات کے پاس آئے اور حضور کی عبادتوں کے متعلق دریافت کرنے لگے اور اپنی دانست میں ان کو کم سمجھ کر ایک نے کہا میں ہر وقت روزہ رکھوں گا دوسرے نے کہا میں اپنی زندگی کی تمام راتیں قیام و سجود میں گذار دوں گا۔ تیسرے نے کہا میں مدت العمر تجرد کی زندگی خود پر لازم کر لوں گا۔ اس موقع پر حضورؐ رونق افروز ہوتے، اور ان دعاوی کو سن کر یہ ارشاد ہوا کہ خدا کی قسم میں تم سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں میں روزہ بھی رکھتا ہوں اور افطار بھی کرتا ہوں، نمازیں بھی پڑھتا ہوں اور راتوں کو سوتا بھی ہوں، اور میں نے عورتوں سے نکاح بھی کئے ہیں، جو کوئی میری سنت سے ہٹا وہ مجھ سے نہیں ہے۔ حضرت سلمانؓ نے حضرت ابو درداء سے کہا، تمہارے رب کا تم پر حق ہے، تمہارے نفس کا تم پر حق ہے، اور تمہاری بیوی کا تم پر حق ہے، پس ہر ایک کا حق اس کے حق کے مطابق ادا کرو۔ جب یہ چیز حضورؐ کے علم میں لائی گئی تو آپ نے حضرت سلمانؓ کی توثیق فرمائی۔ اسلام ترکِ دنیا نہیں بلکہ دنیا کو دین بنانے کی تعلیم دیتا ہے۔ خواجہ نقشبندؒ کا ارشاد ہے، "اندک طاعت بر طریق سنت و عزیمت غلبہ کند بر بسیار بے کہ بر طریق بدعت و ضلالت باشد۔"

یک دستہ گل دماغ پرور   از خرمن صد گیاہ خوشتر

حدِ اعتدال سے کسی چیز کا تجاوز خواہ وہ کتنی ہی اچھی ہو، موجب مضرت ہے اسلام کے تمام اوامر و نواہی کا منشا افراد میں خصائل حمیدہ کا پیدا کرنا اور اس سے ایک صالح معاشرہ کو وجود بخشنا ہے۔ عبادات و مجاہدات کا حاصل بھی یہی ہے۔ اگر یہ اوصاف پیدا نہیں ہو رہے ہیں، تو ایسے تمام اعمال بے سود ہیں۔

گر موجب ہنگامہ نہ ہوں منبر و محراب   دیں، بندۂ مومن کے لئے موت ہے یا خواب

اسی اعتدال اور تجاوز عن الحد کا نتیجہ ہے کہ تصوف میں فقر و احسان نے رہبانیت و خانقاہیت کی صورت اختیار کر لی جو برگزیدہ ہستیاں کسی وقت دن کی روشنیوں میں فرسان اور رات کی تاریکیوں میں رہبان تھے، یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ انہی کے پیرؤں نے شب کی خلوتوں اور دن

کی جلوتوں میں سربزیری اور گوشہ گیری اختیار کرلی - ان میں پیر پرستی، مجاز پرستی، اور قبر پرستی وغیرہ جیسے امراض کی تولید ہوئی، اور ان کثرت پرستیوں کے سبب خانقاہیں بت کدے بن گئے جن کو دیکھ کر فیضی جیسا ملحد بھی پکار اٹھا۔

یارب زسیلِ میکدہ طوفاں رسیدہ باد — بت خانہ کہ خانقہش نام کردہ اند

یہ ساری گمراہی و بدبلوی کتاب و سنت سے دوری و مہجوری کا نتیجہ تھی

بہ مصطفےٰ برساں خویش راکہ دیں ہمہ اوست — اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی ست

شریعت و طریقت باہم متلازم ہیں تصوف کی موجودہ شکل یا ان غیر اسلامی طریقوں کو دیکھ کر ہم تصوف کی اصل و حقیقت سے انکار نہیں کر سکتے اگر استعداد و صلاحیتوں کے فقدان، اور کسی چیز کے بے اعتدالانہ استعمال سے کوئی خرابی واقع ہوئی ہو، تو اس سے اس چیز کی خوبی پر کیا حرف آسکتا ہے کیا اسلامی تعلیمات کو مسلمانوں کی موجودہ زبوں حالی کا سبب قرار دیا جا سکتا ہے، جیسا کہ بعض کوتاہ اندیشوں کا خیال ہے - جس جمود و بے حسی کا وہ اس وقت شکار ہیں، کیا یہ ان ترقی پسند تعلیمات سے پیدا ہو سکتی ہے، جس نے کسی وقت انھیں بام ترقی پر پہنچایا تھا اور ہر شعبۂ زندگی میں دنیا کی قیادت عطا کی تھی جب حقیقت اس کے خلاف ہے تو محض رہبانیت اور خانقاہیت کو دیکھ کر اس کے اسلامی الاصل ہونے سے انکار کرنا قرین انصاف نہیں شک و ریب سے منزہ ایک کتاب زندہ ہمارے پاس موجود ہے - یہ ایک ایسا معیار ہے، جس پر ہر چیز کی صداقت جانچی جا سکتی ہے خود اپنے آثار و اخبار کے متعلق بھی حضورؐ نے اسی محک صداقت کو پیش فرمایا ہے - ارشاد ہے:

اِذَا اَتَاكُمْ حَدِيْثٌ بِالْحَدِيْثِ فَهُوَ اِنْ كَانَ مُوَافِقًا بِالْقُرْاٰنِ فَاقْبَلُوْهُ وَاِلَّا فَرُدُّوْهُ

اگر کسی وقت تمہیں کوئی حدیث پہنچے اور وہ قرآن کے موافق ہو تو اسے قبول کرلو ورنہ اسے رد کردو۔

اس اسوۂ کاملہ کی پیروی میں جمیع اربابِ تصوف کا اس پر اجماع ہے

كُلُّ طَرِيْقَةٍ رَدَّتْهُ الشَّرِيْعَةُ فَهِيَ زَنْدَقَةٌ

یعنی ہر وہ چیز جس کو شریعت نے رد کردے، گمراہی ہے

اگر کوئی ایسی چیز جو خوش عقیدگی یا بد عقیدگی کے زیر اثر ان بزرگوں کی ذات سے منسوب کی جاتی ہے جو کتاب و سنت کے خلاف ہو تو اس کی تسلیم سے انکار کر دیا جائے، کیوں کہ ان برگزیدہ ہستیوں کی عظمت و بزرگی ایسی چیزوں کے قبول کرنے میں نہیں بلکہ رد کر دینے میں ہے۔

مرا بر مسند جم می نشانند ... الٰہی بر سر آں کو نشستم

شریعت و طریقت میں باہم کسی قسم کا تضاد و تخالف نہیں ہے بلکہ یہ دونوں ایک دوسرے کے متتابع ہیں اور بالفاظ شیخ سرہندی، "طریقت و حقیقت ہر دو خادمان شریعت اند" سید احمد رفاعی مرشد کے کاموں کی تعیین کے ساتھ مرید کو اس طرح ہدایت کرتے ہیں "شیخ آنست کہ ترا در راہ کتاب و سنت بیندازد، و از محدثات و بدعات دور نماید، شیخ آنست کہ ظاہرش و باطنش شرع باشد۔ طریقت عین شریعت است۔ اگر مردے را بینی در ہوا می پرد، اعتبارش مکن تا آں کہ اقوال و افعالش را بترازوئے شرع نسنجی۔ برائے حصول مراتب اعلیٰ بدامن پاک پیغمبر ذیشان تمسک نمائے، و شرع شریف را پیش چشم بگذار و شاہراہ اجماع برو۔ بخدا اعتصام کتاب و سنت کن، و غیر آں ہر چیز را بگذار، پیر زادوں اور مریدوں کو یہ وصیت کرتے ہیں، رزاق شیخ را حرم مگو رش را صنم، حالش را آلات گرفتن در سہم مساز، مردم آنست کہ شیخ بدان افتخار نماید نہ دے بشیخ۔ جو تعلق صورت کو معنی سے ظاہر کو باطن سے، اور قشر کو مغز سے ہے، وہی شریعت و طریقت میں باہمی نسبت ہے۔ جب بھی کتاب و سنت کو مضبوطی کے ساتھ تھام کر اس طریق پر چلا جائے گا تو دین و دنیا کی فوز و فلاح متیقن اور زندگی کی ہر راہ میں کامرانی و فیروزمندی یقینی ہو گی

بہ منزل کوش مانند مہ نو ... دریں نیلی فضا ہر دم فزوں شد
مقام خویش اگر خواہی دریں دیر ... بحق دل بند و راہ مصطفیٰ رو

اسلام کی نشاۃ جدیدہ اسلام میں حسب و نسب پر تفاخر اور دیگر مذاہب کے جیسی دین داروں اور دنیا داروں کی طبقاتی تقسیم نہیں ہے بلا کسی درمیانی وسیلہ کے دین کی فہم و تفہیم کا ہر ایک کے لئے دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اگر ایک حبشی نژاد بھی عالم دین ہو تو سینکڑوں عالی نسب قریشی اس

ئے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے میں کچھ عار نہ سمجھیں گے ۔ حضورؐ کی ایک حدیث ہے جس میں یہ بتلایا گیا ہے کہ میں تم میں دو چیزیں چھوڑے جاتا ہوں، ایک قرآن اور دوسرے میری عترت، اگر تم ان کو مضبوطی کے ساتھ تھامے رہو گے تو کبھی گمراہ نہ ہو گے یہاں عترت سے مراد نسل و خاندان کے افراد مراد نہیں بلکہ اس کا مفہوم اولاد روحانی اور سچے پیروان اسلام ہے، جو قرآن اور دیگر صحف سماوی کی عام تعبیرات سے ہے جب کبھی اسلام پر ابتلاء و آزمائش کے سخت ترین دور آئے تو اصحاب باصفا و ورثاء انبیاء روح اسلام کو برقرار رکھنے اور اصل دین کی حفاظت میں سدِ آہنی بن کر مقابلہ کے لئے کھڑے ہو گئے ۔ یورپین اہل فکر کو اس پر حیرت ہوتی ہے کہ باوجود اسلام پر بارہا سیاسی زوال آنے کے اسلام کا دینی زوال تو ایک طرف بلکہ ایسے وقتوں میں یہ بالعموم اپنے دورِ شباب کی رعنائیاں حاصل کرتا رہا ۔ بقول ہٹی (Hitti) اکثر ایسا ہوا کہ سیاسی اسلام کے تاریک ترین لمحات میں مذہبی اسلام نے بعض نہایت مہتم بالشان کامیابیاں حاصل کیں ۔ پروفیسر ایچ ۔ اے ۔ گب نے تو کھلے الفاظ میں اس کا اعتراف ہی کر لیا "تاریخ اسلام میں بارہا ایسے مواقع آئے ہیں کہ اسلام کے کلچر کا بڑی شدومد سے مقابلہ کیا گیا ہے لیکن بایں ہمہ وہ مغلوب نہ ہو سکا ۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ تصوف یا صوفیاء کا اندازِ فکر فوراً اس کی مدد کو آ جاتا تھا اور اس کو اتنی قوت اور توانائی بخش دیتا تھا کہ کوئی طاقت اس کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی" ہر دور میں ایسے افراد رہے ہیں جنہوں نے روح اسلام کو اپنا لیا ہو جن کا شمار اپنے عہد میں مصلحین و مجددین امت میں ہوتا رہا ہے، خواہ وہ دلق و کلاہ میں ملبوس ہوں یا کوٹ اور پتلون در بر کئے ہوئے ہوں ۔ کبھی یہ ابو حنیفہ بن کر آئے کبھی غزالی، ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، جمال الدین افغانی اور اقبال کی صورت میں جلوہ گر ہوئے ۔ اسلام ظاہر داریوں کو نہیں دیکھتا بلکہ قلب و ذہن کی کیفیتوں کا جائزہ لیتا ہے ۔ پرستاران اسلام کے آئندہ جو نمونے ہوں گے وہ غالباً اقبال جیسی شکل و صورت کے ہوں گے ۔

اقبال قبا پوش در کار جہاں کوش   دریاب کہ درویشی با دلق و کلاہے نیست

آثار و علائم بتلاتے ہیں کہ اسلام میں نیا انقلاب جو رونما ہوگا . . . .
اس میں پیش پیش یہی جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہوگا ملائیت اور مذہبی پیشوائیت اپنے دن دیکھ چکی۔ اسلام کا آنے والا دور اصل و روح کے اعتبار سے تو وہی ہوگا جو قرآن و سنت میں پایا جاتا ہے مگر اپنی تفصیلات و جزئیات میں قرونِ اولیٰ وازمنۂ متوسطہ کی ہوبہو نقل نہ ہوگا، کیوں کہ مقتضیاتِ زمانہ اور حالات کے تقاضے بالکل بدل چکے ہیں، مگر اس دور کی سعادتیں اور برکتیں بالکل خیر القرون جیسی ہوں گی۔ اس شاندار مستقبل کی پیشین گوئیاں خود قرآن و حدیث میں بھی موجود ہیں

سَنُرِیْهِمْ اٰیٰتِنَا فِی الْاٰفَاقِ وَفِیْۤ اَنْفُسِهِمْ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَهُمْ اَنَّهُ الْحَقُّ — عنقریب ہم ان کو نفس انسان کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنے نشانات دکھائیں گے

(یعنی ان کو نفسیات، طبعیات اور حیاتیات کے بعض حقائق سے آشنا کریں گے) حتیٰ کہ ان پر ثابت ہو جائے گا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے "هُوَ الَّذِیْۤ اَرْسَلَ رَسُوْلَهٗ بِالْهُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْهِرَهٗ عَلَی الدِّیْنِ كُلِّهٖ" اس دور کی درخشانی و آفاق گیری کا نقشہ حدیث میں ان الفاظ میں کھینچا گیا ہے

"خوش ہو جاؤ! خوش ہو جاؤ! بے شک میری امت کی مثال بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا بہتر ہے یا انتہا، یا اس باغ کی طرح ہے جس میں سے پہلے ایک فوج ایک سال تک خوراک حاصل کرتی رہی اور پھر ایک اور فوج ایک سال تک خوراک حاصل کرتی رہی۔ ممکن ہے کہ دوسری فوج وسعت میں تعداد میں اور عمدگی میں پہلی فوج سے بڑھ کر ہو"

نزول مسیح اور ظہور مہدی کی بابت اگرچہ روایات کا ایک زائد حصہ ضعیف ہے۔ مگر مہدی کی امامت اور مسیح کے اقتدار سے ایک اعتبار یہ پیدا ہوتا ہے کہ دنیائے عیسائیت اسلام کے پرچم تلے آکر مسلمانوں کے دوش بدوش اعلائے کلمۃ الحق کی خدمات انجام دے گی۔

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محو حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہو جائے گی

ڈاکٹر رفیع الدین نے اپنی حالیہ کتاب قرآن اور علم جدید میں موجودہ دور کے مقتضیات و اضطرابات کے پیش نظر ہونے والے واقعات کی پیش قیاسی نہایت مدلل الفاظ میں کی ہے۔ "اہل امریکہ کچھ عرصہ

سے بے تاب جستجو کر رہے ہیں کہ اشتراکیت کا ایک علمی جواب مہیا کیا جائے، امریکن ازم میں صلاحیت نہیں کہ اشتراکیت کا کامیاب اور معقول رد کر سکے۔ اشتراکیت کا علمی جواب صرف مسلمانوں کے پاس ہے۔ قرآن کے خلاف باطل تصورات کی رزم آرائی درحقیقت ایک عارضی ہنگامہ ہے، جس کے دامن میں خدا کی بے پایاں رحمت پوشیدہ ہے۔ یقینی بات ہے کہ اسلام کی نشأۃ جدیدہ کے ہراول دستے اسی کے گرد وغبار سے نمودار ہوں گے۔ مغرب کے فلسفہ نے اسلام کو چیلنج دے کر اسے ایک نئی قوت کے ساتھ میدان میں اترنے کے لئے مہیا کر دیا ہے جیسا کہ ٹائن بی (Toynbee) کہتا ہے کہ ہر نئی تہذیب ایک چیلنج کا نتیجہ ہوتی ہے اسلام کی نئی زندگی حکمتِ مغرب کا نتیجہ ہوگی اس چیلنج کے جواب میں اب اسلام ایک نئے دور میں داخل ہو رہا ہے، اس کے جمود کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور اس کے حق میں ایک ایسا ذہنی انقلاب رونما ہونے والا ہے جو اسے آخر کار زمین کے انتہائی کناروں تک پھیلا دے گا۔ بطور جملہ معترضہ یہ چند چیزیں نوک قلم پر آگئیں جن کا اظہار تبرعاً کر دیا گیا اگرچہ یہ موضوع سے قدرے ہٹی ہوئی ضرور ہیں مگر نفع سے خالی نہیں پھر ہم اپنے اصل موضوع کی طرف عود کرتے ہیں۔

تتمۂ بیان تصوف کی بابت درسگاہی قیل وقال عبث ہے۔ یہ از سر تا پا عمل کی تعلیم دیتا ہے یہ گفتار کا غازی نہیں بلکہ کردار کا غازی بنانا چاہتا ہے ہمیں جو کام کرنا ہے وہ یہ ہے کہ روحانی امراض کے جو نسخے ان طبیبوں نے مختلف بیماریوں کے تجویز کئے ہیں ان کو آزمایا جائے اور دیکھا جائے کہ کہاں تک یہ ازالۂ مرض اور شفایابی میں کارگر ہو سکتے ہیں۔

یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ تصوف اسلام ہی کا شجرِ طیبہ ہے، جس کی جڑیں ارض حرم میں ثابت ومحکم اور شاخیں فضائے سماوی میں پھیلی ہوئی ہیں۔ اس کی تنصیب ذاتِ رسالت کے مبارک ہاتھوں سے ہوئی، اور آبیاری صحابہ نے کی تابعین، تبع تابعین اور اولیائے کرام نے مختلف زمانوں میں اپنے انتھک مجاہدات سے اس کو پروان چڑھایا۔ گاہے بگاہے قومی تقاضوں اور گرد وپیش کے حالات کے تحت اس پر عملِ تعلیم بھی ہوتا رہا لیکن خذ ما صفا کے اصول کے پیش

نظر صرف وہی چیزیں لی گئیں جو حصولِ مقصد میں ممد و معاون تھیں جن کا درجہ اساسات کا نہیں فروعات و لاحقات کا رہا جو عارضی و موقتی ہوتے ہیں۔ اقبال نے سید سلیمان ندوی کے نام اپنے ایک مکتوب میں اجزائے تصوف کے رد و قبول کی بابت ایک نہایت صحیح معیار قایم کیا ہے۔

"تصوف سے اگر اخلاص فی العمل مراد ہے (اور یہی مفہوم قرونِ اولیٰ میں اس سے لیا جاتا تھا) تو کسی مسلمان کو اس پر اعتراض نہیں ہو سکتا ہاں جب تصوف فلسفہ بننے کی کوشش کرتا ہے اور عجمی اثرات کی وجہ سے نظامِ عالم کے حقائق اور باری تعالیٰ کی ذات کے متعلق موشگافیاں کر کے کشفی نظریے پیش کرتا ہے، تو میری روح اس سے بغاوت کرتی ہے۔" شاہ صاحب نے بھی اپنی کتاب ہمعات میں بڑی حکیمانہ بات کہی ہے، "اربابِ تصوف پر بحث کرتے وقت ہمیشہ اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ ان بزرگوں کے ہر طبقہ کے اقوال و احوال کو ان کے زمانے کے ذوق کے مطابق جانچا جائے اس سلسلہ میں یہ کسی طرح مناسب نہیں کہ ہم ایک عہد کے اربابِ تصوف کے اقوال و احوال کو دوسرے عہد کے معیاروں سے ناپتے پھریں" اپنے وصیت نامہ میں شاہ صاحب نے ایک اور انوکھی چیز بیان فرمائی ہے" انسانی فطرت کی طلب مبدا رفیاض سے ایک ایسی چیز کی تھی جو اس کی نجات کا راستہ دکھاتے، یہ وہی شریعت اور اس کے احکام ہیں۔ خلاصہ یہ کہ احکامِ شریعت تمام افراد نوع انسانی پر اسی طرح لازم ہیں جس طرح صورتِ نوعیہ تمام افراد انسانی میں پائی جاتی ہے کسی کی خصوصیت نہیں۔ نہ اس سے کوئی مستثنیٰ ہو سکتا ہے۔ البتہ فنا و بقا، استہلاک و انسلاخ افرادِ انسانی کی فطری خصوصیات کے لحاظ سے مقصود ہیں نہ کہ عام افرادِ انسانی کے لئے کیونکہ تمام انسان روحانیت اور تجرد کی اعلیٰ قابلیت پر پیدا نہیں ہوتے خداوند تعالیٰ ان کو فطری راہ سے ہدایت فرماتا ہے۔"

مگر یہ احکامِ الٰہی نہیں ہیں بلکہ شخصی فطرت کی طلب کا انصرام ہے، شارع کا کلام ہرگز اس مقصد کے لئے نہیں ہے صراحتاً نہ اشارتاً البتہ شارعؑ کے کلام سے ایک خاص جماعت نے اس کو سمجھا ہے جس طرح کوئی شخص لیلیٰ مجنوں کے کوائف سنے اور اس کی زندگی پر یہ حالات منطبق ہونے لگیں۔ اس کو اعتبار کہتے ہیں۔"

خلاصہ یہ کہ انسلاخ و استہلاک کے ذریعوں میں ہر کس و ناکس کا منہمک اور مشغول ہو جانا ملتِ مصطفویہ کے لئے نہایت دردناک ہے، خدائے تعالیٰ فضل کرے اس شخص پر جو شاہراہِ عام سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے کیونکہ یہ انسانوں کی خاص فطرت ہی کے لحاظ سے درست ہے:

"اگرچہ اس زمانہ کے بہت سے صوفیا کو میرا یہ کلام سخت ناگوار گذرے گا، لیکن مجھ کو زید و عمرو سے کچھ واسطہ نہیں مجھ کو جس چیز کا حکم دیا گیا ہے اسی کے موافق کہتا ہوں"

اس سے یہ معلوم ہوا کہ ہر شخص کو جنید و شبلی بننے کی ضرورت نہیں حسب استعداد و ذوق جو جتنا چاہے حاصل کر سکتا ہے عام افراد ملت کے لئے صرف نیت کے اخلاص کے ساتھ احکامِ شریعت کی بجا آوری بھی سب سے بڑا مجاہدہ ہے۔

نہ در بندِ فقیری شو، نہ میلِ دولتے کن سفر در پیش داری، ساعتے بنشیں رحلے کن

ختم کلام پر اکبر الہ آبادی کا تصوف کی بابت ایک قطعہ پیش کیا جاتا ہے تاکہ آداب و تمکین کی سنجیدگیوں کو تفنن و خوش طبعی کی شگفتگیوں سے بدلا جائے اور ہم ہنستے ہوئے چہروں اور مسکراتے ہوئے لبوں کے ساتھ ایک دوسرے سے جدا ہوں۔ دیکھئے حقیقت و ظرافت کو کس کمالِ فن کے ساتھ بہم آمیز کیا گیا ہے

شریعت درِ محفلِ مصطفیٰ طریقت عروجِ دلِ مصطفیٰ

عبادت سے عزت شریعت میں ہے محبت کی لذت طریقت میں ہے

شریعت میں ہے صورتِ فتحِ بدر طریقت میں ہے معنیِ شقِ صدر

شریعت میں ہے قیل و قالِ حبیب طریقت میں حسن و جمالِ حبیب

نبوت کے اندر ہیں دونوں ہی رنگ

عبث ہے یہ صوفی و ملا کی جنگ

واخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین وصلی اللہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ محمد و آلہ و اصحابہ اجمعین۔

"کتابیات"
(مآخذ و اسناد)

اس مضمون کی تیاری میں مفصلۂ ذیل کتابوں سے استفادہ کیا گیا:-

۱- کشف المحجوب شیخ علی الہجویریؒ۔
۲- تفسیر مولانا یعقوب چرخیؒ۔
۳- سبع سنابل مولانا عبد الاحد بلگرامیؒ۔
۴- سیر الاولیاء۔
۵- فوائد الفواد۔
۶- مکتوبات امام ربانی۔
۷- معمولات مظہریہ۔
۸- کلمات طیبات۔
۹- ارشاد الطالبین قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ
۱۰- اخبار الاخیار شیخ عبد الحق محدث دہلویؒ
۱۱- ریاض المرتاض نواب صدیق حسن خاں
۱۲- افاضاتِ یومیہ و مواعظ اشرفیہ، مولانا اشرف علی تھانویؒ
۱۳- القول الجمیل شاہ ولی اللہ دہلوی
۱۴- ہمعات " " "
۱۵- تجدید تصوف و سلوک عبد الباری ندوی
۱۶- تصوف اسلام عبد الماجد دریا بادی
۱۷- ترجمان القرآن، غبار خاطر، حالات سرمد،
۱۸- تاریخ مشائخ چشت خلیق احمد نظامی
۱۹- بزم صوفیہ صباح الدین عبد الرحمٰن
۲۰- تفہیم القرآن ابو الاعلیٰ مودودی
۲۱- قرآن اور علم جدید ڈاکٹر رفیع الدین

عثمانؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

از
ڈاکٹر طہٰ حسین

مترجم
(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

(۳)

اس سوال کا جواب دینے کے لئے ہمیں سب سے پہلے یہ بات صاف کر لینی چاہیئے کہ اُس حاکمانہ نظام کی حقیقت کیا ہے جو ہجرت کے وقت سے لے کر حضرت عمرؓ کی شہادت اور حضرت عثمانؓ کی خلافت تک قایم ہو چکا تھا بعض وہ لوگ جنہیں معاملات کی ظاہری سطح مبتلائے فریب بنا سکتی ہے خیال کرتے ہیں کہ یہ حکومت یا زیادہ گہری تعبیر میں اس مختصر سے عہد کا نظام حکومت الٰہی تھا جس کی بنیاد سر سے پاؤں تک دین پر تھی اب دین کا مفہوم اس خاص ماحول میں چوں کہ آسمان سے نازل شدہ ایک حقیقت ہے اس لئے اس خیال کے حامی اس کا یقین رکھتے ہیں کہ اس عہد میں جس حکومت نے مسلمانوں کا نظم سنبھالا اس کی قوت کا مدار اور سلطانی خدا اور صرف خدا کی امداد غیبی تھی، لوگوں کا اس میں کچھ عمل دخل نہ تھا، نہ وہ اس میں شرکت کر سکتے تھے، نہ اس پر معترض ہو سکتے تھے اور نہ وہ اس سے انکار کے مجاز تھے اس خیال کے لوگ محسوس کرتے ہوں گے کہ ان کے حق میں یہ ایک سچی اور کھلی ہوئی دلیل ہے کہ خود نبی کریم صلعم نے اللہ جل شانہ کے حکم سے اس حکومت کی بنیاد رکھی اسی نے آپ کو مدینہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور مکہ کے مسلمانوں کو آپ کا ساتھ دینے کی ہدایت کی پھر خدا ہی نے نبی کریم صلعم پر حکومت کے مجمل اور مفصل احکام وحی کیے، سورہ نجم میں اسی کا ارشاد ہے کہ

مَا ضَلَّ صَاحِبُكُمْ وَمَا غَوٰى وَمَا يَنْطِقُ عَنِ الْهَوٰى إِنْ هُوَ إِلَّا وَحْيٌ يُّوْحٰى

تمہارا ساتھی راہ سے بھٹکا نہیں وہ اپنی خواہش سے کچھ نہیں کہتا - وہ جو کچھ پیش کرتا ہے وحی الہی ہے -

اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا کہ اس کی اور رسول کی فرمانبرداری کریں اس نے کھلے طور پر اعلان کر دیا کہ مسلمان ایماندار اس وقت ہو سکتے ہیں جب وہ اپنے اختلافی معاملات میں نبی کریم صلعم کو حکم بنائیں ان کے لئے اس دلیل میں اس سے بھی قوت پہنچ سکتی ہے کہ حضرت ابو بکرؓ رسول اللہ صلعم کے خلیفہ تھے اور حضرت عمرؓ حضرت ابو بکرؓ کے پس مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کو حضرت نے حکم دیا اور خود حضرت نے اللہ سے حکم پایا، ان وجوہ کی بنا پر اس عہد کا نظام حکومت بالکل الہی نظام تھا، بلا شبہ اس خیال سے زیادہ کوئی خیال غلط نہیں ہو سکتا اس لئے کہ اسلام کی حیثیت بہر حال ایک دین کی ہے جس نے اپنے ان احکام اور حدود میں جن کا تعلق سب سے پہلے خدا کی توحید اور پھر نبوت کی تصدیق اور اس کے بعد نیک اور صالح زندگی سے ہے عام انسانوں کو ان کی دنیاوی اور اُخروی فلاح کی طرف متوجہ کیا لیکن اس نے ان کی آزادی نہیں چھینی، ان کا پورا پورا مالک و مختار نہیں بنا، اور نہ ان کے ارادوں کو معطل کیا، اس نے تو مقررہ حدود میں انھیں مختار بنایا کل مستحبات اور تمام مکروہات گنائے البتہ عقل اور دل کی قوت سائنے کر دی کہ غور و فکر کریں اور اس بات کی اجازت دی کہ بھلائی اور سچائی، رفاہِ عام اور مصالح خاص میں اپنے بس بھر حصہ لیں -

۲ - خدا نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ وہ معاملات میں مسلمانوں سے مشورہ کرے اگر حکم کا تعلق آسمان ہی سے ہوتا تو نبی خدا کے حکم کے مطابق ہر بات کی تکمیل بلا کسی کے مشورہ کے کر لیتا حالانکہ ارشادِ خداوندی ہے

وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيْظَ الْقَلْبِ لَانْفَضُّوْا مِنْ حَوْلِكَ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ

اور اگر تو تندخو اور سخت دل ہوتا تو متفرق ہو جاتے تیرے پاس سے سو توان کو معاف کر اور ان کے واسطے بخشش مانگ اور ان سے مشورہ لے کام میں

اور پھر احد کے ابتلا کے بعد اس آیت کے نزول سے قبل نبی کریم صلعم نے غزوہ بدر میں اپنے صحابہ کا مشورہ قبول کیا تھا جب آپ ان کو ایک مقام پر ٹھہرانا چاہتے تھے اور بعضوں نے دریافت کیا کہ اس مقام کا انتخاب تدبیر اور مصلحت کے ماتحت ہے یا اس کے لئے خدا کا حکم ہے تو آپ نے جواب دیا خدا کا حکم نہیں، تدبیر و مصلحت کی بنا پر ہے تو پھر آپ کو مشورہ دیا گیا کہ یہ مقام جنگی مصالح کے مناسب نہیں ہے اس لئے مسلمانوں کو یہاں سے ہٹا کر پانی سے قریب کسی جگہ جمنے کا حکم دیا جائے، پھر واقعہ بدر کے بعد قیدیوں کے سلسلے میں آپ نے صحابہ کا مشورہ قبول کیا جس سے متعلق عتاب آمیز آیت نازل ہوئی اور فرمایا گیا کہ

مَا کَانَ لِنَبِیٍّ اَنْ یَّکُوْنَ لَہٗ اَسْرٰی حَتّٰی یُثْخِنَ فِی الْاَرْضِ تُرِیْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْیَا وَاللّٰہُ یُرِیْدُ الْاٰخِرَۃَ

نبی کو نہیں چاہیے کہ اپنے ہاں قیدیوں کو رکھے جب تک خوب خوں ریزی نہ کرلے

احد کے موقع پر جب نبی کریم صلعم کو قریش کے آنے کی اطلاع ہوئی تو آپ نے خیال کیا کہ مدینے ہی میں قیام کریں اور باہر نکل کر ان سے مقابلہ نہ کریں ہاں اگر وہ مدینہ پر حملہ آور ہوں تو پھر مدافعت کریں لیکن صحابہ اور خصوصاً انصار نے آپ پر زور ڈالا کہ دشمن سے مقابلہ کے لئے نکلنا ضروری ہے چنانچہ آپ نے ان کی بات مان لی اور مقابلے کی تیاری فرمانے لگے مسلمانوں نے اس عرصہ میں ندامت سی محسوس کی کہ انھوں نے رسول اللہ صلعم کو ان کی مرضی کے خلاف مجبور کیا چنانچہ انھوں نے آپ کے مسلح آتے دیکھ کر معذرت کی اور اس بات کی اجازت چاہی کہ حضرت ہی کی رائے پر عمل کیا جائے لیکن آپ نے اس سے انکار کیا اور جو مشورہ منظور کر لیا تھا اسی پر اڑے رہے اگر الٰہی نظام ہوتا اور ہر کام کے لئے آسمان سے حکم کا نزول ضروری ہوتا تو مسلمان رسول اللہ صلعم کو مجبور نہیں کر سکتے تھے، اور خود رسول اللہ ان کا مشورہ قبول نہیں فرماتے، خواہ حالات کی نزاکت کا تقاضا کچھ ہی ہوتا، غزوہ احزاب کے موقع پر آپ نے صحابہ کے مشورے اور ان کی رائے پر اعتماد کر کے خندق کھودنے کا آغاز خود کیا۔

یہ اور اسی طرح بہت سے دوسرے مواقع پر نبی کریم صلعم نے صحابہ سے مشورہ کیا اور ان کی رائے پوری رضامندی کے ساتھ قبول فرمائی، حدیبیہ کا موقع تھا قریش چاہتے تھے کہ اس سال زیارت بیت الحرام کے بغیر آپ واپس ہو جائیں، قریش کی اس خواہش سے صحابہ کسی طرح متفق نہ تھے، آپ نے اس سلسلے میں جب ان سے مشورہ چاہا تو سبھوں نے مخالفت کی بعضوں نے حد درجہ اصرار کیا حضرت عمرؓ نے تو یہاں تک کہہ دیا

لم نعطی الدنیۃ فی دیننا — اپنے مذہب کے معاملہ میں ہم اتنا نیچے کیوں اتریں

اب تو چہرۂ انور پر غصے کے آثار نمودار ہو گئے اور فرمایا میں اللہ کا رسول اور اس کا بندہ ہوں مسلمانوں نے محسوس کیا کہ معاملہ مشورہ اور گفت و شنید کا نہیں شاید آسمان سے وحی نازل ہو چکی ہے چنانچہ سبھوں نے خدا سے توبہ اور نبی سے معذرت کی اور اللہ نے اِنَّا فَتَحْنَا لَكَ فَتْحًا مُّبِينًا آخری آیت تک نازل کی،

اگر ہم ان تمام مواقع کی تفصیل پر متوجہ ہوں تو بات ہماری ضرورت سے بہت زیادہ لمبی ہو جائے گی، پھر جو تھوڑے سے واقعات پیش کئے گئے وہ اس بات کے ثبوت کے لئے کافی ہیں کہ عہد نبوی میں احکام کا نزول پوری تفصیل کے ساتھ نہیں ہوتا تھا، وحیِ خداوندی آتی تھی اور رسول اور اصحاب رسول کو عام اور خاص مصالح کی طرف متوجہ کر دیتی تھی بلا اس کے کہ ان کی اس آزادی کی راہ میں حائل ہو جو انہیں حق دیتی ہے کہ سچائی، بھلائی اور انصاف کے حدود کے اندر اپنے معاملات کے لئے اپنی مرضی کے مطابق تدبیریں کریں اور شاید ہمارے اس خیال کی سب سے زیادہ قطعی اور سچی دلیل یہ ہو گی کہ قرآن کریم نے سیاسی امور کی مجمل یا مفصل کوئی تنظیم نہیں پیش کی اس نے صرف "عدل" "احسان" اور رشتہ داروں کی خبر گیری کرنے "فحشاء" "منکر" اور "بغی" سے بچنے کی تاکید کی، اور اس کے لئے عام حدود مقرر کر دیئے، اور پھر مسلمانوں کو آزاد چھوڑ دیا کہ وہ ان حدود کے اندر رہ کر اپنی مرضی کے مطابق انتظامات کریں، خود نبی کریم .... اپنی سنت میں حکومت یا سیاست کے لئے کسی مقررہ نظم کا نقشہ نہیں بنا گئے، بیماری شدید ہو جانے پر بھی آپ نے مسلمانوں کے لئے

اپنے صحابہ میں سے کسی کو اپنا خلیفہ کسی دستاویز کے ذریعے مقرر نہیں فرمایا ہاں آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو نماز پڑھانے کا حکم دیا، پھر مسلمانوں نے خیال کیا کہ صدیق اکبر کو رسول اللہ صلعم نے ہمارے دین کے لئے پسند فرمایا تو کیا مضائقہ ہے کہ ہم انہیں اپنی دنیا کے لئے بھی پسند کرلیں؟ اگر مسلمانوں کے لئے کوئی سیاسی آسمانی نظام ہوتا تو یقیناً قرآن مجید میں اس کی شکل بتائی جاتی اور بلاشبہ نبی کریم صلعم اس کے حدود اور اصول بیان فرماتے اور بلا کسی بحث وحجت کے مسلمانوں کے لئے اس پر ایمان لانا فرض کیا جاتا۔

پھر دوسری ایک بات جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت کا نظام عہد نبوی میں اور آپ کے دونوں خلفا کے زمانے میں آسمانی نہ تھا بیعت کا سلسلہ ہے جس کا اجرا خود نبی کریم نے اپنے عہد سے کیا، سب لوگ جانتے ہیں کہ بدر کے موقع پر صحابہ کو نبی کریم صلعم نے کھلے طور حکم نہیں دیا تھا ہاں آپ نے تحریک کی تھی اور رغبت دلائی تھی اور اللہ کی طرف سے دو میں سے ایک نیکی کا وعدہ کیا تھا، اور انصار سے اس بات پر معاملہ طے ہوا تھا کہ آپ ان کو جہاد میں نہیں لے جائیں گے ہاں اگر آپ پر کوئی افتاد آپڑے تو وہ مدافعت میں حصہ لیں گے ان حالات میں جب غزوۂ بدر کا موقع آیا تو آپ نے صحابہ سے مشورہ لیا اور منتظر رہے کہ صحابہ اپنے خیالات پیش کریں گے، بہر حال میدان جنگ میں آپ، ان لوگوں کو لے کر اس وقت تک نہیں گئے جب تک انصار کے سرداروں نے یہ نہیں کہہ دیا "اگر آپ اس دریا میں بھی ہمیں لے چلتے تو ہم یقیناً آپ کے ساتھ ہوتے"، اس طرح آپ پر واضح ہوگیا کہ وہ جہاد کے لئے راضی تھے، لوگ یہ بھی جانتے ہیں کہ آپ نے صحابہ کو قریش سے لڑنے کا حکم نہیں دیا تھا جب حدیبیہ کے دن آپ کو معلوم ہوگیا کہ قریش نے حضرت عثمان کے ساتھ دغابازی کی، بلکہ آپ نے متوجہ کیا تھا جس پر لوگوں نے جان تک کی بازی لگادینے کی بیعت کی اس وقت اگر کوئی بیعت نہیں کرتا تو اس کے لئے گنجائش تھی لیکن بلا استثنا سبھوں نے بیعت کی کیونکہ وہ رسول پر اور رسول بھیجنے والے خدا پر ایمان رکھتے تھے اور اس کی پکار کا جواب دینے کے لئے تیار تھے اسی بیعت کے متعلق سورۂ فتح میں خدا نے آیت نازل فرمائی

إِنَّ الَّذِينَ يُبَايِعُونَكَ إِنَّمَا يُبَايِعُونَ اللَّهَ يَدُ اللَّهِ فَوْقَ أَيْدِيهِمْ

کہ جو لوگ آپ کے ہاتھ پر بیعت کر رہے ہیں وہ درحقیقت اللہ سے بیعت کر رہے ہیں ان کے ہاتھ پر خدا کا ہاتھ ہے،

اور پھر قرآن مجید میں بہت سی آیتیں ہیں جن میں مسلمانوں کو جہاد کے لئے دعوت اور رغبت دلائی گئی ہے ان میں ان لوگوں کا بھی ذکر ہے جو اس فرض کی ادائیگی میں بچھڑ گئے اور خدا اور اس کے رسول نے انہیں معذور سمجھا اور ان لوگوں کا بھی جن کا عذر نہیں سنا گیا لیکن ان میں کسی کو نبی نے خود کوئی سزا نہیں دی بلکہ معاملہ خدا پر چھوڑ دیا چاہے معاف کرے چاہے سزا دے۔

پھر یہ بات بھی اہمیت سے خالی نہیں کہ خلافت کی بنیاد بیعت پر قائم ہے یعنی عوام کی مرضی پر، اس کے معنی یہ ہیں کہ خلافت حاکم اور محکوم کے درمیان ایک معاہدہ ہے جو ایک طرف خلفا کو اس بات کا ذمہ دار بناتا ہے کہ وہ مسلمانوں پر حق اور انصاف کی حکومت کریں گے ان کے مصالح کی رعایت رکھیں گے اور ان کے معاملات میں بس بھر رسول اللہ صلعم کی سیرت پر عمل کریں گے اور دوسری طرف مسلمانوں کو ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ وہ خلیفہ کی اطاعت کریں اور اس کے لئے نصیحت اور نصرت کا باعث ہوں۔

واقعہ یہ ہے کہ مسلمانوں کے کسی خلیفہ کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنی سلطانی اور حکمرانی اپنی طرف سے فرض کر دے تاآنکہ وہ مسلمانوں سے قول و قرار نہ کرے اور ان سے عہد نہ لے اور اس طرح ایک مشترک معاہدے کی روشنی میں حکومت کرے یہی وجہ ہے کہ اقتدار اور سلطانی نبی کریم کی وراثت میں دخیل نہیں ہو سکی، اور آپ نے اہل بیت کو اس کا وارث نہیں بنایا، اور خود ابو بکر کو بھی یہ منصب جماعت کی سپردگی، بیعت اور اعتماد کے بغیر نہیں ملا، پھر ابو بکر نے اپنی اولاد کو اور عمر بن خطاب نے اپنے بیٹوں کو وارث نہیں بنایا حضرت عمر کی خلافت عام مسلمانوں کے مشورے کی بنیاد پر ہے اس لئے کہ جب تک صدیق اکبر کی رائے کو ایک قابل قبول مشورہ جان کر عوام نے اپنی رضامندی اور بیعت کا اعلان نہیں کر دیا حضرت عمر خلیفہ نہیں بن سکے، اور اس لئے کہ حضرت عثمان، صدیق

اکبر کی رحلت سے پہلے ان کا مہر کردہ لفافہ لے کر مسلمانوں تک پہنچے اور ان سے دریافت کیا کہ کیا وہ اس لفافے میں لکھے ہوئے شخص کے ہاتھ پر بیعت کریں گے، لوگوں نے جواب دیا ہاں، کیونکہ ان کو حضرت ابو بکرؓ پر اعتماد تھا اور وہ آپ کو اپنا سچا خیر خواہ اور مخلص درد مند یقین کرتے تھے حضرت عمرؓ کا کوئی لڑکا خلافت کا وارث نہیں ہو سکا، آپ نے ہر گز گوارا نہیں کیا کہ آپ کے بعد آپ کا کوئی لڑکا خلیفہ ہو ہاں آپ نے اپنے بیٹے عبداللہ کو مجلس شوریٰ میں شرکت کی اجازت ضرور دی لیکن اس شرط پر کہ وہ بحث میں کوئی حصہ نہ لیں اور یہی وجہ تھی کہ معاویہ کے عہد میں جب اقتدار میں وراثت کا پیوند لگ گیا تو عام مسلمانوں نے اپنی بے زاری کا اظہار کیا اور کہنے والوں نے کہہ دیا کہ "معاویہ خلافت کو ہرقل اور کسریٰ کی چیز بنا رہے ہیں" پس ان تمام باتوں سے اگر کچھ نتیجہ نکلتا ہے تو وہ یہی کہ عہدِ نبوی میں جو نظامِ حکومت تھا وہ کوئی الٰہی نظام نہ تھا جس میں لوگوں کی رائے اور مشورے کو کچھ دخل نہ ہو، پھر جب عہدِ نبوی میں یہ بات نہ تھی جب کہ وحی کا سلسلہ جاری تھا تو پھر اس سلسلے کے ٹوٹ جانے کے بعد صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ کے دور میں تو اس کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

جو لوگ اس نظام کو الٰہی نظام تصور کرتے ہیں وہ حقیقت میں ان الفاظ و کلمات سے دھوکا کھاتے ہیں جو وہ خلفاء کے خطبات میں پڑھتے ہیں نیز ان روایات سے جو خلفاء کے بارے میں عام طور پر مشہور ہیں اور جن میں اللہ کا ذکر، اللہ کا حکم اور اس کی سلطانی اور اطاعت کا تذکرہ ہے یہ لوگ خیال کرتے ہیں کہ یہ الفاظ اور یہ روایات اس امر کا ثبوت ہیں کہ نظامِ حکومت آسمانی تھا حالانکہ ان میں صرف ایک بات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے جو بالکل عام لیکن ساتھ ہی بڑی اہم ہے اور وہ یہ کہ خلافت خلفاء اور عام مسلمانوں کے مابین ایک معاہدہ ہے اور اللہ نے مسلمانوں کو حکم دیا ہے کہ جب وہ معاہدہ کر لیں تو اس کو پورا کریں خواہ اس معاہدے کا تعلق حکومت کے معاملات سے ہو یا خارجی تعلقات سے یا چند اشخاص کے درمیان کسی عہد و پیمان سے، بہر حال اللہ قول و قرار کی پاسداری کا حکم دیتا ہے اور وہ انسانوں کے دلوں کا شاہد ہے کہ وہ وفا

کرتے ہیں یا غداری، وہ وفاداری پر ثواب اور غداری پر شدید عذاب دے گا۔

پس اس نقطۂ نظر سے اسلام اور مسیحیت میں کوئی فرق نہیں ہے، اسلام بھلائی پھیلانا اور برائی روکنا چاہتا ہے اور چاہتا ہے کہ عوام کی زندگی عدل وانصاف کی بنیاد پر قائم اور ہر قسم کی زیادتی سے خالی ہو، اسلام ان حدود کے قیام کے بعد عوام کو آزادی دیتا ہے کہ وہ اپنے معاملات کی تنظیم اپنی مرضی کے مطابق کریں، مسیحیت بھی اس سے زیادہ کچھ نہیں چاہتی، حضرت مسیح نے کسی موقع پر بنی اسرائیل کے بعض معترضین سے کہا "قیصر کا حق قیصر کو اور اللہ کا حق اللہ کو دو" میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت عیسیٰ کا منشا اس سے یہ ہرگز نہیں تھا کہ قیصر کا حق انصاف اور صداقت کو پامال کر کے دیا جائے، یا یہ کہ قیصر اور عوام کے تعلقات کی بنیاد ظلم اور خوف پر رکھی جائے۔

اسی کتاب میں کسی دوسری جگہ آپ پڑھیں گے کہ عہد عثمانی میں کچھ مسلمانوں نے حضرت عثمان کے بعض گورنروں سے اس بات پر اتفاق نہیں کیا کہ خراج اور ٹیکسوں کی یہ رقم جو جمع کی جاتی ہے اللہ کا مال ہے وہ کہتے تھے کہ یہ مسلمانوں کا مال ہے، اور اس سلسلہ میں انہوں نے کچھ مصیبتیں بھی اٹھائیں، اگر مسلمان اس زمانے کے نظام کو نظامِ الٰہی تسلیم کرتے تو ان کو مال اللہ کہنے سے ہرگز انکار نہ ہوتا۔ حضرت معاویہ نے جب ان کے سامنے یہ تعبیر پیش کی گئی اس طرح بات بنادی کہ "لوگ اور ان کے پاس جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اس لئے کہ وہ اللہ کے بندے ہیں پس ان کا مال اللہ کا مال ہے"

خلاصۂ کلام یہ کہ عہد نبوی کا نظامِ حکومت مقدس الٰہی نظام نہ تھا بلکہ اس کی حیثیت انسانی معاملات کی سی تھی جس میں صحت اور غلطی دونوں کا امکان تھا اور جس میں لوگوں کے لئے اس بات کی گنجائش ہے کہ اس کو جانچیں دیکھیں پھر اپنی رضامندی یا ناپسندیدگی کا اظہار کریں،

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ نبی کریم صلعم اور شیخین کا دور، جمہوریت کا دور تھا لیکن یہ الفاظ کو ان کے مقررہ حدود ومعانی سے آگے بڑھا دینا ہے اور اس کے لئے ضروری ہے کہ ہم جمہوری یا غیر جمہوری ہونے کا حکم لگانے سے پہلے پوری باریکی کے ساتھ خود جمہوریت کا مفہوم متقرر کرلیں، جمہوریت۔ یعنی وہ حکومت جسے عوام نے عوام کے لئے بنائی ہو، جس کے حاکم کا انتخاب عوام نے اپنے آزاد اختیار

سے کیا ہو اور جس میں حاکم کے آزاد احتساب اور نگرانی کا حق عوام کو حاصل ہو، تاکہ وہ معلوم کرسکیں کہ ان کا حاکم جمہور کی مصلحتوں کے لئے کام کر رہا ہے یا ذاتی مصلحت کا پابند ہے پھر یہ کہ وہ اگر مطمئن نہ ہوں تو اسے معزول کرسکیں۔

یونانی عہدِ قدیم میں جمہوریت کا یہی مطلب سمجھتے تھے اور آج عہدِ جدید میں بھی جن قوموں نے اپنا نظام جمہوری بنایا ہے اس کا بھی مطلب بتاتے ہیں ہاں لفظ عوام کے مفہوم میں اختلاف رہا ہے، اس لفظ کے مفہوم کا دائرہ یونانیوں کے عہد میں تنگ تھا، اس سے ہم وطنوں کی ایک مختصر سی جماعت مراد لیتے تھے جس کے افراد تمام حقوق کے مالک ہوتے اور قانون کی نگاہ میں باہم مساوی درجہ رکھتے تھے لیکن عام انسانوں کا نہ اس مساوات میں کچھ حصہ تھا اور نہ حکومت میں، فرانس کی بغاوت کے بعد اس لفظ کے مفہوم میں کچھ اور وسعت پیدا ہوئی اور اب اس کے دائرے میں اہلِ وطن کی ایک بہت بڑی تعداد داخل ہوگئی جسے سیاسی حقوق سے استفادے کا حق دیا گیا لیکن یہ وسعت بھی تمام اہلِ وطن کو اپنے اندر شامل نہ کرسکی اس لئے کہ عوام کے مفہوم میں اب تک اس قید کی تنگی تھی کہ وہ یا تو ایک مقررہ معیار کے دولت مند ہوں، یا ٹکس کی ایک مقررہ مقدار ادا کرتے ہوں یا تعلیم وتہذیب کے کسی خاص درجے کے حامل ہوں گذشتہ صدی کے اواخر میں اس وسعت کا دامن کچھ اور پھیلا اور وطن کے تمام بالغ مرد عوام میں شامل کرلئے گئے پھر اس موجودہ صدی میں بات یہاں تک بڑھی کہ تمام بالغ عورتیں بھی جمہور کا جزو تسلیم کرلی گئیں، بہر حال جمہوریت خواہ تنگ ہو خواہ کشادہ اپنا ایک مقررہ نظام رکھتی ہے وہ نظام جمہور کو حقوق کا مالک بناتا ہے اور اس کو اختیار دیتا ہے کہ اپنے حکام پر جانچ اور احتساب کی نظر رکھے۔

اگر ہم جمہوریت کے اسی مفہوم کو پوری دقتِ نظر کے ساتھ سامنے رکھیں تو یقین کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کے ابتدائی دور میں حکومت کا نظام جمہوری نہ تھا، اس لئے کہ حکام کا انتخاب اس باریکی سے جمہور نے نہیں کیا تھا، نبی کو عوام نے اللہ کے احکام کی تبلیغ کرنے اور حق وانصاف قائم کرنے کے لئے پسند نہیں کیا بلکہ خود اللہ نے اپنا رسول بنا کر بھیجا پھر جس کا جی چاہا ایمان لایا جس کا جی چاہا مخالفت کرتا رہا

اب اگر یہ کہا جائے کہ نبی کریم صلعم پر ایمان لانے والے صحابہ نے آپ کو اپنا حاکم پسند کیا، تو کہا جائے گا کہ یہ پسندیدگی جمہوریت کے نظام کے مطابق نہ تھی، اور نہ یہ پسند کرنے والے اپنے حاکم پر احتساب اور نگرانی رکھتے تھے، وہاں تو حالت یہ تھی کہ خود نبی جب ان سے مشورہ چاہتے تو اپنے خیالات کا اظہار کرتے اور یہ مشورہ بھی بہت مختصر کبھی کبھی، پھر وہ بھی قبول کیا جائے یا نہ کیا جائے۔ حضرت ابوبکر اور حضرت عمر کی حکومت کو بھی پورے معنی میں جمہوری نہیں کہا جا سکتا اس لئے کہ تمام مسلمانوں نے ان کو خلافت کے لئے منتخب نہیں کیا تھا انصار و مہاجرین کے ارباب حل و عقد کی ایک جماعت نے اپنے ابتدائی اختلاف کے باوجود ان دونوں حضرات کو پسند کیا، پھر ان عربوں سے تو مشورہ ہی نہیں لیا گیا جو مکہ، طائف اور قرب و جوار کے دیہاتوں میں آباد تھے، اور حضور کی وفات کے وقت مسلمان تھے، مدینہ والوں نے صدیق اکبر اور فاروق اعظم کو پسند کیا، باقی تمام مسلمانوں نے یہ بات سنی اور تسلیم کرلیا، ایسی حالت میں مرتدین میں سے بعض کا یہ کہنا محل تعجب نہیں

اطعنا رسول اللہ ما کان بیننا فیا لعباد اللہ ما لابی بکر

رسول اللہ جب تک ہم میں تھے ہم نے ان کی اطاعت کی، اللہ کے بندو رسول کے بعد یہ ابوبکر کون ہوتے ہیں؟

پھر عوام بلکہ انصار و مہاجرین کی یہ جماعت کوئی ایسا مقررہ نظام نہیں رکھتی تھی جس سے خلفا کی کارروائیوں پر احتساب کیا جا سکے اور کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے پر باز پرس ہو سکے، صورت حال یہ تھی کہ خلفا اپنے ساتھیوں سے مشورہ طلب کرتے اور یہ ساتھی کبھی انفرادی حیثیت میں، کبھی اجتماعی طور پر اپنے خیالات پیش کر دیتے اور خلفا اسے منظور یا مسترد کر دیتے، بس اس سے واضح ہو جاتا ہے کہ مسلمانوں کے صدر اول کا نظام حکومت ان حدود کے اندر جو جمہوری دستور نے مقرر کی ہیں جمہوری نہ تھا، نہ قدیم نقطۂ نظر سے اور نہ موجودہ تخیل کے ماتحت،

اب اگر جمہوریت کا مطلب وہ عام مفہوم لیا جائے جس میں یہ بات شامل ہے کہ حاکم کو عوام کا پسندیدہ اور معتمد ہونا ضروری ہے نیز یہ کہ وہ عدل و مساوات کے اعتبار سے ایسے کردار

کا مالک اور ایسی سیرت کا حامل ہو جس میں اونچ نیچ اور ظلم و زیادتی کے لئے کوئی جگہ نہ ہو تو بلا شک کہا جاسکتا ہے کہ اس عام معنی میں جو حد بندیوں اور معیاروں سے خالی ہے اسلام کا دورِ اول جمہوریت کا دور تھا جس کے نتائج آگے چل کر آپ دیکھیں گے کہ مسلمانوں کے لئے عہد عثمانی میں کیسے کیسے فتنے پیش آئے۔

کچھ لوگوں کا یہ بھی خیال ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور کا نظامِ حکومت ایک انفرادی شاہی عادلانہ نظام تھا جس میں صحابہ نبی کے یا شیخین کے شریکِ حکومت نہ تھے بلکہ ان کی حیثیت مشیروں کی تھی اور یہ مشیر بھی لازمی اور ضروری نہ تھے، نبی اور ان کے دونوں خلفا عدل کا حد درجہ خیال رکھتے تھے اس کے سوا کوئی اور بات ان کی نگاہ میں اہم نہ تھی، اس قسم کا تخیل مسلمانوں کے نظام کو اس طرزِ حکومت سے قریب کر دیتا ہے جو رومیوں میں شاہی اور قیصری دور میں رائج تھا، روم کے بادشاہ بھی بطور وارث، حکومت کے قطعی حق دار نہیں ہوتے تھے بلکہ ان کا انتخاب ہوتا تھا، اور جب کوئی ایک مرتبہ منتخب ہو جاتا پھر عمر بھر وہ حکومت کرتا البتہ شدید بغاوت اور عام نافرمانی کی حالت میں اسے معزول ہونا پڑتا، عہد نبوی اور عہد شیخین کے اسلامی نظام اور اس رومی نظام میں اگر کچھ فرق ہے تو وہ یہ کہ مسلمانوں کی حکومت کا قوام عدل و انصاف تھا، اور رومی بادشاہوں اور قیصروں کا دربار اس سے یکسر و بیشتر خالی تھا لیکن یہ خیال بھی پہلی دو رایوں کی طرح کچھ بڑی گہرائی اور دِقّتِ نظر پر مبنی نہیں۔

ہمیں معلوم ہے کہ رومیوں کے ہاں بادشاہوں کے انتخابات میں مذہب ایک زبردست طاقت تھی جو خود ان بادشاہوں کی سیرتوں پر بھی اثر انداز تھی، پس رومی اور اسلامی نظاموں میں مذہب، مذہب کا فرق ہے جس طرح قومیت اور ماحول کا فرق ہے وہ مذہب جو رومی بادشاہوں پر غالب تھا اپنے اندر پاکیزگی اور رفعت کی کوئی ایسی شان نہیں رکھتا تھا جو اس کو آسمانی مذاہب سے کم یا زیادہ مشابہ بنا دے اس کی بنیاد تو بد شگونی اور نیک فالی پر تھی آج جب ہم پڑھتے ہیں کہ اس مذہب کی روشنی میں کس طرح غیب کی باتیں معلوم کرنے کی ترکیبیں کی

جاتی تھیں تو بے ساختہ ہنسی آجاتی ہے۔

وہ ارتقا جس نے رومی عوام کو ان کی ابتدائی اور سادہ زندگی سے نکال کر ایک پُر تکلف اور پیچیدہ حیات سے آشنا کیا اس ارتقاء سے کوئی نسبت نہیں رکھتا جس نے عربوں کو ان کے دورِ جاہلیت سے کھینچ کر اسلام تک پہنچایا، رومی انقلاب ایک مادی انقلاب تھا اگر یہ تعبیر درست سمجھی جائے جو تہذیب و تمدن کی ترقی کے ساتھ تدریجی طور پر ظہور پذیر ہوا۔ اور عربی انقلاب ایک معنوی انقلاب تھا جس کی بنیاد طبیعتوں کی تبدیلی تھی جو عربوں میں اسلام کی تاثیر سے ہوئی پس کہنا چاہیئے کہ عربی انقلاب اندر سے باہر آیا، طبیعتیں بدلیں اور عربوں نے اپنی زندگی کا مادی نقشہ بدلا ہوا پایا، اور رومی انقلاب باہر سے اندر آیا خارجی حالات نے پلٹا کھایا اور رومیوں کے دل اور طبیعتیں بدل گئیں،

پھر رومی اور عربی ماحول جدا جدا ہیں، اتنے جدا جتنا اٹلی سے حجاز، تو کیا تعجب کہ اسلام کے صدر اول کا نظامِ حکومت رومیوں کے شاہی دور کے نظامِ حکومت سے بالکل جدا ہو۔ میں محسوس کرنے لگتا ہوں کہ رومیوں کا وہ نظام حکومت جو ان کے جمہوری دور سے متعلق ہے وفات نبوی کے بعد والے نظام حکومت سے تھوڑی بہت مشابہت رکھتا ہے، اس دور میں رومی اپنے قنصل کا انتخاب تقریباً اسی طرح کرتے تھے جیسے مسلمان خلفا کا، اور مہاجرین سے انصار کا یہ کہنا

منا امیر و منکم امیر ایک امیر تمہارا اور ایک امیر ہمارا

اسی طرزِ فکر کی ایک آواز ہے۔

رومی قنصل منتخب ہو جانے کے بعد اسلامی خلفا کی طرح موقر اور شاندار حیثیت کے مالک ہو جاتے تھے لیکن ان میں اور خلفا میں یہ فرق ہے کہ قنصل صرف ایک سال کے لئے منتخب ہوتا تھا، اور خلیفہ زندگی بھر کے لئے، قنصل کا اقتدار ان احکام اور قوانین کا پابند تھا جو مجلسِ شیوخ اور مجلسِ عوام کی طرف سے صادر کئے جاتے، اور خلیفہ کی حکم رانی پابند تھی دین کے

مقررہ حدود کی، یا جلیل القدر صحابہ میں سے کسی ایک کے مسلک کی یا عامۃ المسلمین کے مصالح کی، لیکن عرب اور اٹلی میں مشابہت کی یہ تمام باتیں بناوٹی معلوم ہوتی ہیں اور اگر ہم ان باتوں میں قنصل کی حکومت کے تکلفات اور تزک و احتشام کی داستان بھی جوڑ دیں جس کا خلیفہ کے ماحول میں کہیں پتہ بھی نہیں یا بعض ان اقدامات کا تذکرہ کردیں جو رومی جمہوریت نے عوام کی حمایت میں، قنصل کے اقتدار پر کنٹرول کرنے کے لئے حالات سے مجبور ہو کر کئے تو مطلع بالکل صاف ہو جاتا ہے اور نظر آنے لگتا ہے کہ عربی نظامِ حکومت کے اس مختصر عہد کا رومی نظام سے دور نزدیک کا کوئی رشتہ نہیں، چاہے شاہی دور کا نظام ہو چاہے جمہوریت کے دور کا۔

اس میں شک نہیں کہ مسلمانوں نے سیاسی امور میں، انتظامی معاملات میں اور جنگی فنون میں قیصری اور کسروی نظاموں سے بہت کچھ کیا، لیکن جس زمانے سے متعلق ہم یہ بحث کر رہے ہیں یہ اقتباس اس کے بہت بعد کا ہے، اس لئے ہمیں یہ مشابہت والی بات یہیں ختم کردینی چاہیئے اس لئے کہ اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے،

بہر حال اس وقت کا اسلامی نظامِ حکومت نہ استبدادی تھا نہ یونانیوں کا بنا ہوا جمہوری اور نہ رومیوں کا سا شاہی، جمہوری یا مشروط اور مقید قیصری، بلکہ وہ تو ایک خالص عربی نظام تھا جس کے خانے اسلام نے بنائے اور مسلمانوں نے ان کے پُر کرنے کی کوشش کی،

میں نے اپنی بعض تحریروں میں عربی نثر کی ابتدا سے بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ قرآن نہ شعر ہے نہ نثر، حقایق کی تعبیر میں، مسائل کی تصویر میں اور احکام کے بیان میں اس کے خاص خاص اسلوب ہیں اور مخصوص طرز ادا، اس میں موسیقی کی بعض خصوصیتیں پاکر سادہ طبیعتوں نے خیال کرلیا کہ قرآن شعر ہے، قوافی کی پابندی دیکھ کر خیال کیا گیا وہ کلام مقفیٰ ہے، بعض دوسرے سادگی پسندوں نے اس کی سلاست اور روانی اور قیود و شرائط کی عدم پابندی دیکھ کر نثر کا حکم لگادیا، قریش کے مشرکین کو یہیں دھوکہ ہوا اور انہوں نے قرآن کو شعر کہہ دیا جس کی سخت تردید کی گئی، اسی طرح بعض ان محققین نے دھوکا کھایا جو عربی نثر کی تاریخ تلاش کر رہے تھے اور کہہ دیا کہ قرآن سب

سے پہلی عربی نثر ہے، واقعات اس قول کی شدید ترین تکذیب کرتے ہیں اگر عربی کے نثر نگار قرآن جیسی عبارت لکھنے کی کوشش کرتے (اور بعضوں نے کی بھی) تو یہ عمل مذاق اور مضحکہ کی حد سے آگے نہ بڑھتا۔

یہ بات میں نے قرآن کے بارے میں کہی تھی، اِس وقت اسی قسم کی ایک اور بات ابتدائی عربی اسلامی نظامِ حکومت کے بارے میں کہنا چاہتا ہوں کہ وہ کوئی ملوکی نظام نہ تھا نبی اور نبی کے دونوں خلفا کے لئے اس سے زیادہ تکلیف پہنچانے والی کوئی اور بات نہ تھی کہ ان کو بادشاہ کہا جائے۔ اور نہ جمہوری نظام تھا اس لئے کہ جمہوری نظاموں میں ایسا کوئی پہلو نہیں ہے جو منتخب صدر کو زندگی بھر کے لئے حوالے کردے، اور نہ رومی نقطۂ نظر کا قیصری نظام تھا اس لئے کہ خلیفہ کا انتخاب فوجی حلقے نہیں کرتے تھے پس وہ خالص عربی نظام تھا جس کی نظیر عربوں کے پاس نہ تھی پھر وہ اس کی تقلید بھی نہ کر سکے لیکن اس کے باوجود ہمارے لئے گنجائش ہے کہ ہم اس کی تحلیل کریں، اس کی باریکیوں کی چھان بین کر کے اس کا پتہ چلائیں کہ کیا اس نظام میں برقرار رہنے کی طاقت تھی یا وہ اپنی تخلیق اور ترقی سے محیط حالات کے بدلتے ہی اپنی جگہ سے ہٹ جانے والا تھا۔

اس نظام کے اجزا میں وہ جز جس میں ہماری نظر سب سے پہلے جاتی ہے مذہبی عنصر ہے اس لئے کہ آسمانی نہ ہونے کے باوجود یہ نظام آسمان یعنی دین سے بہت زیادہ متاثر ہے اور خلیفہ کے احکام ہر چند کہ وحی والہام نہیں تھے لیکن وہ بہر حال حدود اللہ کے تابع تھے یعنی حق وانصاف کا قیام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر،

وحیِ الٰہی کا یہ سلسلہ جو پورے تیئیس سال جاری رہا اور صبح و شام کبھی آیاتِ قرآنی کی شکل میں، کبھی نبی کی زبان سے حدیث بن کر، اور کبھی سیرتِ نبوی میں عملی زندگی ہو کر، مسلمانوں سے متصل رہا، اس نے خاصانِ نبی کی طبیعتوں کو جگا دیا ان کے سینوں میں ایک زندہ قوی اور دین آشنا دل روشن کر دیا پھر غیر ممکن ہو گیا کہ مسلمان اپنے قول، اپنے

عمل، اپنے فکر بلکہ اپنے سونے اور جاگنے میں بھی دل زندہ کی زد سے بچ سکے۔

چنانچہ وہ جس حال میں بھی رہا، حاکم رہا تو رعایا کے ساتھ تعلقات میں، رعیت رہا تو حاکم سے ربط ضبط میں نیز ساتھیوں سے میل جول اور روزمرہ کی زندگی میں، اپنے زندہ اور ایمان دار دل کی روشنی سے الگ نہیں رہا۔ یہی نقشہ دیکھ کر اکثر لوگ خیال کرنے لگتے ہیں کہ اس عہد کا نظام ایک الٰہی نظام ہے جو آسمان سے اترا ہے، حالانکہ واقعہ یہ نہیں ہے، اصل بات خلیفہ اور اس کی رعایا کے دلوں کا دین سے متاثر ہونا ہے،

اس نظام کا دوسرا جزو وہ نسبتی شرف اور بزرگی ہے جس کی بنیاد نہ نسل پر ہے نہ دولت پر اور نہ سماج میں کسی بڑے عہدے اور منصب پر بلکہ اس کی بنیاد ان تمام باتوں سے زیادہ اہم ایک حقیقت پر ہے اور وہ نبی کی زندگی میں اس کا نبی سے تعلق، ارشاداتِ نبوی پر اس کا درجۂ یقین، اور بحالاتِ امن وجنگ اللہ کی راہ میں مصائب اور مشقتوں کا برداشت کرنا۔

ان اوصاف نے اسلام کے آغاز ہی میں ممتاز افراد کا ایک طبقہ پیدا کر دیا تھا جس نے عام مسلمانوں سے امتیازی درجہ میں اپنے لئے کسی دنیاوی حق کی خواہش نہیں کی اور نہ اپنی ذات کے لئے کوئی فوری یا متوقع منفعت چاہی، رسول نے ان کو اپنی محبت سے نوازا اور عوام کو مطلع کیا کہ خدا بھی اس طبقہ سے محبت رکھتا ہے، وہ لوگ جنھوں نے اسلام لانے میں سبقت دکھائی جو اللہ کی راہ میں مصیبتیں اور عذاب برداشت کرتے رہے، وہ جو اپنا دین اپنے ساتھ لئے حبش اور پھر مدینہ ہجرت کر گئے، وہ لوگ جنھوں نے اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے دھن دولت اور اپنی جانیں نثار کر دیں وہ جو پروانے کی طرح شمع نبوت کا ماحول چھوڑتے ہی نہ تھے، جو کچھ کہا جاتا سنتے، جو کچھ بیان ہوتا قلمبند کرتے یہی لوگ ہیں جن سے اس طبقہ کی تشکیل ہوئی جو خدا اور اس کے رسول کو محبوب اور عامۃ المسلمین کی نگاہوں میں محترم اور مکرم تھا، اس طبقہ کی کیفیت یہ تھی وہ اپنے کو دوسروں سے ممتاز اور برتر خیال نہیں کرتا تھا وہ اپنا درجہ عام انسانوں کے درجے کے برابر جانتا تھا یہی انکسار اور

فروتنی اللہ کے نزدیک ان کے درجات کی بلندی کا باعث تھی، عوام کی نگاہوں میں بھی ایسی تواضع سے ان کی عظمت اور منزلت بڑھتی جاتی تھی، یہ طبقہ بڑے بڑے نامی گرامی خاندان والوں پر مشتمل نہ تھا نہ اس کے افراد غیر معمولی دولت مند اور لکھ پتی تھے، ادھر ادھر کے معمولی لوگ، جن میں وہ غلام بھی تھا جو اپنے مذہب ہی کی سزا میں عذاب دیا جارہا تھا پھر بعض مسلمانوں نے خرید کر اس کو آزاد کر دیا ان میں وہ کمزور اور بے سروسامان بھی تھا جو پناہ کی تلاش میں مکہ آیا اور زندگی کے دن قریش کے قبیلے یا سردار کی حمایت میں بسر کرنا چاہتا تھا، ان میں بعض وہ بھی تھے جو کسی حصہ سے بھی مکہ آئے اور امن وامان اور کاروبار دیکھ کر وہیں رہ پڑے، اور وہ بھی جو نسب اور خاندان کے اونچے لیکن زر ندارد، مفلوک الحال، قوم میں بڑی عزت اور گھر میں کھانے کی تنگی، کسی نہ کسی طرح زندگی کے دن کٹ رہے تھے۔

یہ تھے اس طبقہ کے افراد، اور اسلام نے حقوق اور فرائض کے اعتبار سے ان سب کو ایک ہی درجہ دیا تھا، اگر کوئی امتیاز کی بات تھی تو وہ اسلام کی راہ میں آزمائشوں کا حصہ، مصائب اور آلام کے نزول کے وقت صبر وثبات کی کیفیت، ضرورت کے مواقع پر نبی کی جان ومال سے امداد۔

اسلام کی اشاعت کے ساتھ ساتھ اس طبقے کے افراد کا امتیاز عوام میں قدرتی طور پر بڑھا عوام ان کو جن حقوق اور درجات کا حق دار خیال کرتے تھے وہ خود اپنی ذات کو ان کا مستحق تصور نہیں کرتے تھے اسی طبقہ کے افراد عام مسلمانوں کو دین سکھاتے اور جو کچھ انھیں معلوم ہوتا اس سے باخبر کرتے تھے، اور بسا اوقات جب قبائل کے لوگ نبی سے درخواست کرتے کہ ان کے پاس دین سکھانے والے بھیجے جائیں تو حضرت اسی طبقہ کے افراد کو معلم، فقیہ اور امام بنا کر بھیجتے تھے، پھر ابھی نبی کی ہجرت پر چند ہی ماہ گذرے تھے کہ معرکۂ بدر نے پوری سرزمین عرب میں اسلام کی عزت دوبالا کر دی اور اس کا رعب تمام عربوں پر چھا گیا، تھوڑے ہی دنوں بعد اس معرکے میں شریک ہونے والے بدری کہلاتے اور مسلمانوں میں ایک خاص امتیاز کے حامل ہوئے اب اگر نبی کے ساتھ کسی اور غزوہ میں شرکت کا کسی کو موقع ملا تو وہ مزید امتیاز کا مستحق ہوا اور اگر احد کے موقع پر اقلیت

کی فضا میں ثابت قدم رہنا کسی کے نصیب میں تھا تو وہ اور بھی ممتاز ہوا، اور کسی صحابی کے لئے امتیاز کا یہ آخری درجہ تھا کہ نبی اس کی تعریف کرے اسے دوسروں کے لئے امام اور رہنما کا درجہ دے اسے جنت کی بشارت سنائے اور اعلان کردے کہ وہ اس سے راضی اور خوش ہے ان تمام باتوں میں کوئی حیرت اور تعجب والی چیز نہیں اس لئے کہ یہ حالات کے تقاضے ہیں، اس سلسلے میں توجہ کے قابل بات یہ ہے کہ صحابہ کا یہ ممتاز گروہ جو باہم مختلف امتیازات اور فضائل کا حامل تھا، نبی کی وفات کے بعد مسلمانوں کے تمام معاملات کا متولی ہوا۔

اسی گروہ سے اس فرد کو پسند کیا جائے گا جو امت میں نبی کا جانشین ہوگا، اسی گروہ پر خلیفہ کو اعتماد کرنا ہوگا تاکہ لوگ اس کو مانیں اور اس کی اطاعت کریں اور یہی گروہ ہے جس کے مشورے کا ضرورت کے مواقع پر خلیفہ محتاج ہے۔

لیکن صورتِ حال یہ ہوئی کہ نبی کی وفات پر چند دن نہیں چند گھنٹے ہی گذرے تھے کہ اسلام نے خواص کی ایک نئی شکل دیکھی، جو حکومت سے شدید اتصال رکھتی ہے چنانچہ خلافت پر بحث شروع ہوئی، انصار نے قریش سے کہا ایک امیر ہم میں سے اور ایک امیر تم میں سے حضرت ابوبکرؓ نے نبی کی حدیث سنائی "خلفاء قریش میں سے ہوں" اور اس کے بعد انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ہم امیر ہوں اور تم وزیر، انصاریوں نے یہ بات قبول کرلی اور کسی نے بجز سعد بن عبادہ کے کوئی اعتراض نہیں کیا، رحمۃ اللہ علیہ۔

سُلطان محمُود غزنوی کی تصویر کا حقیقی رُخ

از

(جناب سید محبوب صاحب رضوی)

انگریز مورخین نے بڑی کاوشِ دماغی کے ساتھ محمود غزنوی کی جو تصویر پیش کی ہے اُس کا ایک رخ تو آپ نے ہندوستان کے سرکاری مدارس کی تاریخوں میں دیکھا ہوگا جس میں دو ایک اوڈوں کی "فرضی حکایت" کو بڑے آب و رنگ کے ساتھ نمایاں کر کے پیش کیا گیا ہے۔

ذیل میں اس تصویر کا حقیقی رخ ملاحظہ فرمایئے اور انگریز مورخین کی مصلحت کوشی، نکتہ سنجی اور مورخانہ فرائض کی داد دیجئے۔

ایک دن سلطان محمود غزنوی حسب معمول دربار عام میں بیٹھا ہوا تھا، وزراء و امراء دست بستہ حاضر تھے، عام لوگ اپنی اپنی عرضیاں پیش کر رہے تھے اور سلطان اُن پر مناسب احکام صادر کر رہا تھا کہ ایک شخص نے سامنے آکر عرض کیا کہ "میری شکایت نہایت سنگین ہے اور کچھ اس قسم کی ہے کہ میں اسے برسرِ دربار عرض نہیں کر سکتا"۔

سلطان یہ سُن کر فوراً اٹھ کھڑا ہوا اور سائل کو اپنے ہمراہ خلوت میں لے جا کر پوچھا کہ "تمہیں کیا شکایت ہے؟"

سائل نے عرض کیا کہ "ایک عرصہ سے بندگانِ عالی کے بھانجے نے یہ طریقہ اختیار کر رکھا ہے کہ وہ مسلح ہو کر میرے مکان پر آتا ہے اور مجھے مار پیٹ کر باہر نکال دیتا ہے اور خود جبراً میرے گھر میں شب بھر دادِ عیش دیتا ہے، غزنی کی کوئی عدالت ایسی باقی نہیں جس میں میں نے اس ظلم و تعدی کی فریاد نہ کی ہو، لیکن کسی کو انصاف کرنے کی جرأت نہ ہوئی جب میں ہر طرف سے مایوس ہو گیا تو آج مجبوراً جہاں پناہ کی بارگاہ عالیہ میں انصاف کے لئے حاضر ہوا ہوں اور شہنشاہِ عالم کے بے لاگ انصاف، زبار دسی

اور رعایا سے بے پناہ شفقت کے بھروسہ کرکے میں نے اپنا حال عرض کر دیا ہے، خالق حقیقی نے آپ کو اپنی مخلوق کا محافظ اور نگہبان بنایا ہے، قیامت میں رعایا اور کمزوروں پر مظالم کے آپ خدائے قہار کے روبرو جواب دہ ہوں گے، اگر آپ نے میرے حال پر رحم فرماکر انصاف کیا تو بہتر ہے ورنہ میں اس معاملہ کو منتقم حقیقی کے سپرد کرکے اس کے بے لاگ رعایت فیصلہ تک صبر کروں گا۔"

سلطان پر اس واقعہ کا اتنا اثر ہوا کہ وہ بے اختیار آبدیدہ ہو گیا اور سائل سے کہا کہ "تم اب سے پہلے میرے پاس کیوں نہ آئے؟ تم نے ناحق اب تک یہ ظلم برداشت کیا؟"

سائل نے کہا کہ "میں عرصہ سے اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ کسی طرح بارگاہِ سلطانی تک پہنچ جاؤں، مگر دربانوں اور چوبداروں کی قدغن نے کامیاب نہ ہونے دیا، خدا ہی جانتا ہے کہ آج بھی کس تدبیر سے یہاں تک پہنچا ہوں، مجھ سے غریبوں اور مظلوموں کو یہ بات کہاں نصیب ہے کہ جب چاہیں بے دھڑک دربار سلطانی میں حاضر ہو جائیں اور سلطان کو اپنے دردِ دل کی داستان سنا سکیں۔"

سلطان نے سائل کو اطمینان اور دلاسہ دے کر تاکید کی کہ "اس ملاقات اور گفتگو کا کسی سے ذکر نہ کرنا اور جس وقت بھی وہ شخص تمہارے گھر آئے، اسی وقت مجھے اس کی اطلاع کر دینا، میں اس کو ایسی عبرت انگیز سزا دوں گا کہ آئندہ دوسروں کو ایسے مظالم کی جرأت نہ ہو سکے گی!"

سائل نے عرض کیا کہ "مجھ ایسے بے کس اور بے یار و مددگار کے لئے یہ کیوں کر ممکن ہو سکے گا کہ جب چاہوں بلا کسی مزاحمت کے خدمتِ سلطانی میں حاضر ہو جاؤں اور آپ کو مطلع کر سکوں۔"

سلطان نے یہ سن کر دربانوں کو طلب کیا اور سائل کو ان سے روشناس کرا کر حکم دیا کہ "یہ شخص جس وقت بھی ہمارے پاس آنا چاہے بلا طلبِ اجازت اسے ہمارے پاس پہنچا دیں اور کسی طرح کی مزاحمت نہ کریں۔"

دو راتیں گزر گئیں، مگر سائل نہ آیا، سلطان کو تشویش ہوئی کہ نہ معلوم غریب مظلوم کو کیا حادثہ

پیش آیا: وہ اسی فکر میں غلطاں تھا کہ تیسری رات کو سائل دوڑا ہوا آستانہ شاہی پر پہنچا اطلاع ملتے ہی سلطان فی الفور باہر نکلا اور سائل کے ہمراہ اس کے گھر پہنچ کر اپنی آنکھوں سے وہ سب کچھ دیکھ لیا جو سائل نے اُسے بتلایا تھا، پلنگ کے سرہانے شمع جل رہی تھی، سلطان نے شمع گل کرادی اور خود خنجر نکال کر اس بدکردار کا سر اُڑادیا، اس کے بعد شمع روشن کرائی، مقتول کا چہرہ دیکھ کر بے ساختہ سلطان کی زبان سے الحمد للہ نکلا، اور پھر بے تابی کے ساتھ اس نے سائل سے پینے کے لئے پانی مانگا، پانی پی کر سلطان نے سائل سے کہا کہ "تم اطمینان کے ساتھ اپنے گھر میں آرام کرو، اب انشاء اللہ تمہیں کوئی تکلیف نہ پہنچے گی، میری وجہ سے اب تک تم پر جو مظالم ہوئے خدا کے لئے نہیں معاف کردو!" یہ کہہ کر سلطان رخصت ہونا چاہتا تھا کہ سائل نے دامن پکڑ کر عرض کیا کہ "بندگانِ عالی نے جس طرح ایک مظلوم کے ساتھ انصاف فرمایا، حتیٰ کہ اپنی قرابت اور خون کا بھی مطلقاً خیال نہ کیا خدائے تعالےٰ آپ کو اس کی جزا خیر اور اجرِ عظیم عطا فرمائے! اگر اجازت مرحمت فرمائی جائے تو ایک بات معلوم کرنا چاہتا ہوں وہ یہ کہ آپ نے پہلے شمع گل کرائی اور پھر روشن کرا کر مقتول کا سر دیکھ کر الحمد للہ فرمایا اور اس کے فوراً بعد پانی طلب کیا، اس کا کیا سبب تھا"

سلطان نے ہر چند ٹالنا چاہا، مگر سائل کے اصرار پر اسے بتلانا پڑا کہ "شمع گل کرانے کا مقصد یہ تھا کہ مبادا روشنی میں اس شخص کا چہرا دیکھ کر بہن کے خون کی محبت مجھے سزا دینے سے باز رکھے اور الحمد للہ کہنے کا سبب یہ تھا کہ مقتول نے اپنے آپ کو میرا بھانجہ بتلا کر تمہیں دھوکے میں ڈال دیا تھا اور اس طرح وہ تمہیں شاہی تعلق سے مرعوب کر کے اپنی خواہشاتِ نفسانی کو پورا کرنے کے لئے راستہ صاف رکھنا چاہتا تھا، خدا کا ہزار ہزار شکر ہے کہ محمود کے متعلقین کا اس شرمناک بے ہودگی سے کوئی تعلق نہیں ہے اور پانی مانگنے کی وجہ یہ تھی کہ جب سے تم نے اپنا واقعہ سنایا تھا میں نے یہ عہد کر لیا تھا کہ جب تک تمہارا انصاف نہ کرلوں گا آب و دانہ مجھ پر حرام ہے، اب چونکہ میں اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا تھا اور تشنگی کا شدید غلبہ تھا اس لئے میں پانی مانگنے پر مجبور ہو گیا"

(تاریخ فرشتہ بحوالہ تاریخ بنائے گیتی)

(۲) سلطان محمود کو مشہور بزرگ شیخ ابو الحسن خرقانیؒ کی زیارت کا بڑا اشتیاق تھا، چنانچہ شیخ کی زیارت کے لیے خرقان روانہ ہوا، وہاں پہنچ کر شیخ کی خدمت میں پیغام بھیجا کہ "میں آپ سے ملنے کے لئے غزنی سے خرقان آیا ہوں، اس لئے مروت و اخلاق کا تقاضہ یہ ہے کہ آپ یہاں قدم رنجہ فرما کر شرف ملاقات بخشیں۔" اور ساتھ ہی قاصد کو یہ سمجھا دیا کہ اگر شیخ خانقاہ سے باہر آنا قبول نہ کریں تو آیت یٰاَیُّھَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَاَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ وَاُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ شیخ کو سنا دے۔ قاصد شیخ کی خدمت میں حاضر ہوا، اور سلطان کا پیغام پہنچایا، شیخ نے معذرت چاہی، قاصد نے ایمائے سلطانی کے مطابق آیت پڑھی،

شیخ نے فرمایا کہ "تم جا کر سلطان سے عرض کر دو کہ میں اَطِیْعُوا اللّٰہَ میں اس قدر مستغرق ہوں کہ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ کی تعمیل سے ہی سخت شرمندہ ہوں، ظاہر ہے کہ اُولِی الْاَمْرِ مِنْکُمْ کا تو ذکر ہی کیا ہے۔"

سلطان قاصد سے شیخ کا یہ جواب سن کر بہت متاثر ہوا اور خود خانقاہ میں حاضر ہونے کا ارادہ کر لیا، مگر ساتھ ہی شیخ کو آزمانے کے لئے سلطان نے اپنا لباس تو اپنے غلام ایاز کو پہنایا اور خود ایاز کے کپڑے پہنے، اور چند لونڈیوں کو غلاموں کا لباس پہنا کر ساتھ لے لیا، جب یہ لوگ شیخ کی خانقاہ میں پہنچے اور شیخ سے ملاقات ہوئی تو شیخ تعظیم کے لئے کھڑے نہ ہوئے اور نہ محمود نما ایاز کی جانب التفات کیا، بلکہ ایاز نما محمود کی جانب متوجہ ہوئے، ایاز نما محمود نے شیخ سے عرض کیا کہ "آپ نے ظل اللہ کو تعظیم نہیں دی؟"

شیخ نے جواب دیا "ہاں! لیکن تیرا مخاطب اس جال میں پھنسنے والا شکار نہیں ہے! تو سامنے کیوں نہیں آتا، کیا تو ہی اس جال کا سب سے بڑا شکار نہیں ہے؟"

سلطان نے دیکھا کہ شیخ کا عرفان حقیقتِ حال کو سمجھ گیا ہے تو مؤدب شیخ کے سامنے بیٹھ گیا اور عرض کیا کہ "حضرت کچھ ارشاد فرمائیے!"

شیخ نے غلاموں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ "پہلے ان نامحرموں کو مجلس سے باہر کر دیا جائے"

جب شیخ کے ارشاد کی تعمیل ہو چکی تو سلطان نے پھر عرض کیا کہ حضرت بایزید بسطامیؒ کی کوئی حکایت

سنائیے!"

شیخ نے فرمایا کہ "بایزیدؒ فرماتے ہیں کہ جس نے مجھے دیکھا کہ وہ شقاوت و بدبختی کی تمام برائیوں سے محفوظ ہو گیا"۔

سلطان نے کہا کہ "یہ تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا، کیوں کہ یہ تو ظاہر ہے کہ بایزیدؒ کا مرتبہ آنحضرت صلعم سے زیادہ نہیں ہو سکتا، حالانکہ آنحضرت صلعم کے دیکھنے والوں میں ابو لہب و ابو جہل اور کتنے ہی منکرین بدبخت ہی رہے، تو پھر بایزیدؒ کے دیکھنے والوں میں ہر بدبخت کیوں کر سعید بن سکتا ہے؟"

شیخ نے فرمایا کہ "تمہاری پروازِ عقل سے یہ اوپر کی بات ہے، آں حضرت صلعم کو صحابہ کے علاوہ اور کسی نے حقیقی معنی میں دیکھا ہی نہ تھا، کیا تم نے قرآن کی یہ آیت نہیں سنی،

وَتَرٰاھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ — تم اُن کو دیکھتے ہو جو تمہیں دیکھ رہے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ نہیں جانتے۔

اگر وہ لوگ فی الحقیقت آنحضرت صلعم کو دیکھتے تو یقیناً وہ اپنی بدبختی کے اثر سے محفوظ ہو جاتے"۔

سلطان کو شیخ کا یہ جواب بہت پسند آیا اور مزید نصیحت کے لئے عرض کیا،

شیخ نے فرمایا کہ "اپنے اوپر چار چیزیں لازم قرار دے لو! پرہیز گاری، نماز با جماعت کا التزام سخاوت اور مخلوق اللہ پر شفقت و مہربانی"۔

سلطان نے عرض کیا کہ "میرے لئے دعا فرمائیے!"

شیخ نے فرمایا کہ میں ہر نماز کے بعد اللھم اغفر للمومنین والمومنات کی دعا کرتا ہوں"۔

سلطان نے عرض کیا کہ "یہ تو دعا عام ہے میرے لئے خصوصیت سے دعا فرمائیے!"

شیخ نے کہا کہ "خدا تمہاری عاقبت محمود فرمائے!"

سلطان نے چلتے ہوئے نذرانہ کے طور پر اشرفیوں کی ایک تھیلی پیش کی، شیخ کے سامنے سوکھی

روٹی رکھی ہوئی تھی وہ اُٹھا کر سلطان کو دی اور فرمایا کہ "کھاؤ"! سلطان نے تبرکاً ایک ٹکڑا توڑ کر کھانا چاہا مگر گلے سے نیچے نہ اُترا، شیخ نے پوچھا "کیا گلے میں پھنستا ہے؟" سلطان نے کہا "ہاں"! شیخ نے فرمایا "جس طرح یہ روٹی تمہارے گلے میں پھنستی ہے اسی طرح تمہارا یہ نذرانہ میرے گلے میں پھنستا ہے، اسے میرے سامنے سے ہٹا لو!"

جب سلطان رخصت ہونے لگا تو شیخ تعظیم کے لئے سرو قد کھڑے ہو گئے، سلطان نے عرض کیا کہ "میں جب آیا تھا تو آپ نے قطعاً توجہ نہ فرمائی اور اب تعظیم فرما رہے ہیں؟"

شیخ نے فرمایا "اس کا سبب یہ ہے کہ جب تم آئے تھے تو شاہانہ جاہ و جلال کے نشہ میں سرشار تھے اور اب فروتنی و انکسار کے ساتھ واپس جا رہے ہو۔"

(تاریخ فرشتہ بحوالہ تاریخ بنائے گیتی)

سلطان محمود نے خلیفۂ بغداد القاہر باللہ عباسی کو ایک عرض داشت بھیجی جس میں لکھا تھا کہ چونکہ خراسان کا اکثر حصہ میں نے فتح کر لیا ہے اس لئے بقیہ علاقے بھی مجھے عطا فرمائے جائیں! بارگاہِ خلافت سے یہ درخواست منظور ہو گئی، اسی کے ساتھ سلطان نے یہ درخواست بھی کی تھی کہ سمرقند پر حملہ کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی جائے، بارگاہِ خلافت سے اس پر ناراضگی کا اظہار کیا گیا، اور سلطان کے قاصد سے کہہ دیا گیا کہ اگر سلطان محمود نے سمرقند پر حملہ کیا تو میں تمام عالم اسلامی کو اس کے خلاف برانگیختہ کر دوں گا، خلیفہ کے اس جواب پر سلطان محمود بہت چراغ پا ہوا اور بارگاہِ خلافت میں پیغام بھیجا کہ اگر میرا مطالبہ تسلیم نہ کیا گیا تو میں ہاتھیوں کے ایک عظیم لشکر سے خود بغداد پر حملہ کر دوں گا اور اس کی اینٹ سے اینٹ بجا کر بغداد کی مٹی تک غزنی لے آؤں گا، اس کا جواب خلیفہ کی جانب سے ایک سربمہر خط کے ذریعہ سے دیا گیا، جب یہ خط سلطان محمود کے سامنے کھولا گیا تو اس پر بسم اللہ کے بعد صرف یہ تین حروف لکھے ہوئے تھے:-

ا ، ل ، م

قاصد سے پوچھا گیا کہ زبانی کوئی پیغام دیا گیا ہے تو اس نے انکار کیا، لوگ حیران تھے کہ آخر

اس کا مطلب کیا ہو سکتا ہے، خواجہ ابو بکر قہستانی نے عرض کیا "چونکہ حضور نے ہاتھیوں کے ذریعہ سے حملہ کا ارادہ ظاہر فرمایا تھا اس کے جواب میں خلیفہ نے سورۂ فیل کی جانب اشارہ کیا ہے اور اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ الخ کے بجائے صرف سورت کے اول حروف پر اکتفا کیا ہے"

یہ توجیہہ سن کر سلطان محمود پر بڑا اثر ہوا اور وہ دیر تک روتا رہا، جب حواس درست ہوئے تو نہایت لجاجت اور انکسار آمیز معذرت نامہ لکھا اور خلیفہ کو بیش قیمت تحائف بھیج کر اس کی خوشنودی حاصل کی، ابو بکر قہستانی کو انعام اور خلعت دیا گیا۔

۴۔ سلطان محمود کے زمانہ میں کوچ بلوچ کے قزاقوں نے رباط اور دیر کھین (اصفہان) میں ڈاکہ ڈالا، اس میں ایک بڑھیا کا مال و اسباب بھی لٹ گیا، اس نے غزنی پہنچ کر سلطان سے فریاد کی کہ تو خدا کی طرف سے ہمارا محافظ و نگہبان ہے، میرا مال یا اس کا معاوضہ ادا کر! سلطان نے کہا "مجھے خبر نہیں کہ یہ دیر کھین کہاں ہے؟" بڑھیا بولی "اے سلطان! صرف اس قدر ملک فتح کر کہ تو اس سے باخبر رہ سکے اور انتظام کر سکے!" سلطان نے تفتیش کی تو معلوم ہوا کہ وہ کوچ بلوچ کے ڈاکو تھے جو کرمان کی حدود میں ہے اور سلطان کے ممالکِ محروسہ سے باہر ہے، سلطان نے بڑھیا سے کہا کہ وہ علاقہ جہاں تیرا مال و اسباب ضائع ہوا ہے وہ میری حدودِ سلطنت سے باہر ہے اس لئے میں اس کا کیا انتظام کر سکتا ہوں؟

بڑھیا نے کہا "سبحان اللہ! اسی عزم و ہمت اور شوکت و سطوت پر شہنشاہی کا دعویٰ ہے؟ وہ شہنشاہی کیا جو مظلوموں کا حق نہ دلا سکے؟ اور وہ چرواہا کیا ہے جو اپنی بکریوں کو بھیڑیے سے نہ بچا سکے، اس حالت میں میرا تنہا اور ضعیف ہونا اور تیرا فوج و لشکر رکھنا دونوں برابر ہیں!"

سلطان نے بڑھیا کے یہ معقول اور کپکپا دینے والے کلمات سنے تو اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔ بڑھیا کو بہت کچھ دے دلا کر رخصت کیا اور ابو علی الیاس امیر کرمان کو لکھا کہ "ان مفسدوں اور قزاقوں کو فوراً گرفتار کر کے ہمارے پاس بھیج دو اور جس قدر مال و

اسباب برآمد ہو وہ بھی بھیج دیا جائے، تاکہ آئندہ یہ لوگ ہمارے ملک میں لوٹ مار اور قتل و غارت نہ کرسکیں، ورنہ یاد رکھو کہ کرمان سومنات کے مقابلہ میں بہت نزدیک ہے"

امیرِ کرمان سلطان کے خوف سے ایک جرار فوج لے کر گیا، ہزاروں قزاق قتل و گرفتار ہوئے، اور بے شمار مال و اسباب ہاتھ لگا، امیرِ کرمان نے یہ سب سامان غزنی بھجوادیا، سلطان نے منادی کرادی، ملک کے اطراف و جوانب سے لوگ آتے تھے اور اپنا اپنا مال و اسباب پہچان کر لے جاتے تھے، سلطان محمودؔ نے اس واقعہ سے متاثر ہوکر ایک بڑا کام یہ کیا کہ ملک سے ہر قسم کی خبریں منگوانے کے لئے خبر رساں مقرر کردیے، تاکہ حکام کے ظلم و ستم اور ملک کے ہر قسم کے حالات کی سلطان کو اطلاع ملتی رہے،

(نظام الملک طوسی حصہ دوم ص ۲۵۶)

"بطور نمونہ از خروارے" یہ چند واقعات ہیں جن سے سلطان محمودؔ کے حلم و تحمل، ادب و احترام، متانت و سنجیدگی، رعایا پروری، انصاف پسندی، حق شناسی خشیت الٰہی اور مظلوموں کے ساتھ ہمدردی کے جذبات کا کسی قدر اندازہ کیا جاسکتا ہے، اس کے سوانح زندگی میں انگریز ادیب ایڈیسن کے الوؤں والے "فرضی افسانہ" کے برخلاف اس طرح کے بکثرت واقعات موجود ہیں جن کا ایک مختصر مضمون میں احاطہ کرنا دشوار ہے۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات

"بین الاقوامی سیاسی معلومات" میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کردیا گیا ہے، یہ کتاب اسکولوں، لائبریریوں اور اخباروں کے دفتروں میں رہنے کے لائق ہے، جدید ایڈیشن جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے قیمت مجلد ہے، آٹھ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

حالاتِ حاضرہ

سیاٹو کے قیام کا منصوبہ۔ نہر سویز کے تنازعہ کا فیصلہ

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد ایڈیٹر جد و جہد دہلی)

جنیوا کانفرنس میں ہند چینی کے مسئلہ کے پُرامن فیصلہ نے، امن پسندانِ عالم کے اس دعویٰ کو ایک حقیقتِ ثابتہ بنا دیا ہے کہ قوموں کے باہمی اختلافات اور بین اقوامی تنازعات کو طے کرنے کا بہترین ذریعہ مذاکراتِ باہمی ہی ہوسکتا ہے اور فوجی گروہ بندیاں، جارحانہ معاہدات نیز جنگی تیاریاں بین اقوامی تعلقات کو خراب تر بناتی ہیں۔ لیکن جہاں تک مغربی اور خصوصاً امریکی جنگ بازوں کا تعلق ہے وہ اس حقیقت کو سمجھنا نہیں چاہتے اور آج جنیوا کانفرنس کی کامیابی کے باوجود وہ سردجنگ کو ہوا دینے اور فوجی گروہوں کے قیام کے منصوبوں کی تکمیل میں مصروف ہیں۔

گذشتہ چند ماہ سے مغربی جنگ باز جنوبی مغربی ایشیا کے تحفظ کے نام پر "سیاٹو" کی تنظیم کے جو منصوبے تیار کرتے رہے ہیں، توقع تھی کہ جنیوا میں ہند چینی کی جنگ بندی کے فیصلہ کے بعد اس منصوبہ کو ترک کر دیا جائے گا اور جنوبی مشرقی ایشیا کے دوسرے تنازعات کو بھی مذاکرات باہمی کے ذریعہ سے طے کرنے کی کوشش کی جائے گی لیکن تازہ ترین اطلاعات سے معلوم ہوتا ہے کہ جنوبی مشرقی ایشیا کے دفاع اور "سیاٹو" کی تنظیم کے سلسلہ میں معاہدہ کرنے کے لئے ستمبر کے اوائل میں فلیپائن میں ایک کانفرنس منعقد ہوگی۔ اور مسٹر ڈولز کی تجویز یہ ہے کہ ہند چینی کے غیر کمیونسٹ علاقہ نیز برما کو بھی اس معاہدہ میں شریک کیا جانا چاہیئے۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ امریکہ کے موجودہ برسرِ اقتدار جنگ باز گروہ کی قیادت میں امریکہ کے یورپی اور ایشیائی حلیف اب تک جو فوجی گروہ بناتے رہے ہیں یا مستقبل میں جن گروہوں

کی تنظیم کرنا چاہتے ہیں ان سب کا مقصد سوویت یونین اور عوامی چین کے جارحانہ اقدامات سے آزاد، قوموں کو محفوظ رکھنا بیان کیا جاتا ہے لیکن سوویت یونین اور عوامی چین کی پوری تاریخ اس حقیقت پر گواہ ہے کہ یہ ملک کسی دوسرے ملک کے خلاف کوئی جارحانہ قدم اٹھانا نہیں چاہتے۔ ان حالات میں امریکہ اور اس کے حلیف آزاد قوموں کے تحفظ کے نام پر جو کچھ کرتے رہے ہیں اور آئندہ کرنا چاہتے ہیں اس کا مطلب جنگی تیاریوں اور جنگ بازی کے لئے عذر لنگ، کی تلاش کے علاوہ کچھ نہیں ہوسکتا اور ایشیا میں "سیاٹو" کے قیام کا نتیجہ اس خطۂ ارض کے باشندوں میں جنگ کے خطرہ کے احساس کے احیار کی شکل ہی میں برآمد ہوسکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ امریکہ بحرالکاہل کو ہمیشہ سے اپنی مقبوضہ جھیل تصور کرتا رہا ہے اور اس طرح امریکہ کے موجودہ حکمران بحرالکاہل کے ممالک کو اپنے زیرِ اقتدار رکھنے اور وہاں کے قدرتی وسائل سے نفع حاصل کرنے کو اپنا قدرتی اور پیدائشی حق سمجھتے ہیں اور اگرچہ انہیں اس بات کا کامل یقین ہے کہ سوویت یونین یا عوامی چین کسی ملک پر حملہ نہیں کریں گے لیکن وہ اس بات سے بھی بے خبر نہیں کہ ہر ملک کے عوام استعمار سے بیزار ہوچکے ہیں اور ہر ملک میں قومی آزادی کی تحریکات ابھرتی جارہی ہیں اس لئے انہیں ان برائے نام آزاد مگر درحقیقت محکوم اور نیم محکوم ممالک پر اپنی مستعمرانہ گرفت کو جلد از جلد مضبوط بنالینا چاہیئے اور کم از کم جنوبی مشرقی ایشیا میں "سیاٹو" کے قیام کے منصوبہ کا پس منظر یہی ہے۔

نہر سوئز کے سلسلہ میں برطانیہ اور مصر کے درمیان حال ہی میں جو معاہدہ ہوا ہے اس نے ان دونوں ملکوں کے تعلقات کو ایک مرتبہ پھر بحال کردیا ہے لیکن نہر سوئز کے تنازعہ کے فیصلہ نے بین اقوامی نوعیت کے چند مسائل بھی پیدا کردیئے ہیں۔ اور ان میں سے اہم ترین مسئلہ مشرق وسطیٰ کی فوجی تنظیم کا ہے۔

گذشتہ سال جب مغربی جمہوریتوں کی طرف "میڈو" کے نام پر مشرقِ وسطیٰ کی فوجی تنظیم کا

منصوبہ مرتب کیا گیا تھا تو مصر نے نہر سوئز کے قضیہ کے تصفیہ سے قبل اس تنظیم میں شریک ہونے سے انکار کر دیا تھا اور چونکہ آج عرب ممالک میں مصر کو قائد اور رہنما کی حیثیت حاصل ہے اس لئے بیشتر عرب ریاستوں نے مصر کی تقلید کی تھی اور اس وقت یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ حال ہی میں امریکہ اور پاکستان کے مابین عسکری امداد کا جو معاہدہ ہوا ہے اور اس کے بعد پاکستان اور جمہوریہ ترکی نے جو معاہدہ کیا ہے خیال کیا جاتا ہے کہ یہی دونوں معاہدے مستقبل میں مشرق وسطیٰ کی فوجی تنظیم کی بنیاد ثابت ہوں گے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح سمجھنا چاہیئے کہ امریکہ اور برطانیہ مشرق وسطیٰ کی فوجی تنظیم کے جس منصوبہ کو براہ راست کامیاب اور مقبول نہیں بنا سکے تھے وہی منصوبہ پاکستان کے توسّل سے کامیاب بنایا جا رہا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اگر نہر سوئز کے تنازعہ کے فیصلہ کے بعد بھی مصر اس تنظیم میں شرکت پر رضامند نہ ہو سکا تو تنظیم کا یہ منصوبہ کامیاب نہ ہو سکے گا۔

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

لب تک آئی اور پیغامِ خودی ہوتی گئی
ہر فغانِ دل ثبوتِ زندگی ہوتی گئی

جس قدر اسرارِ غم سے آگہی ہوتی گئی
زندگی اپنی مآلِ زندگی ہوتی گئی

حاصل ہوتا ہے بفرصت ارتقائے معنوی
پھول کی صورت باہستہ کلی ہوتی گئی

تا بمنزل اس لئے پہونچے نہ اہلِ کارواں
تیز گامی ان کی وجہ نارسی ہوتی گئی

جس کی سرگرمی محبت میں حریفِ یاس تھی
وہ تمنا رازِ آگاہ خودی ہوتی گئی

سچ ہے دنیا دل لگانے کے لئے موزوں نہ تھی
پھر بھی اس سے کچھ نہ کچھ دل بستگی ہوتی گئی

عشق تو کرتا رہا ہر لمحہ تنظیمِ حیات
عقل تھی وہ جو کہ وجہِ برہمی ہوتی گئی

اس کے ذروں سے جہاں بنتے رہے مٹتے رہے
کس قدر بربادِ خاکِ آدمی ہوتی گئی

بے خودی میں دامنِ ہستی کے پرزے کر دئے
مجھ کو پیغامِ جنوں وارفتگی ہوتی گئی

کتنا عالم گیر تھا تبلیغِ الفت کا فروغ
گوشے گوشے میں جہاں کے روشنی ہوتی گئی

ہم سمجھتے ہی رہے حسنِ ادب اس کو، مگر
وجہ ناکامی ہماری خامشی ہوتی گئی

نیکیوں میں بھی تجاوز کی نہیں گنجائشیں
دوستی حد سے بڑھی جب دشمنی ہوتی گئی

اس کے نغمے پاس آکر گوشِ دل تک جب سنے
سازِ ہستی کی صدا بیکار سی ہوتی گئی

اے الم ناپائداریٔ خوشی کا ذکر کیا
ناخوشی بھی زندگی میں عارضی ہوتی گئی

پیغامِ عمل

از

(جناب پروفیسر ہیرا لال چوپڑہ ایم۔ اے)

زمانے کے تو جو سمجھ لے اشارے — بڑھے جا طلب کر نہ کوئی سہارے

بنا اپنی قسمت اگر کچھ ہے ہمّت — جو قسمت کو کوسیں، ہیں قسمت کے مارے

غلط زعم ہے تو سنوارے کوئی کام — وہی کارساز اپنا سب کچھ سنوارے

یہ جاہ و حشم اور یہ دولت، یہ رتبے — یہ تیری جفا سے اُڑے ہیں شرارے

جو ہیں تاک میں وقت کی لو لگائے — وہ گنتے ہیں موجوں کو دریا کنارے

ہیں بے کار بیٹھے توقع میں دن رات — کہ توڑیں گے وہ آسماں سے ستارے

کرو کام اپنا یقیں اُس پہ رکھو — وہی ہے کہ جو سب کی بگڑی سنوارے

زمانہ، زمانے کے اطوار بدلے — ہے ممکن کہ پھر جائیں دن بھی ہمارے

جو راتیں کٹی ہیں سو بیداریوں میں — محبت میں ہیں خواب میں دن گذارے

اولوالعزم ہے وہ جو موجوں سے کھیلے — تھپیڑوں کو کھا کر بھی ہمت نہ ہارے

یہ سب اہلِ دنیا غرض کے ہیں بندے — نہ یہ ہیں تمہارے نہ یہ ہیں ہمارے

تدبر کے بل پر جو اونچے اُڑے تھے — مقدر سے ہارے وہ سارے کے سارے

محبت میں ہے ہار اور جیت یکساں — جو ہارے سو جیتے، جو جیتے سو ہارے

اگر پار جانا ہے منجدھار میں کود

یہ کب تک چلے گا کنارے کنارے

تبصرے

آثاراتِ پھلواری شریف موسوم بہ اعیانِ وطن

از جناب مولانا حکیم سید شاہ محمد شعیب صاحب نیر تقطیع کلاں، ضخامت ۴۳۴ صفحات، طباعت وکتابت بہتر قیمت چھ روپیہ، پتہ: مہتمم صاحب دارالاشاعت خانقاہ مجیبیہ پھلواری شریف ضلع پٹنہ۔

پھلواری شریف صوبہ بہار کا مشہور مردم خیز خطہ ہے جہاں بڑے بڑے علماء، صلحاء، اور مشائخ و اولیاء پیدا ہوئے اور جنہوں نے اپنے علمی و عملی اور اخلاقی و روحانی فیوض وکمالات سے پورب کے مسلمانوں کو بڑا فائدہ پہنچایا موجودہ زمانہ میں بھی وہاں کی خانقاہ مجیبیہ صوبہ بہار کے مسلمانوں کے لئے خصوصاً اور دوسرے صوبوں کے مسلمانوں کے لئے عموماً مرجع خواص وعوام ہے۔ اہلِ دین اور اربابِ ولایت کے علاوہ اس قصبہ نے جدید تعلیم کی بھی بہت سی نمایاں شخصیتیں پیدا کیں جو اگرچہ جدید تعلیم کی پیداوار تھیں لیکن چوں کہ ان کی تعلیم و تربیت کا سامان خانقاہ مجیبیہ کی ہی طرف سے اور اسی کے زیر اثر ہوا تھا اس بناء پر بڑے بڑے سرکاری عہدوں پر فائز ہونے کے باوجود ان میں بھی وہی اسلامی اخلاق وآداب اور اور وہی مکارم واطوار تھے جو صلحا کا شعار ہیں۔ ضرورت تھی کہ اس قصبہ کے ان بزرگوں کے حالات وسوانح مرتب کئے جاتے تاکہ اخلاف کے لئے وہ سرمایۂ عبرت وبصیرت ہوتے اور تاریخ کے ایک اہم گوشہ کی بھی خانہ پری ہوتی، خوشی کی بات ہے۔ کچھ اس ضرورت کی طرف مولانا حکیم سید شاہ محمد شعیب صاحب نے توجہ فرمائی جو ایک ممتاز عالم و فاضل اور خانقاہ کے تربیت یافتہ خصوصی ہونے کے علاوہ تذکرہ نویسی کا صاف ستھرا اور سنجیدہ ذوق بھی رکھتے ہیں، چنانچہ زیر تبصرہ کتاب میں جو پھلواری شریف کی تقریباً دو سو سال کی

تاریخ پر مشتمل ہے دو سو چالیس اعیانِ قصبہ کے حالات و سوانح بیان کئے گئے ہیں تخصی اور خاندانی حالات کے علاوہ خانقاہ کے مشائخ کے معمولات۔ سلسلہ کے متصوفانہ اعمال و افعال۔ طور طریق اور رسوم پھلواری شریف کے آثارِ دیرینہ۔ مقابرہ مزارات اور اوقاف و مساجد وغیرہا کے مستند تاریخی حالات وکوائف بھی بیان ہو گئے ہیں اس حیثیت سے یہ کتاب صرف ایک تذکرہ نہیں بلکہ اٹھارویں اور انیسویں صدی عیسوی کے ہندوستان کی تاریخ کے بعض گوشوں پر بھی روشنی ڈالتی ہے اور اس عہد سے متعلق سماجی اور تمدنی و تہذیبی مفید معلومات بھی حاصل ہوتی ہیں، شروع میں جناب مولانا سید مناظر احسن صاحب گیلانی کے قلم سے ایک دلچسپ اور بصیرت افروز مقدمہ ہے امید ہے کہ اربابِ ذوق اس کے مطالعہ سے مستفید اور محظوظ ہوں گے۔

تاریخ علم حدیث از مولانا مفتی سید عمیم الاحسان صاحب مجددی تقطیع خورد کتابت وطباعت بہتر ضخامت ۱۲۰ صفحات قیمت عہ پتہ:۔ قرآن منزل۔ بابو بازار ڈھاکہ۔

اس کتاب کی حیثیت ان نوٹوں کی سی ہی ہے جو کوئی استاد کلاس میں طلباء کو سکھاتا ہے یا خود بہ طور یادداشت انھیں لکھ لیتا ہے چنانچہ تاریخ علم حدیث سے متعلق تقریباً تمام معلومات مثلاً علم حدیث کے مختلف ادوار۔ ہر دور کے مشہور ائمہ فن کے حالات ان کے مرتب کئے ہوئے مجموعہائے حدیث کا تعارف۔ تدوین و کتابت حدیث۔ علوم متعلقہ حدیث ان سب مسائل و مباحث کا مختصر مختصر تذکرہ آگیا ہے۔ حدیث سے متعلق بعض خاص مباحث پر مولانا سید مناظر احسن گیلانی۔ مولانا ابو المآثر حبیب الرحمٰن اعظمی اور ڈاکٹر محمد زبیر صدیقی کی کتابیں بہت مبسوط۔ مفصل اور محققانہ ہیں، زیر تبصرہ کتاب حدیث کے عام طلباء اور اساتذہ کے لئے مفید ہوگی اور ان کے لئے حدیث پر جامع معلومات کی ایک نوٹ بک کا کام دے گی!!

تحقیقی مطالعے از ڈاکٹر نذیر احمد تقطیع خورد ضخامت ۱۶۰ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ:۔ دانش محل امین الدولہ پارک لکھنؤ۔

خوشی کی بات ہے کہ اردو اور فارسی کی موجودہ کساد بازاری کے دور میں ڈاکٹر نذیر احمد لکھنؤ یونیورسٹی کی شکل میں آسمانِ تحقیق پر ایک نیا ستارہ طلوع ہوا ہے۔ موصوف کی تحقیق کا خاص موضوع ظہوری ہے جس پر ان کو لکھنؤ یونیورسٹی سے ڈاکٹر کی ڈگری مل چکی ہے ظہوری پر ریسرچ کے سلسلے میں ہی انھوں نے ابراہیم عادل شاہ ثانی کے عہد کے ادبی و شعری کارناموں اور ان سے متعلق بعض مباحث کی طرف توجہ کی اور اس تقریب سے متعدد مقالات و مضامین بھی مختلف بلند پایہ رسالوں میں شائع کرتے رہے یہ کتاب موصوف کے چھ مقالات کا مجموعہ ہے جن میں سے پانچ مقالات تو ان کے اصل موضوعِ تحقیق کے سلسلہ کی کڑی ہیں۔ چھٹا مقالہ "معدن الشفائے سکندر شاہی" پر ہے۔ ان تمام مقالات میں لائق مصنف نے جودادِ تحقیق دی ہے وہ پڑھنے اور دیکھنے سے تعلق رکھتی ہے جو حضرات اردو، فارسی ادب پر ریسرچ کا ذوق رکھتے ہیں، انکے لئے ان مقالات کا مطالعہ خاص طور پر دلچسپی اور بصیرت کا سبب ہوگا!

نقدِ اقبال از جناب میکش اکبر آبادی تقطیع خورد ضخامت ۲۱۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد تین روپیے پتہ :- کتاب خانہ دانش محل - امین الدولہ پارک لکھنؤ

جیساکہ نام سے ظاہر ہوتا ہے کہنے کو یہ کتاب ڈاکٹر اقبال مرحوم کے افکار کا نقد ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کا نام صرف بہ طور پس منظر کے استعمال ہوا ہے ورنہ اس کا موضوع وحدت الوجود ہے مصنف نے شروع میں ایک عمومی دعوی کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب کے افکار و نظریات میں تضاد پایا جاتا ہے پھر بہ طور مثال انھوں نے وحدت الوجود کے مسئلہ کو پیش کیا ہے کہ ڈاکٹر صاحب پہلے اس کے قائل نہیں تھے اور سمجھتے تھے کہ اس عقیدہ کا اثر ترکِ عمل۔ سکون اور عدمِ حرکت ہوتا ہے لیکن بعد میں ان کی یہ غلط فہمی دور ہوگئی تو وہ وحدت الوجود کے قائل ہوگئے۔ اس تقریب سے لائق مصنف نے وحدت الوجود کے موضوع پر بڑا سیر حاصل اور مبسوط و مفصل کلام کیا ہے اور ہند و فلسفہ۔ شیخ محی الدین ابن عربی کا نظریہ ان دونوں کی تفصیل و توضیح اور ان سے متعلقہ ضمنی مباحث پر کلام کرنے کے بعد تصوف

مجدد الف ثانی اور ان کے بعد حضرت شاہ ولی اللہ اور دوسرے علما و صوفیا کے نظریہ شہود اور افلاطون کے نظریہ اعیانِ ثابتہ پر گفتگو کی ہے۔ اس لحاظ سے یہ کتاب فلسفہ کے ایک خاص موضوعِ بحث پر مفید اور متنوع معلومات کا ایک دلچسپ مجموعہ ہے۔ مصنف نے جو کچھ لکھا ہے کافی مطالعہ اور غور و فکر کے بعد سوچ سمجھ کر لکھا ہے اور بڑی بات یہ ہے کہ ان کی رائے میں یا اندازِ نگارش میں کہیں بے اعتدالی اور تیزی نہیں پائی جاتی۔ فلسفہ کے طلبار کو خاص طور سے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے

نصرۃ القرآن عن آیات الرحمن

از جناب عبد الحمید خاں صاحب ارشد۔ تقطیع متوسط ضخامت ۳۲۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت مجلد پانچ روپیہ ۸ /۔ پتہ :- عبد المجید صاحب صدیقی یونائیٹڈ مجید موٹر کمپنی۔ بندر روڈ کراچی

پہلے سے انکارِ حدیث کا فتنہ ہی کچھ کم نہ تھا کہ اب ماحول کو غالباً اپنا سازگار پا کر اہلِ قرآن نے اپنے عقائد و افکارِ باطلہ کی اشاعت کی رفتار تیز تر کر دی ہے اور اب ان کی دست درازیوں کا یہ عالم ہے کہ قرآن مجید کی مزعومہ حمایت و نصرت کی آڑ میں سرے سے دین پر ہی ہاتھ صاف کرنا شروع کر دیا ہے۔ چنانچہ ان لوگوں کے ہاں نمازیں پانچ وقت کی نہیں صرف دو وقت کی فرض ہیں باقی نوافل ہیں جنت سلسلۂ ارتقا میں آگے بڑھ جانا اور جہنم سلسلۂ ارتقا میں رک جانا ہے۔ بعث بعد الموت یعنی آخرت کوئی چیز نہیں۔ قربانی ایک فعل عبث اور سر تا سر تضیعِ مال ہے۔ غرض کہ کفر و ایمان کے درمیان اب کوئی شے حائل نہیں رہی اہلِ قرآن کے یہ افکار ہیں جن کا اب وہ بڑے زور شور سے پروپگنڈہ کر رہے ہیں زیرِ تبصرہ کتاب انھیں افکار کی مدلل تردید میں لکھی گئی ہے جو ایک سلیم الطبع انسان کے لئے ہدایت کا باعث ہو سکتی ہے مصنف نے جس درد اور سوز و گداز سے یہ کتاب لکھی ہے وہ ان کی حرارتِ ایمانی کی دلیل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کو اس کا اجر عطا فرمائے لیکن ضرورت ہے کہ پاکستان کے اور علما اور صحیح الفکر اربابِ قلم بھی اس فتنہ کے انسداد کی طرف توجہ فرمائیں اور اس سلسلہ میں کوئی منظم کوشش کریں۔

سراپائے رسول

از جناب اعجاز الحق قدوسی، تقطیع خورد ضخامت ۱۱۲ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۴ر پتہ:۔ مکتبہ نشاۃ ثانیہ حیدرآباد دکن

یہ کتاب بچوں اور بچیوں کے لئے لکھی گئی ہے جس میں آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک۔ آپ کے معمولات عادات وخصائل، اخلاق ومکارم، طعام ولباس کو پسندیدہ چیزیں اور عبادات وغیرہ سہل وسلیس اور عام فہم زبان میں لکھی گئی ہیں مکاتب ومدارس کے علاوہ متوسط درجہ کی اردو استعداد رکھنے والے بھی اس سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں، واقعات سب مستند ہیں اور انداز بیان دل نشین ہے۔

الدر الثمین پر ایک نظر

از جناب ابو تمکین افتخار احمد تقطیع خورد ضخامت ۱۸۸ صفحات کتابت وطباعت متوسط درجہ کی قیمت عہ پتہ:۔ مکتبہ ایوان اشاعت آرام باغ روڈ کراچی نمبر ۱

مولانا تمنا عمادی مجیبی نے "الدر الثمین لملک الیمین" کے نام سے چند سال ہوئے ایک کتاب لکھی تھی جس میں اسلام میں غلامی کے مسئلہ سے متعلق اپنے متجددانہ خیالات ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا کہ اسلام میں باندیوں سے استمتاع بغیر نکاح کے جائز ہی نہیں ہے جناب ابو تمکین صاحب نے زیر تبصرہ کتاب میں اسی الدر الثمین پر تعقبات وایرادات کیے ہیں جیسا کہ موصوف نے خود لکھا ہے بعض ناگزیر حالات کے باعث ان کو باقاعدہ مرتب شکل میں کتاب لکھنے کا موقع نہیں ملا اور اس کتاب کی حیثیت چند نوٹوں اور یادداشتوں کی ہے تاہم ملک یمین کے مسئلہ پر علمی حیثیت سے بہت سی باتیں کام کی اور مفید آگئی ہیں جن لوگوں کو اس مسئلہ پر مطالعہ کا ذوق ہو ان کو یہ کتاب ضرور پڑھنی چاہیے۔

قرآن اور تعمیر سیرت

از ڈاکٹر میر ولی الدین، صاحب، ایم۔ اے۔ پی۔ ایچ۔ ڈی۔ صدر شعبہ فلسفہ جامعہ عثمانیہ

قرآنی تعلیمات کا انسانی سیرت کی تعمیر میں کیا دخل ہے اور ان تعلیمات کے ذریعہ سے اس کردار و سیرت کا کس طرح ظہور ہوتا ہے؟ یہ گراں قدر تالیف خاص اس موضوع پر تیار کی گئی ہے،

ایک ایسے وقت میں جب کہ مسلمان عام طور پر احساسِ کمتری اور بے یقینی کی اندھیریوں میں پھنسے ہوئے ہیں یہ گراں مایہ تالیف ان کے روحانی رشتے کو استوار کرنے میں "چراغِ راہ" کا کام دے گی۔

سچ تو یہ ہے گرامی قدر مؤلف نے اس کتاب میں تعلیمات قرآنی کا عطر کشید کر کے رکھ دیا ہے، اور پھر اس میں فلسفہ، تصوف اور ادب کو بڑی قابلیت سے سمویا ہے۔

"قرآن اور تعمیر سیرت" اپنے انداز کی لاثانی کتاب ہے، جس کی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ مطالعہ کے بعد ہی ہو سکتا ہے۔ فہرست مضامین کا ایک حصہ ملاحظہ فرمائیے

(۱) عبادت و استعانت (۲) توحید الوہیت (۳) صالحیت (۴) نیکی علم ہے۔
(۵) تعلیم کا مقصد (۶) انسانِ کامل (۷) تصحیح فکر (۸) قرآن اور سیرت سازی
(۹) قوتِ ایمانی اور ظہور غیب (۱۰) ماحول پر کس طرح قابو حاصل کیا جائے۔
(۱۱) کامیاب زندگی کا قرآنی تصور (۱۲) قرآن اور علاج خوف (۱۳) قرآن اور علاج حزن
(۱۴) قرآن اور علاجِ غضب (۱۵) زندگی میں غم کیوں ہے۔

کتابت و طباعت نہایت اعلیٰ، دیکھنے کے لائق بڑی تقطیع صفحات ۳۲۰ قیمت غیر مجلد پانچ روپے، مجلد چھ روپے،

مکتبہ برہان اردو بازار جامع مسجد دہلی نمبر ۶

بُرہان

جلد ۳۳ شمارہ ۳

ستمبر ۱۹۵۴ء مطابق محرم الحرام ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

افسوس ہے پچھلے دنوں مولانا مفتی حافظ عبد اللطیف صاحب ناظم مدرسہ مظاہر العلوم سہارنپور نے چند ماہ کی علالت کے بعد وفات پائی۔ جناب مفتی صاحب صاحبِ علم تھے اور صاحبِ باطن بھی۔ فقہ کی جزئیات پر بڑی گہری اور وسیع نظر رکھتے تھے۔ اخلاق و عادات اور مکارم و شمائلِ ذاتی کے اعتبار سے سلف صالحین کا نمونہ تھے ان کی حسن قابلیت و انتظام کا ثبوت اس سے زیادہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ گذشتہ چند برسوں میں وہ تیز و تند آندھیوں میں بھی مدرسہ کا چراغ جلائے بیٹھے رہے اور اس کو بہر طور قائم و زندہ رکھا، مدرسہ کے ساتھ آں مرحوم کو محبت نہیں عشق تھا۔ چنانچہ اسی کی خاطر انھوں نے پیرانہ سالی اور ضعف و نقاہت کے باوجود پچھلے دنوں برما کا طویل و صبر آزما سفر کیا اور اگرچہ وہاں سے کامیاب و بامراد واپس ہوئے لیکن اپنے ساتھ ایک عارضہ لگا لائے اور آخر اسی عارضہ میں جان جان آفریں کو سپرد کر کے راہی ملک بقا ہو گئے رحمہ اللہ رحمۃً واسعۃً

ارباب علم و ادب کے حلقہ میں یہ خبر بھی افسوس اور رنج کے ساتھ سنی جائے گی کہ بروز جمعہ ۳۰ جولائی کو صبح کے چار بجے شمس العلماء مولانا الحاج عبد الرحمٰن سابق صدر شعبۂ عربی و فارسی دہلی یونیورسٹی نے کراچی میں وفات پائی۔ مولانا تقسیم سے کچھ پہلے سے گوشہ نشین ہو کر بیٹھ گئے تھے۔ ورنہ ایک زمانہ میں ان کی بڑی شہرت تھی اور ادارۂ معارف اسلامیہ اور اورنٹیل کانفرنس وغیرہ علمی انجمنوں کے جلسوں میں ان کے مقالات کی دھوم ہوتی تھی، طرز قدیم کے تعلیم یافتہ تھے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد اول لاہور میں کوئی معمولی سی ملازمت کی اور وہیں کے قیام کے زمانہ میں "پیسہ اخبار" کے لئے مقدمہ ابن خلدون کا اردو ترجمہ کیا۔ اس ترجمہ کو شائع ہوئے کچھ دن ہی ہوئے تھے کہ دہلی کے سینٹ اسٹیفنس کالج میں عربی لکچرر کی جگہ خالی ہوئی۔ مولانا نے یہ سمجھ کر کہ اس جگہ پر کسی ایم۔اے کا ہی تقرر

ہو گا خود کوئی درخواست نہیں بھیجی۔ لیکن مولانا کے ایک دوست نے ازخود مولانا کی طرف سے درخواست لکھ کر دلی روانہ کر دی اور درخواست کے ساتھ مقدمہ ابن خلدون کے اردو ترجمہ کا ایک نسخہ بھی منسلک کر دیا اس کے بعد کالج کی انتخابی کمیٹی کا جلسہ ہوا تو اس کے ایک ممبر مولوی نذیر احمد دہلوی مرحوم بھی تھے، ظاہر ہے کہ ترجمہ مقدمہ ابن خلدون کا قدردان مولوی صاحب سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا تھا۔ انھوں نے جب اس کو دیکھا تو پھڑک گئے اور کمیٹی سے کہا کہ اگرچہ امیدواروں میں بڑے بڑے ایم۔ اے اور پی۔ ایچ ڈی ہیں لیکن عبدالرحمن کو کوئی نہیں پہنچتا آخر مولوی نذیر احمد مرحوم کی رائے پر ہی فیصلہ ہو گیا۔ اب مولانا کو لاہور میں اچانک تقرر نامہ ملا تو سخت حیرت زدہ ہوئے بعد میں ان کو اصل واقعہ کی پوری صورت حال کا علم ہوا۔ بہرحال مولانا یہاں تشریف لے آئے اور آخر تقریباً تیس سال کی ملازمت کے بعد ۳۹ء میں کالج کی ملازمت سے بڑی عزت و ناموری کے ساتھ سبکدوش ہوئے۔

مولانا اگرچہ کالج میں عربی اور فارسی کے لکچرر تھے اور کالج کی ملازمت سے سبکدوش ہونے تک دہلی یونیورسٹی میں اس شعبہ کے صدر بھی رہے۔ لیکن ہندوستان میں مغلیہ سلطنت کے عہد کے بڑے نامور مورخ اور محقق بھی تھے چنانچہ عربی فارسی کے ساتھ برسوں تک تاریخ میں ایم۔ اے کلاس کو مغلیہ دورِ حکومت پر لکچر بھی دیتے رہے۔ مولانا کے یہ لکچر اس قدر پراز معلومات۔ محققانہ اور بصیرت افروز ہوتے تھے کہ کالج کے پرنسپل اور تاریخ کے پروفیسر ڈاکٹر اسپیئر بھی کبھی کبھی لکچر سننے آتے تھے اس کے علاوہ کالج کے جو طلبا رتاریخ میں پی۔ ایچ۔ ڈی کرنے کے لئے کیمبرج یا آکسفورڈ یونیورسٹی جاتے تھے وہ بھی وہاں سے برابر مولانا سے خط و کتابت کے ذریعہ علمی استفادہ کرتے رہتے تھے۔ چنانچہ مولانا کے ایک تلمیذ خاص ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی حال وزیر تعلیم پاکستان گورنمنٹ نے اپنی مشہور کتاب "دہلی سلطنت" میں اس کا بڑی شکرگزاری کے ساتھ تذکرہ بھی کیا ہے۔ کسی بحث کے متعلق وہ کوئی رائے بڑی تحقیق و تدقیق اور کامل غور و خوض کے بعد قائم کرتے تھے مگر جب ایک

رائے قائم کر لیتے تھے تو پھر کوئی شخص ان کو اس رائے سے ہٹا نہیں سکتا تھا - عربی شعر و ادب اور اسلامی تاریخ پر بھی بڑی گہری اور دقیقہ رس نگاہ رکھتے تھے ۔ ۱۹۲۹ء میں لندن کی اورینٹل کانفرنس میں دہلی یونیورسٹی کے نمائندہ کی حیثیت سے شرکت کی اور پروفیسر مارگولیتھ کے بالمقابل "شعر جاہلی پر عربی زبان میں ایسا شاندار اور محققانہ مقالہ پڑھا کہ خود مارگولیتھ نے اس کی داد دی - اور جب مولانا لندن سے واپسی میں چند روز کے لئے مصر میں قیام فرما ہوتے تو مولانا کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ ان کے پہنچنے سے قبل ان کے مقالہ کی شہرت مصر پہنچ چکی تھی جس کا ثبوت یہ ہے کہ ڈاکٹر طٰہٰ حسین خود مولانا سے ملنے ان کے ہوٹل میں آئے اور ڈنر پر مدعو کیا اور مصر کے اخبارات و رسائل نے بھی مولانا کے فوٹو کے ساتھ ان کے مقالہ کے بعض اجزا شائع کئے مولانا مصر سے حجاز مقدس گئے اور وہاں زیارت حرمین شریفین کی سعادت سے بہرہ اندوز ہو کر دہلی واپس آ گئے ۔

اردو زبان کے صاحب طرز ادیب تھے - چنانچہ مرحوم کی کتاب "مرآۃ الشعر" اس بات کی غمازی کرتی ہے کہ مولوی محمد حسین آزاد اور مولوی نذیر احمد دہلوی دونوں کے طرز انشار نے مل جل کر مولانا عبد الرحمٰن مرحوم کے طرز نگارش کا روپ دھارا تھا۔ جب ان کی کتاب مراۃ الشعر چھپی ہے تو اردو زبان کی دنیائے شعر و ادب میں ایک بھونچال سا آ گیا تھا اور ملک کی ادبی فضا صدائے تحسین و مرحبا کے نعروں سے گونج اٹھی تھی۔

مولانا کے ساتھ راقم الحروف کے تعلق کا آغاز اگرچہ بحیثیت استاد و شاگرد ہوا لیکن جلد ہی یہ تعلق فرزندی و پدری تعلق کی طرح مقدس ۔ استوار اور پختہ ہو گیا اور الحمد للہ کہ ان کے آخری سانس تک رہا اس لئے مولانا کے علمی و ادبی کمالات اور اخلاق و شمائل پر ایک مستقل مقالہ لکھنے کا ارادہ ہے سطور بالا کا مقصد صرف اس حادثۂ فاجعہ کی اطلاع و اعلام ہے ۔ اللہ تعالیٰ آں مرحوم کو جنت الفردوس میں مقام جلیل عطا فرمائے اور ان کی قبر ٹھنڈی رکھے کہ یوں بھی بڑے متقی ۔ متشرع ۔ پابند وضع اور انتہائی بامروت و صاحب خلق عمیم الشان تھے ۔

مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

از

(سعید احمد)

(۴)

تفسیر علوم دینیہ میں سب سے اہم اور مقدم علم تفسیر ہے۔ بعض علما کا قول ہے کہ تفسیر سفر کا مقلوب ہے۔ لیکن علامہ محمود آلوسی نے اس قول کے متعلق بڑا بلیغ فقرہ لکھا ہے۔

والقول بانہ مقلوب السفر مما لا یسفر لہ وجہ

اور یہ کہنا کہ تفسیر سفر کا مقلوب ہے ایک ایسا قول ہے جس کا چہرہ کھلا ہوا نہیں ہے یا جس کی وجہ ظاہر نہیں ہے۔

حق یہی ہے کہ یہ فسر سے مشتق ہے۔ فسر کے معنی لغت میں بیان وکشف کے آتے ہیں اصطلاحاً تفسیر اس علم کا نام ہے جس میں قرآن مجید کے الفاظ کے نطق کی کیفیت۔ الفاظ کے مدلولات۔ ان کے احکام افرادیہ وترکیبیہ۔ معانی جن پر کہ وہ بحالت ترکیب محمول کئے جاتے ہیں اور اس سلسلہ کی اور دوسری چیزیں مثلاً محکم ومتشابہ۔ ناسخ ومنسوخ، اسباب نزول، امثال وقصص، احکام ومسائل وغیرہا معلوم کرنا دوسرے لفظوں میں مختصر طور پر کہا جا سکتا ہے کہ تفسیر وہ علم ہے جس کے ذریعہ قرآن مجید کو سمجھا جائے اس بناء پر ظاہر ہے کہ قرآن مجید میں جو کچھ ہے اس کو سمجھنے کا نام تفسیر ہوگا۔ اب ہم کو یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید میں کیا کیا ہے اور ان میں سے ہر ایک کو کس طرح پر سمجھا جا سکتا ہے۔

پہلے سوال کا جواب یہ ہے کہ قرآن مجید حسب ذیل مضامین پر مشتمل ہے

(۱) مابعد الطبعیاتی مسائل: مثلاً صفات باری تعالیٰ، جنت ودوزخ، حشر ونشر، ملائکہ وغیرہا کا ذکر

(۲) اوامر ونواہی:۔ عبادات۔ احکام ومسائل۔ محرمات ومنہیات۔ مباحات۔ مندوبات ومستحبات

(۳) قصص:- پیغمبروں کے۔ قوموں کے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد سے متعلق واقعات وحکایات۔

(۴) امثال:- نیک لوگوں کے۔ برے لوگوں کے۔ علم اور جہل کے۔ ایمان اور کفر کے وغیرہ

(۵) کتب قدیمہ کا بیان ان کی بعض تعلیمات کا تذکرہ۔

قرآن مجید کے مابعد الطبعیاتی مسائل اس قسم کے مسائل کے متعلق بنیادی طور پر یہ بات ذہن نشین ہونی چاہئے کہ چونکہ ان کا تعلق ماورائے عالم طبعیات و مادیات سے ہے اس بنا پر اس عالم کی حقیقتوں کو سمجھانے کے لئے جو پیرایۂ بیان اختیار کیا جائے گا وہ لامحالہ ہمارے عالم مادیات کے ہی مناسب ہوگا۔ یہ عالم مابعد الطبعیات تو بہت دور کی چیز ہے۔ ہم خود اپنے محسوسات معنوی و باطنی کو جب ظاہر کرتے ہیں تو غم کو نشتر۔ خنجر۔ دشنہ۔ پہاڑ اور مسرت کو گل و شبنم۔ آبشار و نسیم کے لفظوں سے سمجھاتے ہیں اور یہ صرف استعارہ ہوتا ہے اس کے معنیٰ یہ ہرگز نہیں ہوتے کہ غم سچ مچ ایک نشتر ہے اور خوشی درحقیقت کوئی پھول ہے۔ پس اسی طرح سمجھنا چاہیئے کہ خدا کے صفات مثلاً علم و بصر۔ سمع وخبیر۔ بطش و قدرت۔ ید و استوا یا جنت کے لذائذ و نعم۔ دوزخ کے عذاب و عقاب۔ ان سب کی اصل حقیقت کیا ہے ان سب کا علم سوائے خدا کے یا رسول کے اور کسی کو نہیں ہے اور ہم جس طرح خدا پر ایمان لانے کے مکلف ہیں مگر اس کی ذات کو جاننے کے نہیں ہیں۔ کیونکہ وہ ہماری استطاعت سے خارج ہے اسی طرح ہم ان سب حقائق مابعد الطبعیات پر ایمان لانے کے مکلف ہیں لیکن ان کو جاننے اور سمجھنے کے مکلف نہیں۔ اب اگر کوئی شخص ان پر بحث کرتا ہے اور ان کی سراغ رسانی کی کوشش کرتا ہے تو اس کا یہ فعل فلسفہ اور سائنس کے دائرہ میں آسکتا ہے، تفسیر سے اور قرآن فہمی سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے یہ سب امور مذہب کے اصول موضوعہ ہیں اور اصول موضوعہ میں چون وچرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ قرآن مجید کی آیت اِنَّمَا الْاٰیٰتُ عِنْدَ اللّٰہِ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ اور وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ اٰمَنَّا بِهٖ میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے اقبالؔ نے کیا خوب کہا ہے۔

عقل و دل و نگاہ کا مرشدِ اولیں ہے عشق   عشق نہ ہو تو شرع و دیں بتکدۂ تصورات

فلسفہ و سائنس کو جس قدر ترقی ہوتی جاتی ہے اسی قدر یہ حقیقت اپنی جگہ روشن سے روشن تر ہوتی جاتی ہے کہ ادراک کا ذریعہ صرف عقل ہی نہیں ہے بلکہ اس سے بھی اونچا ایک اور ذریعہ ادراک ہے اور اس کا نام وجدان ہے جس کو قرآن مجید نے لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ بِهَا فرما کر فقہ سے تعبیر کیا ہے اور جس کو ہم اردو زبان میں "دل میں آنا" سے تعبیر کر سکتے ہیں۔ چنانچہ اکبر الہ آبادی اللہ تعالیٰ کی نسبت فرماتے ہیں۔

تو دل میں تو آتا ہے سمجھ میں نہیں آتا   بس جان گیا میں تری پہچان یہی ہے

عقل کے ذریعہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ حصولی ہوتا ہے یعنی بواسطہ صور اشیا اس کے بالمقابل وجدان سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ حضوری ہوتا ہے یعنی بلا واسطہ۔ اس بنا پر ظاہر ہے جو پختگی۔ استواری اور عمل میں سرگرمی و سرجوشی دوسرے سے ہو سکتی ہے پہلے سے نہیں ہو سکتی اقبال کہتے ہیں۔

عقل گو آستاں سے دور نہیں   اس کی تقدیر میں حضور نہیں

دلِ بینا بھی کر خدا سے طلب   آنکھ کا نور دل کا نور نہیں

ایک غلط فہمی کا ازالہ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ "القرآن ذوشجون وفنون وظہور وبطون" اس سے اور بعض اسی طرح کے دوسرے بزرگوں کے ارشادات سے بعض حضرات نے یہ سمجھا ہے کہ ہر آیت کے دو مطلب ہوتے ہیں۔ ایک ظاہر اور ایک باطن۔ پھر اسی پر بس نہیں بلکہ جیسا کہ علامہ محمود آلوسی نے نقل کیا ہے بعض کے نزدیک لکل آیۃ ستون الف فہم (روح المعانی ج ا ص ۷) یعنی ہر آیت کے ساٹھ ہزار مطلب ہوتے ہیں اس نقطۂ خیال کی اشاعت اس شد و مد اور زور شور کے ساتھ کی گئی ہے کہ قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ علیہ ایسے بلند پایہ مفسرین بھی کہیں کہیں اسی طرز پر تفسیر بیان کر دیتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس خیال سے دین کے نظام فکر کو جو نقصانِ عظیم پہنچا ہے وہ ناقابل تلافی ہے قرآن سراپا نور و ہدایت ہے وہ یقین واذعان

پیدا کرتا ہے اور شکوک و شبہات بے یقینی اور تردد و تذبذب کا قلع قمع کر دیتا ہے۔ اس بنا پر اگر یہ مان لیا جائے کہ ہر آیت کے دو مطلب ہوتے ہیں ایک ظاہر اور ایک باطن۔ ظاہر وہ جو ظاہر آیت سے متبادر ہوتا ہے اور باطن وہ جو ہمیں نہیں معلوم۔ اور اگر معلوم بھی ہو تو ہم اسے صرف ظنی و تخمینی اور قیاس و گمان سے ہی معلوم کر سکتے ہیں اس بنا پر وہ صرف ظنی ہوگا قطعی اور یقینی نہیں۔ تو اب لامحالہ قرآن کی آیت سے ظاہری طور پر ہم نے جو کچھ مطلب سمجھا ہے اس میں یقین پیدا کرنے اور اس کے ذریعہ سے محرک عمل ہونے کی صلاحیت و قوت بہت مضمحل اور کم زور ہو جاتی ہے۔ چنانچہ فرقہ باطنیہ ملاحدہ اور متصوفین کے ایک گروہ نے اسی چیز کا سہارا لے کر دین کو اوہام و خرافات کا مجموعہ بنا کر رکھ دیا ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس نے جو کچھ فرمایا اس کا مطلب صرف اس قدر ہے کہ حرف قرآن مجید کی تخصیص نہیں بلکہ ہر کلام کا مطلب ایک تو وہ ہوتا ہے جو فی بطن القائل ہوتا ہے اور دوسرا وہ جو کلام کی خاص ترکیب اور اس کے انسجام و نسق سے سمجھ میں آتا ہے۔ پھر متکلم جتنا بلیغ۔ قادر الکلام اور فصیح البیان ہوگا اور ساتھ ہی مخاطب جس مرتبہ کا عالم۔ صاحب ذوق اور رمز آشنائے بلاغت ہوگا اسی قدر مخاطب کو اس کلام میں بہ نسبت دوسروں کے زیادہ حظ آئے گا اور اس میں اس کو زیادہ دقائق اور اسرار و غوامض نظر آئیں گے لیکن یہ اسرار صرف اسرار ہوں گے جن سے لطف کلام بڑھ جاتا ہے اصل ماسیق لہ الکلام نہیں ہوں گے۔ یہ اسرار و غوامض مفسر کے دائرہ بحث سے خارج چیزیں ہیں اور یہ مدار کلام نہیں ہیں۔

اسی طرح حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ایک روایت ہے کہ

من اراد علم الاولین والآخرین	جو اگلوں اور پچھلوں کے علم کا ارادہ کرے اس کو
فلیتل القرآن	چاہئے کہ قرآن مجید کی تلاوت کرے۔

اس روایت کا بھی بعض لوگوں نے نہایت غلط طریقہ پر مطلب یہ سمجھا ہے کہ دنیا جہان کے علوم و فنون قرآن مجید کے اندر مذکور ہیں۔ چنانچہ زمانہ حال کے ایک مفسر علامہ جوہر طنطاوی نے

تو قرآن مجید کو جدید علوم سائنس کی ایک اعلیٰ کتاب ہی کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور اس سلسلہ میں بعض بڑے دلچسپ لطیفے اور حکایات تک نقل کی جاتی ہیں ۔ مثلاً جب سلطان سلیم نے مصر فتح کیا تو اس زمانہ کے ایک عالم ابن کمال نے وَلَقَدْ كَتَبْنَا فِي الزَّبُورِ مِنْ بَعْدِ الذِّكْرِ أَنَّ الْأَرْضَ يَرِثُهَا عِبَادِيَ الصَّالِحُونَ سے استدلال کیا ۔ یہ اور اسی طرح کے بعض اور لطائف نکات بعد الوقوع کہلاتے ہیں ۔ قرآن مجید کے مقصد نزول اور اس کی اصل غرض وغایت سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے اور نہ یہ چیزیں تفسیر قرآن کے دائرۂ تعریف میں آتی ہیں حضرت عبد اللہ بن مسعود کے مذکورہ بالا ارشاد میں علم سے علم ہدایت ۔ علم صلاح وتقویٰ ۔ یا علم دین شریعت مراد ہے جو شروع آفرینش سے قرن بقرن عہد بہ عہد فکر انسانی اور ضروریات وحوائج تمدنی کے تدریجی ارتقا کے ساتھ ترقی کرتا رہا اور آخر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد میں قرآن مجید پر آکر منتہائے کمال کو پہونچ گیا اس بنا پر اب اگر کسی شخص کو دین کے اس پورے سلسلہ کا علم حاصل کرنا ہے تو اُسے توراۃ ۔ انجیل یا اور کسی صحیفہ پیغمبر کے پڑھنے کی ضرورت نہیں قرآن میں سب کچھ موجود ہے یہ تو ہوا علم الاولین اور چونکہ زمانہ خواہ کتنا ہی ترقی کر جائے بہرحال جہاں تک بنی نوعِ انسان کی دینی واخروی ہدایت و فلاح کا تعلق ہے قرآن پر کسی زمانہ میں اور دنیا کے کسی گوشہ میں بھی اس پر ایک حرف کا اضافہ نہیں کیا جا سکتا ۔ اس بنا پر قرآن میں علم الآخرین بھی ہے ۔ علاوہ بریں اولین وآخرین دونوں سے مراد عہد نبوت محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام سے پہلے کے لوگ بھی مراد ہو سکتے ہیں اس صورت میں اولین وآخرین میں باہم نسبت اضافی ہوگی اور اسی نسبت کے اعتبار سے ان کو اولین وآخرین کہا گیا ہے ۔ ورنہ ہمارے اعتبار سے سب اولین ہیں ۔

اوامر ونواہی قرآن مجید ہدایت ربانی کی کتاب ہے اور اس کا اصل مقصد ایمان وعملِ صالح کی تعلیم دینا ہی ہے اس بنا پر یہ ظاہر ہے کہ قرآن مجید کے اوامر ونواہی اس کی اصل غرض وغایت ہیں اور ان کے علاوہ اور جو کچھ ہے وہ انھیں کے لئے زمین ہموار کرنے کے اور انھیں کی تشریح وتوضیح کے لئے ہے اس سلسلہ میں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ قرآن مجید کے اسلوبِ خاص کے ماتحت کسی حکم کی کیا

اہمیت اور اس کا کیا درجہ ہے۔ پھر اس حکم کی جزئیات اور متعلقہ تفصیلات کے لئے ضروری ہے
کہ قرآن کی آیات کے ساتھ ساتھ ان سے متعلق جو احادیث ہیں ان کو بھی بیان کر دیا جائے۔ تاکہ
قرآن و حدیث کی تطبیق اور دونوں کے ایک ساتھ مطالعہ سے وہ حکم مع اپنی تمام جزئیات و تفصیلات
کے سامنے آجائے عام طور پر تفاسیر کی نسبت یہ شکایت ہے کہ ان میں اول تو احادیث سے اعتنا
کم کیا جاتا ہے اور پھر جو احادیث لائی بھی جاتی ہیں ان میں زیادہ ترضعیف اور بعض اوقات موضوع
تک ہوتی ہیں اور ان سے قرآن کی مراد سمجھنے میں مدد ملنے کے بجائے بعض اوقات سخت نقصانات
اور کجروی کے پیدا ہو جانے کا خطرہ ہوتا ہے۔

قصص | قرآن مجید میں قصص کی غرض و غایت یا تو پیغمبروں کو ان بعض الزامات سے بری قرار
دینا ہے جو خود ان کی قوم نے یا ان کے بعد دوسرے لوگوں نے ان پر عاید کر دیئے تھے یا بعض قصص
کا ذکر جیسا کہ خود قرآن نے کہا ہے لوگوں کی عبرت و بصیرت کے لئے کیا گیا ہے جہاں تک پہلی چیز
کا تعلق ہے افسوس ہے کہ بعض تفاسیر میں اسرائیلی روایات کے پیش نظر خود پیغمبروں کی طرف ایسی
باتیں منسوب کر دی گئی ہیں جن سے برارت ظاہر کرنے کے لئے قرآن نے وہ واقعہ بیان ہی کیا تھا
مثلاً حضرت داؤد علیہ السلام کے ننانوے اور ایک بکری والے مقدمہ میں۔ علاوہ بریں اکثر و بیشتر قصص
وہ ہیں جو عہد نامہ قدیم و جدید میں سے کسی ایک میں بھی بیان کئے گئے ہیں اگر اجمال و تفصیل کا یا بعض
اجزار واقعہ کا اور بعض جگہ اصل حقیقت واقعہ کا ہی فرق و اختلاف ہے تفسیر کے ایک طالب علم کا فرض
ہے کہ وہ ان قصص کا مطالعہ تقابلی طور پر کرے تاکہ ایک طرف قرآن مجید کا کتب الٰہیہ کے لئے مصدق
ہونا ثابت ہو اور دوسری جانب یہ معلوم ہو سکے کہ کتب قدیمہ کے موجودہ نسخوں میں کس قدر تحریف
ہوتی ہے اور اس تحریف کی وجہ سے انبیائے کرام کی طرف کس درجہ رکیک اور شرمناک واقعات
منسوب ہو گئے ہیں۔ اگر اس حقیقت کو ابھارا جائے اور ٹھوس تاریخی تحقیقات کی روشنی میں
قرآن مجید کے اس امتیاز کو اہل کتاب کے سامنے پیش کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ قرآن مجید کی عظمت
اور اس کی حقانیت کا نقش ان کے دل و دماغ پر ثبت نہ ہو قرآن مجید کا یہ وہ حصہ ہے جس کو ہم

تاریخی اور جغرافیائی حصہ کہہ سکتے ہیں دعوت الی الدین اور استقامت علی الدین کی تحریک کے سلسلہ میں یہ جس قدر ضروری ہے ظاہر ہے۔

کتب قدیمہ | قرآن مجید میں کتب قدیمہ الٰہیہ اور ان کے بعض مضامین کا تذکرہ اور جن پیغمبروں پر یہ کتابیں نازل ہوئیں ان کے چیدہ چیدہ واقعات کا ذکر قرآن مجید میں بار بار مختلف طریقوں سے اور ایک عجیب انداز سے آیا ہے۔ قرآن اپنے آپ کو ان سب کتابوں کا مصدق کہتا ہے ان تمام پیغمبروں پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتا ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں کے ذہن میں وحدتِ دین کا تصور پیدا ہو شریعتِ محمدیہ کو وہ دین کے مسلسل نظام کی ہی ایک کڑی سمجھیں اور اس بنا پر ان کو اس کے قبول کر لینے میں تامل اور جھجک نہ ہو۔

حقیقت یہ ہے کہ یہ باب دعوتِ محمدی کا ایک بہت اہم باب ہے۔ مگر افسوس ہے کہ جس قدر اہم ہے اسی قدر اس کی طرف اعتنا کم کیا گیا ہے قرآن مجید کے ان ارشادات کی روشنی میں مفسرین کا فرض تھا کہ وہ کتب قدیمہ کا بنظرِ غائر مطالعہ کرتے ان میں جو باتیں قرآن مجید کے ساتھ مطابقت رکھتی ہیں ان کی نشان دہی کرتے اور جو باتیں ان کے مخالف ہیں کتب قدیمہ کی تاریخ تدوین و ترتیب کی روشنی میں ان کا الحاقی ہونا یا غلط ہونا ثابت کرتے اس طرح دوسرے مذاہب کے لوگوں کو اسلام سے وہ بعد یا توحش محسوس نہ ہوتا جو اب ہے۔

ہم غالباً اب تک قرآنِ مجید کی تعلیمات کے اس ایک باب کی اہمیت پوری طرح محسوس نہیں کر سکے ہیں لیکن دوسرے لوگ اس کو کس نظر سے دیکھتے ہیں اس کا اندازہ اس سے ہوگا کہ حال میں ہی امریکہ سے ایک کتاب "مذاہبِ عالم" کے نام سے شائع ہوئی ہے اس کتاب کے مصنف کا اسلام کے ساتھ رویہ اگرچہ دوستانہ اور منصفانہ نہیں ہے چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی سے متعلق اس نے بعض نہایت بے ہودہ اور اشتعال انگیز الفاظ لکھ دیئے ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

"قرآن پیغمبر پیغمبر اور کتاب کتاب میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ اس کی تعلیمات کے مطابق سب پیغمبروں اور

سب کتابوں پر ایمان لانا ضروری ہے، اور وہ ایک پیغمبر کو دوسرے پیغمبر پر فضیلت دینے کا بھی شدید مخالف ہے"

اس کے بعد مصنف نے قرآن مجید کی آیات متعلقہ کا انگریزی ترجمہ نقل کیا ہے اور پھر لکھتا ہے

"بلاشبہ قرآن کی تعلیمات کا یہ پہلو اس قدر صاف واضح اور روشن ہے کہ دنیا کا کوئی مذہب اس کا اس معاملہ میں حریف نہیں ہو سکتا اور سچ یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات کا یہی ایک پہلو ایسا ہے جس کی وجہ سے آج کی دنیا میں کمیونزم کی طرح اسلام سب سے بڑی طاقت ہے جو لوگوں کو بلا امتیازِ نسل و قومیت اپنی طرف کھینچتی ہے۔"

سبحان اللہ! ہم مسلمانوں کا بھی کیا عجیب حال ہے

عالم ہمہ افسانۂ ما ما ہمہ ہیچ

امثال امثال دو قسم کے ہیں ایک وہ جو بطور ضرب الامثال ارشاد فرمائے گئے ہیں جیسے

(۱) ومن یھن اللہ فمالہ من مکرم

(۲) لَیْسَ لَهَا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ كَاشِفَة

(۳) لَا یُجَلِّیْهَا لِوَقْتِهَا اِلَّا هُو

(۴) لکل نبأ مُسْتَقَر

(۵) اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْب وغیرہ وغیرہ اور دوسرے وہ امثال ہیں جو مومنوں، کافروں منافقوں وغیرہم کے لئے بہ طور تشبیہ بیان کئے گئے ہیں یہ سب امثال ان کا فقرہ فقرہ اور لفظ لفظ فصاحت و بلاغت، اعجازِ بیان، حکمت و موعظت۔ اخلاق و نصائح کا معدن و مخزن ہے ان کی عظمت کا صحیح اندازہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب ان سب کا یک جائی مطالعہ کیا جائے اور نامور بلغا و فصحائے عرب کے کلام کے ساتھ ان کا موازنہ کیا جائے۔

حاصل کلام قرآن مجید کے ان معانی و مطالب اور مضامین و حقایق کا ایک سرسری اور اجمالی جائزہ لینے کے بعد اب غور کیجئے کہ مدارس عربیہ میں تفسیر کا جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اس سے ایک طالب علم کو ان مضامین پر کتنا عبور حاصل ہوتا ہے۔ اس کا کتنا وقت فضول اور لایعنی بحثوں

میں مثلاً حروف مقطعات کی اور صفات باری وغیرہا سے متعلق کلامی مباحث میں صرف ہو جاتا ہے اور خود قرآن کے جو اصل مباحث ہیں ان کا کتنا حصہ اس کو معلوم ہوتا ہے پھر چونکہ تفاسیر میں اقوال مرجوحہ و شاذہ سب ہی بیان کر دیئے جاتے ہیں اس بنا پر تفسیر کے ایک طالب علم کو ذہنی طمانیت اور قلبی سکون و یقین کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے بے شبہ علمائے سلف نے جو کچھ کیا وہ اس کے لئے عند اللہ ماجور ہوں گے اور ان کی مساعی ہمارے صد تشکر و امتنان کی مستحق ہیں لیکن تعلیم کے نئے سانچہ اور جدید نظام میں اس خیال کا رکھنا ضروری ہے کہ ایک فن کے مسائل کا تداخل دوسرے فن میں نہ ہو۔ جس طرح منطق و فلسفہ کا درس دیتے وقت قرآن و حدیث کے مسائل کو چھیڑنا ایک لغو اور دور از کار بات ہے اسی طرح قرآن کے درس میں منطق فلسفہ وغیرہ کے مسائل پر گفتگو کرنا بے محل اور بے موقع ہے۔

مدارس عربیہ میں سب سے زیادہ زور قرآن مجید کی تعلیم پر دینا چاہئے تھا لیکن نہایت افسوس کی بات ہے کہ سب سے زیادہ تغافل اسی سے برتا جاتا ہے۔ منطق اور فلسفہ کی کتابیں چار یا پانچ سال تک چلتی رہتی ہیں لیکن تفسیر کا نصاب جلالین اور بیضاوی کے ایک پارہ پر دو سال میں ختم ہو جاتا ہے۔ ہم پہلے بھی کہہ آئے ہیں اور اب پھر کہتے ہیں کہ یہ سب نقص کتابی تعلیم دینے کا ہے ہونا یہ چاہئے کہ ایک مرتبہ جلالین کامل پڑھانے کے بعد قرآن مجید کے مختلف مضامین و حقائق پر لکچروں کا جس کو علمائے متقدمین کی اصطلاح میں املا کہتے ہیں ان کا انتظام کیا جائے استاد ابحاث متعلقہ پر بہت سی کتابوں کے مطالعہ کے بعد اپنے نوٹ تیار کرے اور ان کی روشنی میں درس دے اور ساتھ ہی وہ طلبار کو بتائے کہ کس مضمون کے لئے ان کو خود کون کون سی کتابیں زیر مطالعہ رکھنی چاہئیں۔

(باقی آئندہ)

قرآن کا معیارِ فکر و نظر

از

(جناب مولوی محمد قطب الدین احمد صاحب بی - اے)

الٓمّٓ ۝ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۝ نَزَّلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِیْلَ ۝ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۝ اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِاٰیٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِیْدٌ ۝ وَاللّٰهُ عَزِیْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ۝ (آل عمران - ۱)

"الف، لام، میم - اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں کوئی نہیں مگر اسی کی ایک ذات الحی (یعنی زندہ کہ اس کے لئے زوال وفنا نہیں) القیوم (کہ کائنات ہستی کی ہر چیز اس سے قایم ہے، اور اپنے قیام کے لئے کسی کی محتاج نہیں) اسی نے سچائی کے ساتھ تم پر الکتاب نازل کی (یعنی قرآن نازل کیا) اس سے قبل جتنی کتابیں نازل ہو چکی ہیں ان سب کی تصدیق کرتی ہوئی آئی ہے اور اسی نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کی تھی نیز اس نے الفرقان (یعنی نیک وبد اور حق وباطل میں امتیاز کرنے والی قوت) بھی نازل فرمائی - جو لوگ اللہ کی آیتوں سے انکار کرتے ہیں - انھیں (پاداش عمل) میں سخت عذاب ملنے والا ہے اللہ سب پر غالب اور (مجرموں کو) سزا دینے والا ہے"

ذات الٰہی کے الحی والقیوم ہونے کا مقتضیٰ یہ ہوا کہ وہ انسان کی زندگی اور قیام کی ساری احتیاجوں کو فراہم کر دے - جس طرح جسمانی ضرورتیں ہر طرح پر مہیا کر دی گئی ہیں - اسی طرح روحانی مطالبات کا بھی پورا پورا سر و سامان کر دیا گیا ہے - روحانی مطالبات کی تکمیل پذیری کے لئے اس نے دو چیزیں عطا کی

ہیں۔ ایک "الکتاب" اور دوسرے "الفرقان"۔ الکتاب وحی و الہام کا نورِ ہدایت ہے، اور الفرقان عقل و بصیرت کی روشنی ہے، جو اس کو سمجھتی اور قبول کرتی ہے۔ پہلی چیز تعلیم ہے اور دوسری تعلم کی استعداد، پہلی ہدایت کی قوت فاعلہ ہے، اور دوسری قوت منفعلہ، جب یہ دونوں کسی کام میں ہم عنان ہوتے ہیں تو نورٌ علیٰ نورٍ کا مصداق بنتے ہیں سنتِ الٰہی یہ رہی ہے کہ جو کفر و سرکشی سے الکتاب کا مقابلہ کرتے ہیں اور الفرقان یعنی جوہرِ عقل و تمیز سے کام نہیں لیتے۔ ان کے لئے دنیا میں بھی نامرادی ہوتی ہے اور آخرت میں بھی سخت عذاب کے مستوجب ٹھہرتے ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن اللہ کی ان بخششوں کو نور اور کتابِ مبین سے تعبیر کرتا ہے۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ وَّكِتٰبٌ مُّبِيْنٌ ۝ يَّهْدِيْ بِهِ اللّٰهُ مَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَهٗ سُبُلَ السَّلٰمِ وَيُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ بِاِذْنِهٖ وَيَهْدِيْهِمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ (المائدہ۔۱۵)

"اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی اور واضح کتاب آچکی خدا اس کے ذریعہ ان لوگوں پر جو اس کی خوشنودیوں کے تابع ہوں، سلامتی کی راہ کھول دیتا ہے اور اپنے حکم سے انھیں تاریکیوں سے نکالتا روشنی میں لے آتا اور (کامیابی وسعادت کی) سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔"

یہاں جوہرِ عقل کو نور سے تشبیہ دی گئی ہے۔ جس طرح آنکھوں کا اندھا نور و ظلمت میں فرق نہیں کرسکتا، ایسے ہی عقل و بصیرت سے کورا حق و باطل میں امتیاز کرنے سے قاصر رہتا ہے، عقل و وحی میں کوئی تضاد و تخالف نہیں، بلکہ وحی ان گتھیوں کو سلجھاتی ہے جن کی گرہ کشائی میں عقل درماندہ و عاجز رہتی ہے یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم ہیں۔ جو وظیفہ عقل کا ایک خاص حد اور سطح پر ہے۔ وہی کام اس سے ایک بلندتر قوت وحی والہام کا ایک اعلیٰ تر سطح پر ہے جہاں عقل لغزش کھاتی اور بے راہ رو ہوتی ہے وہاں یہ اس کی دستگیری کرتا اور صراطِ مستقیم سے منحرف نہیں ہونے دیتا فرائض و وظائف کی اسی مماثلت کے سبب قرآن وحی والہام کو بھی نور و فرقان سے تعبیر کرتا ہے۔

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا (الانفال۔۲۹)

نقشے کہ بستہ ہمہ اوہام باطل است عقلے بہم رساں کہ ادب خوردہ دل است

اگر غور کیا جائے تو یہ بات معلوم ہوگی کہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کا اصلی سرچشمہ ان ہردو کے باہمی تعلق کا لحاظ نہ رکھنا، اور کسی ایک طرف کو جھک جانا ہے۔ قرآن بیک وقت دونوں باتوں کی مذمت کرتا ہے، اس کی بھی کہ بغیر علم و بصیرت کے کوئی بات مان لی جائے، اور اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کوئی بات جھٹلا دی جائے۔ انسان یا تو عقل و بینش سے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بلا جانے بوجھے ماننے لگتا ہے اور یا پھر اپنی فہم و دانش کے گھمنڈ میں اتنا بے لگام ہو جاتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوئی فوراً اس کے انکار پر تل جاتا ہے۔ یہ دونوں حالتیں علم و بصیرت کے خلاف ہیں۔ جس عقل و بصیرت کا تقاضہ یہ ہوا کہ حقیقت اور وہم میں امتیاز کرے وہی اس کی بھی متقاضی ہوئی کہ کسی بات کو محض اس بنا پر رد نہ کردے کہ وہ اس کی سمجھ سے مافوق ہے۔ قرآن کے نزدیک اصحابِ علم و عرفان وہ لوگ ہیں جو نہ جہل و کوری کی راہ چلتے ہیں اور نہ شک والحاد کی کسی چیز کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں اور ان ہردو کا حکم یکساں نہیں۔ ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو اور دوسری یہ کہ وہ کسی کی عقل سے ماوراء ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جن کا کسی کی فہم احاطہ نہیں کرسکتی لیکن اس پر یہ حکم لگایا نہیں جا سکتا کہ وہ سراسر عقل کے خلاف ہیں اول تو تمام افراد کی عقلی استعداد یکساں نہیں ایک آدمی موٹی سے موٹی بات بھی نہیں سمجھ سکتا۔ اور دوسرا باریک سے باریک نکتے حل کر لیتا ہے۔ دوم یہ کہ عقل انسان برابر نشو و ارتقار کی حالت میں ہے ایک عہد کی عقل جن باتوں کا ادراک نہیں کرسکتی، دوسرے عہد کے لئے وہی چیزیں عقلی مسلمات میں شمار ہوتی ہیں۔ سوم یہ کہ عقل انسانی کا ادراک ایک خاص حد سے تجاوز نہیں کرسکتا اور یہ عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ سب کچھ اتنا ہی نہیں جن کا احاطہ اس نے کر لیا ہے۔

گذر جا عقل سے آگے کہ یہ نور چراغِ راہ ہے منزل نہیں ہے

جو لوگ عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے ان کے متعلق قرآن کا ارشاد ہے:

وَلَقَدْ ذَرَأْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيرًا مِّنَ الْجِنِّ	اور کتنے ہی جن و انس ہیں جنھیں ہم نے جہنم کے لئے
وَالْإِنسِ ۖ لَهُمْ قُلُوبٌ لَّا يَفْقَهُونَ	پیدا کیا ہے (یعنے بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہونے والا ہے)

بِهَا وَلَهُمْ أَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُونَ بِهَا وَلَهُمْ آذَانٌ لَّا يَسْمَعُونَ بِهَا ۚ أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ الْغَافِلُونَ ○ (الاعراف ۱۷۹)

ان کے پاس عقل ہے مگر اس سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے، آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے۔ کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ وہ (عقل وحواس کا استعمال کھو کر) چارپایوں کی طرح ہو گئے بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔ ایسے ہی لوگ ہیں جو یک قلم غفلت میں ڈوب گئے ہیں۔"

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت وسعادت کی راہ عقل وتفکر کی راہ ہے اور گمراہی وشقاوت کا سرچشمہ۔ جہل وکوری اور حواس وتفکر کو بےکار کر دینا ہے، قرآن کے نزدیک ایسا ہی گروہ جہنمی ہے۔

معرفت حقیقت کی دو ہی راہیں ہیں۔ فکر اور نظر۔ فکر یہ کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور نظر یہ کہ کائنات ہستی کے عجائب ودقائق کا مشاہدہ کریں، اور اس سے بصیرت حاصل کریں جو شخص ان دونوں باتوں سے محروم ہے۔ وہ اندھا، بہرا اور گمراہی سے لوٹنے والا نہیں ایک دوسرے مقام پر ان لوگوں کی بابت ارشاد ہے:۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَابِّ عِندَ اللَّهِ الصُّمُّ الْبُكْمُ الَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ (الانفال ۲۲)

یقیناً اللہ کے نزدیک سب سے بدترین حیوان وہ (انسان) ہیں جو بہرے گونگے ہو گئے جو کچھ بجھتے نہیں۔"

قرآن کی کوئی سورۃ اور سورۃ کا کوئی حصہ نہیں جو تفکر اور تعقل کی دعوت سے خالی ہو۔ وہ جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ انسان کے لئے حقیقت شناسی کی راہ یہ ہے کہ وہ خدا کی دی ہوئی عقل وبصیرت سے کام لے اور اپنے وجود کے اندر اور اپنے وجود سے باہر جو کچھ بھی دیکھتا اور محسوس کر سکتا ہے اس میں تدبر وتفکر کرے۔

وَفِي الْأَرْضِ آيَاتٌ لِّلْمُوقِنِينَ وَفِي

اور یقین رکھنے والوں کے لئے زمین میں (معرفت حق

اَنْفُسِكُمْ اَفَلَا تُبْصِرُوْنَ ۝ کی نشانیاں ہیں، اور خود تمہارے وجود میں بھی، پھر کیا تم دیکھتے نہیں"

ایک مقام پر پیغمبر اسلام کو حکم دیا جاتا ہے کہ اس بات کا اعلان کریں کہ میری راہ علم و بصیرت کی راہ ہے

قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ (یوسف)

کہہ دو میری راہ تو یہ ہے کہ میں اس روشنی کی بنا پر جو میرے سامنے ہے اللہ کی طرف بلاتا ہوں۔ اور (اس راہ میں) جن لوگوں نے میرے پیچھے قدم اٹھایا ہے وہ بھی (اسی طرح) بلاتے ہیں"

یہاں بصیرت کا لفظ لایا گیا ہے، جس کے معنی علم، معرفت اور یقین کے ہیں۔ قرآن کہتا ہے جس راہ کی طرف میں بلاتا ہوں اس کے لئے میرے پاس علم و یقین ہے کیا تمہارے پاس بھی ایسا کوئی علم و یقین ہے۔ اگر نہیں ہے تو اتباع علم و عرفان کا کرنا چاہیے نہ کہ وہم و گمان کا:۔

علم کی حد سے پرے، بندۂ مومن کے لئے لذّتِ شوق بھی ہے، نعمتِ دیدار بھی ہے

قرآن کا مطالبہ ہے کہ ہر انسان اس کے مطالب میں غور و فکر کرے

اَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا ۝ (النساء - ۸۲)

کیا یہ لوگ قرآن کے مطالب میں غور و فکر نہیں کرتے؟ اور خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت سے کام نہیں لیتے؟) اگر یہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا، تو یہ ضروری تھا کہ یہ اس کی بہت سی باتوں میں اختلاف پاتے (حالانکہ وہ اپنی ساری باتوں میں از اول تا آخر کامل طور پر ہم آہنگ و یکساں ہے")

اس آیت کے بعد کسی کا یہ سمجھنا کہ وہ صرف اماموں اور مجتہدوں ہی کے سمجھنے کی چیز ہے، کہاں تک حق بجانب ہے حضرت عمرؓ جیسی صاحب حکم و اختیار شخصیت ایک مجوزہ کی تاویل و تفسیر پر تعین

مہر سے باز رہی۔ اندھی تقلید کرنے والا قرآن پر غور و فکر کرنے والا نہیں ہو سکتا

ترے ضمیر پہ جب تک نہ ہو نزول کتاب ۔ گرہ کشا ہے نہ رازی نہ صاحبِ کشّاف

کتاب الٰہی کا فہم و مطالعہ ایک سلیم الطبع انسان کو صحیفۂ فطرت اور موجوداتِ عالم کے مطالعہ و تدبّر کی طرف مائل کر دیتا ہے۔ قرآن کی حیثیت صحیفۂ فطرت کے ایک انڈکس (Index) کی سی ہے۔ یہ ایک شاہ کلید ہے (Master Key) جس سے کائنات کے رازہائے سربستہ کھلتے اور کشادہ آغوش ہوتے ہیں قرآن ہر موقع پر حرف و صوت کے پردوں میں اس راہ پر گامزن ہونے کے لئے اپنے دل نواز نغموں سے ابھارتا رہتا ہے

کھول آنکھ، زمیں دیکھ، فلک دیکھ، فضا دیکھ ۔ مشرق سے ابھرتے ہوئے سورج کو ذرا دیکھ

اس جلوۂ بے پردہ کو پردوں میں چھپا دیکھ ۔ ایامِ جدائی کے ستم دیکھ، جفا دیکھ

بے تاب نہ ہو معرکۂ بیم و رجا دیکھ

ہیں تیرے تصرف میں یہ بادل، یہ گھٹائیں ۔ یہ گنبدِ افلاک، یہ خاموش فضائیں

یہ کوہ، یہ صحرا، یہ سمندر، یہ ہوائیں ۔ تھیں پیشِ نظر کل تو فرشتوں کی ادائیں

آئینۂ ایام میں آج اپنی ادا دیکھ

خورشیدِ جہاں تاب کی ضو تیرے شرر میں ۔ آباد ہے اک تازہ جہاں تیرے ہنر میں

جچتے نہیں، بخشے ہوئے فردوس نظر میں ۔ جنت تری پنہاں ہے ترے خونِ جگر میں

اے پیکرِ گل، کوششِ پیہم کی جزا دیکھ

حضرت ابراہیمؑ کے مطالعۂ کائنات کا ایک تمثیلی واقعہ قرآن نے پیش کیا ہے۔ کائنات کے اس مطالعہ سے ان پر توحید الوہیت کا راز نہ انکشاف کر دیا گیا۔ اس کی تفصیل اس طرح پر ہے کہ جب شام ہوئی تو زہرہ برافگندہ نقاب ہوئی اور اپنی ساری درخشانیوں کے ساتھ پردۂ شب سے جھانکنے لگی حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم کا عقیدہ نقل کر کے کہا کہ یہ چمکتا ہوا کوکب میرا پروردگار ہے، لیکن جب کچھ دیر بعد وہ ڈوب گیا، تو انھوں نے کہا کہ جو ہستیاں ڈوب جانے والی ہیں میں ان کا پرستار نہیں، کیوں کہ

یہ کسی کے ٹھہرائے ہوئے قاعدہ کی پابند ہیں، یہ پروردہ ہیں۔ پروردگار نہیں۔ پھر چاند چمکتا ہوا نکل آیا، وہ بولے یہ پروردگار ہے، لیکن وہ بھی نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ اب صبح ہوئی اور نیر اعظم افق تاب ہوا۔ اس کی روشنی کو بھی قرار و ثبات نہ تھا، پہلے چڑھنے لگی، پھر ڈھلنے لگی، اور آہستہ آہستہ پردہ ظلمت میں روپوش ہوگئی۔ حضرت ابراہیمؑ نے کہا جو قوت ان پر حکمران و قہرمان ہے۔ میں اسی کا پجاری ہوں، میں صرف اسی کا ہو رہا، میری راہ شرک کرنے والوں کی راہ نہیں،

براہیمی نظر پیدا مگر مشکل سے ہوتی ہے ہوس چھپ چھپ کے سینوں میں بنا لیتی ہے تصویریں

ہم مسلمانوں کی اس وقت کیفیت یہ ہے کہ کوئی بات کا سلیقہ نہیں، اور نہ ہمیں کسی کام کا ڈھب آتا ہے۔ اندھی تقلید نے ہم میں ایسی غلامانہ ذہنیت کو فروغ دے دیا ہے کہ طبیعتیں یکسر تازہ کاری اور جدت آفرینی سے ناآشنا ہو چکی ہیں کوئی بھی اپنی سحر طرازیوں سے ہمیں اچک لے جاتا ہے

نہ سلیقہ مجھ میں کلیم کا، نہ قرینہ مجھ میں خلیل کا میں ہلاکِ جادوئے سامری، میں قتیلِ شیوۂ آذری

ہم ملا اور صوفیوں کے دام تذویر میں کچھ ایسے اسیر ہیں کہ جو کتاب زندہ مردوں کو حیات نو بخشنے والی تھی اس سے ہم درسِ فنا لے رہے ہیں اور صرف استحضار و جانکنی کی حالتوں میں اس سے آسانی کے ساتھ آغوش لحد میں دراز ہونا سیکھ رہے ہیں۔

بہ بند صوفی و ملا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بہ آیاتش ترا بس کار اینست کہ از یٰسین او آساں بمیری

یہ وہ کتاب زندہ تھی جس کی ایک آیت کے مجرد سماع نے حضرت عمرؓ کی زندگی بدل ڈالی اور جو عمرؓ سے فاروق اعظمؓ بن گئے اور جس کی ایک آیت کی تصدیق نے حضرت ابوبکرؓ کو صدیق اکبرؓ بنا دیا۔ یہ اثر و نفوذ اب بھی اس میں اسی قوت اور اثر انگیزی کے ساتھ موجود ہے، مگر استعداد و صلاحیت کا فقدان ہے۔ یہ وہ کتاب زندہ ہے جس کی کار فرمائیوں اور حیات آفرینیوں کی ایک ہلکی سی جھلک اقبالؔ نے اپنے اشعار میں اس طرح دکھائی ہے۔

آں کتاب زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ او لایزال است و قدیم

فاش گویم آنچہ در دل مضمر است | این کتابے نیست چیزے دیگر است
چون بجاں در رفت، جاں دیگر شود | جاں چو دیگر شد، جہاں دیگر شود
گر تو می خواہی مسلماں زیستن | نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن
مثل حق پنہاں، و ہم پیداست او | زندہ و پایندہ و گویاست او
صد جہاں تازہ در آیاتِ اوست | عصرہا پیچیدہ در آناتِ اوست
بندۂ مومن ز آیاتِ خداست | این جہاں اندر بر او چوں قباست
چوں کہن گردد جہانے در برش | می دہد قرآں جہانے دیگر است

قرآن کا مرکزی اور محوری نقطہ جس کے گرد اس کی تمام آیات و سور گھوم رہی ہیں وہ توحید الوہیت ہے، شرک کی ساری آلودگیوں، اور تعدد و دوئی کے تمام شائبوں سے اس کو پاک اور منقح کر کے پیش کیا گیا ہے۔ اس عقیدۂ توحید کا سب سے زیادہ انقلابی کارنامہ یہ تھا کہ اس نے عبادت کے رائج الوقت مفہوم کو بالکل بدل دیا اور اس میں ایسی وسعت اور ہمہ گیری پیدا کی کہ عملی زندگی کا کوئی شعبہ اس کے دائرۂ اثر سے خارج نہیں رہا۔ اس نے عبادت کو زندگی کے تمام شعبوں پر پھیلا کر دینی اور دنیوی کی مصنوعی تفریق مٹا دی، اور ایک وحدت میں منسلک کر دیا۔ اس نے انسان کی اخلاقی اور مذہبی ذمہ داریوں کو اتنی وسعت دی کہ اس کا کوئی عمل اصول مذہب یا قانون اخلاق کے تقاضوں سے آزاد نہیں رہا، زندگی کا ہر قدم اور اعضاء و جوارح کی ہر جنبش جس کا رخ صحیح اور روحانی نصب العین کے منافی نہ ہو اسلام کی نظر میں عبادت کا حکم رکھتی ہے، چنانچہ بخاری و مسلم کی ایک حدیث حضرت سعد وقاصؓ سے یوں روایت کی گئی ہے کہ حضورؐ نے فرمایا "اگر تم اللہ کی خوشنودی چاہتے ہوئے جو کچھ بھی خرچ کرو گے اللہ اس کا اجر دے گا خواہ اپنی بیوی کے منہ میں ایک لقمہ ہی اس غرض سے رکھ دو۔" وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنْسَ إِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ سے اسی حقیقت کا اثبات ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ انسانوں اور جنوں کو نماز روزہ اور دوسری معروف عبادات میں چوبیس گھنٹے لگے رہنا چاہئے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ مذہبی نصب العین اور اخلاقی اقدار کے

حصول میں، جو کام بھی انجام دیا جائے گا وہ داخلِ عبادت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام میں آدمی کا کھانا پینا، شادی بیاہ، ازدواجی اور معاشری فرائض کی بجا آوری، حصولِ علم کی جدوجہد، اور تمام دیگر مشاغل، جن کا تعلق معاشرت، سیاست اور تمدن سے ہو اس کے لئے عبادت کا درجہ رکھتے ہیں۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں دینی اور دنیوی امور میں تفریق، جو زمانہ مابعد میں رونما ہوئی، اپنا وجود نہ رکھتی تھی۔ ہمارے اس دورِ انحطاط میں وہ شخص زیادہ قابلِ احترام سمجھا جاتا ہے جو زیادہ سے زیادہ نماز روزہ اور طرح طرح کی ریاضتوں اور مجاہدوں میں مشغول رہتا ہے۔ اسلام نے عبادت کا جو وسیع مفہوم پیش کیا ہے اس کی روشنی میں اصل معیارِ فضیلت یہ ہوگا کہ اس شخص کی زیادہ عزت کی جائے گی جو اخلاقی نقطۂ نظر سے معاشرہ کے لئے زیادہ مفید ہو، سیاست و تمدن کے دائرہ میں قوم کی صحیح رہبری کرے، اور معاشری خرابیوں کے دور کرنے میں جان و مال کی قربانیوں سے بھی دریغ نہ کرے حضرت عمرؓ کا یہ قول کہ کسی شخص کے نماز روزہ کو نہ دیکھو بلکہ اس کی سچائی اور عقلمندی کا زیادہ خیال کرو اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ جو شخص مذہبی عبادات پر قناعت کر لیتا ہے، اور معاشری فرائض کی بجا آوری میں تساہل برتتا ہے جو عبادت کا اصل مطلوب و مقصود ہیں، اس کی مثال اس سپاہی کی سی ہے جو مشق و تربیت کے دوران میں تو بڑی مستعدی دکھاتا ہے، لیکن عین جنگ کے موقع پر راہ فرار اختیار کرتا یا روپوش ہو کر گھر بیٹھ رہتا ہے

زاہد نداشت تابِ جمالِ پری رخاں کنجے گرفت و یادِ خدا را بہانہ ساخت

ہر کتاب و تعلیم کے چند مرکزی مقاصد ہوتے ہیں، اور اس کی تمام تر تفصیلات انھیں کے گرد گھومتی رہتی ہیں، جب تک یہ مراکز سمجھ میں نہ آئیں، دائرہ کی کوئی بات سمجھ میں نہیں آسکتی۔ قرآن کا بھی یہی حال ہے، اس کے بھی چند مرکزی مقاصد و مہمات ہیں، اور جب تک وہ صحیح طور پر سمجھ نہ لئے جائیں اس کی کوئی بات ٹھیک طور پر سمجھی نہیں جا سکتی۔

بغیرِ دل، ہمہ نقش و نگار بے معنی است ہمیں ورق کہ سیاہ گشتہ، مدعا اینجا ست

قرآن کے معانی و مطالب کا ٹھیک فہم و ادراک اولاً اس امر پر موقوف ہے کہ اس کے روح

ومزاج کا سراغ لگایا جائے جو گنے چنے اوامر و احکام قرآن میں پائے جاتے ہیں، وہ جن مصالح و حکم پر مبنی ہوتے ہیں ان پر غور و فکر کرنے سے اس کے مزاج کا پتہ چلتا ہے قرآن دراصل ایک کتاب حکمت ہے۔ حکمت اصل اور بنیادی حقیقت ہے، اور احکام حسب ضرورت اس حکمت سے سرزد ہوتے ہیں قرآن میں احکام کی تعداد بہت کم ہے، اور جو احکام ہیں ان کے ساتھ ان کی حکمت بتلادی گئی ہے، جو اس کی علت کا حکم رکھتی ہے۔ اگر اوامر کی کثرت ہو جائے تو انسان کی جائز آزادی بھی بعض اوقات محدود ہو جاتی ہے چنانچہ حضور اکرمؐ کثرت سوال اور مفروضہ حالات پر کوئی حکم صادر کرنے کو ناپسند فرماتے تھے بخاری و مسلم میں ایک حدیث مختلف طریقوں سے بیان ہوئی ہے

دعونی ما ترکتم، انما اهلك من	مجھ کو چھوڑ دو، جب میں تم کو چھوڑ دوں بے شک
کان قبلکم کثرة سوالهم واختلافهم	اگلی امتوں کو کثرت سوال اور انبیاء کی مخالفت نے
علی انبیائهم، فاذا نهیتکم عن شیٔ	ہلاک کیا جب تم کو کسی بات سے منع کروں، تو اس
فاجتنبوه واذا امرتکم بامر فاتو	سے باز رہو، اور جس بات کا حکم دوں اس کو بجالاؤ
منه ما استطعتم (متفق علیہ)	جتنی تم میں استطاعت ہو۔

اسلام نے دین کی حقیقت یہ بتلائی ہے کہ "الدین یسر" دین آسانی کا نام ہے اور رسالت کا مقصد یہ ہے کہ انسان نے جن توہمات، رسوم و روایات کی زنجیروں میں اپنے آپ کو جکڑ لیا ہے ان سے چھٹکارا دلائے۔ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ (الاعراف۔ ۱۵۷) احکام کی تعداد کم سے کم ہو اور زیادہ زور اصول پر دیا جائے، حکم کی محض ظاہری پابندی کر کے اس کے باطن اور اس کی حکمت سے غفلت برتنے والوں کو آگاہ کیا جائے، عبادات کا مقصود بتلایا جائے۔ اور ان کے کچھ ارکان و آداب معین کئے جائیں۔ لیکن ساتھ ہی تاکید کے ساتھ یہ تلقین کی جائے کہ ارکان و آداب ذرائع و وسائل ہیں، مقصود و مطلوب نہیں۔ اصلی نماز وہ ہے جو حضورِ قلب کے ساتھ ادا ہو: "لا صلوٰۃ الا بحضور القلب" اور وہ جو "فحشاء و منکر" سے باز رکھے۔ نماز میں قبلہ رو ہونا آداب صلوٰۃ میں سے ایک ہے، لیکن قرآن نے یہ خطرہ محسوس کیا کہ کہیں اس کو جوہر صلوٰۃ اور اصول کا ہم پلہ نہ سمجھ لیا

جائے، تاکید کے ساتھ یہ بات ارشاد کی " وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ "
ایک دوسرے مقام پر ایک علیحدہ پیرایہ بیان کے ساتھ یہ واضح کیا گیا کہ اصل کام نیکیوں میں سبقت کرنا ہے، کسی خاص سمت منہ پھیرنا نہیں۔

قرآن کی تعلیمات دو پہلوؤں پر مشتمل ہے۔ ایک اصول اور دوسرے احکام اصول آیات محکمات ہیں اور اپنی غیر متبدل پذیری کے سبب ام الکتاب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جزوی احکام و فروع آیات متشابہات ہیں جو حالات اور زمانے کے تقاضوں کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں اور جن کی مماثلت ملل گذشتہ اور ادیان سابقہ میں بھی پائی جاتی ہے

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْكَ الْكِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْكَمٰتٌ هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ (آل عمران - ۶)	وہی (حی وقیوم ذات) ہے جس نے تم پر الکتاب نازل فرمائی، اس میں ایک قسم تو محکم آیتوں کی ہے، اور وہ کتاب کی اصل و اساس ہیں اور دوسری قسم متشابہات کی ہے"۔

قرآن میں جو اصول و کلیات بیان کئے گئے ہیں، چونکہ ان کا اطلاق ہر زمانہ کے حالات پر جداگانہ ہوتا رہے گا اس لئے احکام میں بھی ترمیم و تبدیلی لازم آئے گی۔ حکمت کلیات کا نام ہے حیات و کائنات میں اشیاء و حوادث کی کثرت ہے، لیکن یہ کثرت ہر جگہ آئین و قوانین میں منضبط و منسلک ہے۔ حکمت کثرت کے اندر وحدت کا عرفان ہے، یا جزئیات کے اندر ان کلیات کی تلاش ہے جو قانون ہونے کے سبب غیر متغیر ہیں۔

مگو کہ کثرتِ اشیاء نقیضِ وحدت ہست ۔۔۔ تو در حقیقتِ اشیاء نظر فگن ہمہ اوست

اسلام کی ایک بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے زندگی کے تمام پہلوؤں اور متضاد حقیقتوں کو ایک واحد اصول فکر میں جمع کر دیا۔ اس امتزاج و ترکیب کے باعث اسلامی نظریہ حیات میں ایک جامعیت پیدا ہو گئی۔ جس سے تمام ملتیں ناآشنا تھیں۔ کائنات کے مختلف مظاہر و واقعات کو سمجھنے کے لئے یہ ضروری ہے کہ انھیں ایک کل کے اجزاء کی حیثیت سے دیکھا جائے، کیوں کہ یہ نمود و بود

کا عالم ایک یونیورس (Universe) ہے ملٹی ورس (Multiverse) نہیں اگر غلطی سے جزو کو کل سمجھ لیا جائے تو جزوی صداقتوں کی پرستش لازم آئے گی، حالانکہ صداقت ایک کل ہے، جس کے مختلف اجزا اور پہلو ہوتے ہیں، اور کسی ایک پہلو اور جزو کو کل حقیقت سمجھ لینے سے باقی اجزاء کی نفی لازم آتی ہے۔ اسی غلط اندیشی کی طرف قرآن نے تنبیہ کی ہے۔

وَيَقْطَعُونَ مَا أَمَرَ اللَّهُ بِهِ أَنْ يُوصَلَ وَيُفْسِدُونَ فِي الْأَرْضِ (الرعد - ۲۵)

وہ اس چیز کو قطع کرتے ہیں جس کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، اور اس طرح زمین میں موجب فساد ہوتے ہیں۔

قرآن نے ان تمام جزوی صداقتوں کو ایک کلی وحدت میں سمو دیا، جس میں کسی جزو کو کلی حیثیت نہیں دی گئی، مگر ہر ایک کو اس کے صحیح مقام پر رکھا گیا، اسی امتزاج و ترکیب، جمع و تالیف، اور اجماعِ اضداد کا نام توحید ہے۔

لب پر از آہ و دروں پر ز خیالِ رُخِ دوست　　در نفس دوزخ و در سینہ گلستاں دارم

مغربی تمدن نے ہر فن اور شعبہ حیات میں تقسیمِ کار کے اصول پر اتنا زور دیا ہے کہ کسی شخص کو اپنے شعبہ یا فن کے سوا دیگر فنون سے کوئی مس نہیں رہا ہے۔ خصوصی ماہرین کے اس روز بازار میں یک رُخے انسانوں کی ہر طرف بہتات ہے، جو مسائلِ حیات کو صرف اپنے مخصوص شعبہ جاتی نقطۂ نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ماہرینِ معاشیات اخلاقی امور کی اہمیت سے نابلد، سیاست داں مذہب اور اس کے انقلاب انگیز اثرات سے ناآشنا، اور دوسرے قسم کے ماہرینِ فن اپنے مخصوص علم کے سوا زندگی کے تقاضوں سے یکسر بیگانہ ہیں۔ عقیدۂ توحید کا عملی اقتضاء یہ ہے کہ ہم دنیا کے حالات و واقعات، تمدن کے مختلف اداروں، ملک کے نافذ الوقت قوانین، اور معاشرت و تعلیم کے مروجہ طریقوں کو اختیار یا ترک کرنے میں ان کے مجموعی نتائج کو پیشِ نظر رکھیں۔ کسی واقع، ادارہ، قانون یا رسم و رواج پر صرف اس حیثیت سے غور کرنا کہ وہ معاشی نقطۂ نظر سے سود مند یا ضرر رساں ہے، موجودہ تہذیب کا ایک خاصہ ہو گیا ہے۔ اسلام کا عقیدۂ توحید اس طرزِ فکر کا مخالف ہے۔ اسلام ہمیں زندگی کا ایک

کلی تصور اختیار کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ اس لئے وہ اشیاء کی قدر و قیمت کا معیار ان کے مجموعی نتائج کو قرار دیتا ہے۔ شراب کے متعلق قرآن حکیم کا یہ ارشاد کہ اس میں فوائد بھی ہیں، لیکن نقصانات زیادہ ہیں۔ لہٰذا یہ چیز قابلِ ترک قرار دی گئی، اسی طرزِ فکر کا آئینہ دار ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے کسی چیز کے ردو قبول میں اس کے اخلاقی مؤثرات کو زیادہ وزن دو قعت دی گئی ہے۔

غریباں گم کردہ اند افلاک را　　　در شکم جویند جانِ پاک را

مسلمان اس وقت جس چیز کو ابدی اسلام سمجھے ہوئے ہیں، اس میں کئی قسم کی آمیزش ہو گئی ہے، کچھ ازلی اصول بھی ہیں، اور کچھ تغیر پذیر فروع بھی۔ دینِ اسلام ایک ارتقاء پذیر مذہب ہے۔ جس طرح ایک تناور درخت اپنی اصل پر ثابت و قائم رہ کر ہر وقت نئی کونپلیں اور شاخیں اور نئے برگ و بار پیدا کرتا رہتا ہے، اسی طرح دینِ اسلام اپنی محکمات اور اساسی اصولوں پر قائم رہ کر اپنے فروعی، جزوی اور وقتی احکام میں حالات و زمانے کے تقاضوں کے ساتھ نئی نئی اصلاحات اور تبدیلیوں کو قبول کرتا رہتا ہے۔ اصل ثابت و قائم رہتی ہے، شاخیں اور پتے سوکھتے اور جھڑتے رہتے ہیں، ان پر خزاں و بہار کا عمل ہوتا رہتا ہے۔ فروع کا یہ تغیر و تبدل درخت کی بقاء اور نشو و ارتقاء کا باعث ہوتا ہے۔ اگر درخت اپنی اس نمو و بالیدگی سے رک جائے تو وہ زیادہ عرصہ تک سر سبز و شاداب نہیں رہ سکتا۔ کلمہ طیبہ کو قرآن نے ایک درخت ہی سے تشبیہ دی ہے، جس کی اصل ثابت اور ٹہنیاں فضائے سماوی میں سایہ گستر رہتی ہیں۔

احکام حالات کے تابع ہوتے ہیں، اور حالات ایک دوسرے کے خلف ہونے کے سبب باہم دگر مختلف ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ اختلاف بادی النظر میں زیادہ محسوس نہیں ہوتا لیکن جوں جوں زمانہ گذرتا جاتا ہے یہ اختلاف نمایاں ہوتا جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ وقتی اور جزوی احکام میں نزولِ قرآن کے وقت بھی ردوبدل ہوتا رہا۔ صورتِ حال کے ساتھ ساتھ حکم میں بھی

تبدیلی ہوتی رہی۔ حضور اقدسؐ نے اجتہادِ نبوی سے کام فرمایا، اس کے بعد اسلام کی اصلی روح کے مطابق خلفائے راشدین نے کہیں توسیع اور کہیں تخفیف کی۔ حالات کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے نئے نئے احکام وضع کئے گئے۔ صرف ان احکام سے اختلاف کیا گیا جو آنحضرتؐ سے منسوب تھے بلکہ بعض قرآنی احکام کے مقابلہ میں بھی یہ صورت پیش آئی۔ حضرت عمرؓ کے طریقِ عمل سے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ مثلاً اسلام نے چوری کی سزا قطع ید مقرر کی تھی، لیکن اس میں کہیں یہ حکم نہ تھا کہ اس کے نفاذ کو کسی صورت میں معطل کیا جا سکتا ہے حضرت عمرؓ نے مصالح و حالات کے مدِ نظر ایام قحط، جسے عام الرمادہ سے موسوم کیا جاتا ہے، چوروں کے ہاتھ کاٹنے کی ممانعت فرما دی تھی۔ ایسے ہی آپ نے مصارف زکوٰۃ میں سے مولفۃ القلوب پر صرف کرنے سے یہ کہہ کر روک دیا تھا کہ اب اسلام کو طاقت و شوکت حاصل ہو چکی ہے اس لئے وہ علت باقی نہیں رہی جس کی بنا پر قرآن نے یہ حکم دیا تھا۔ ارکانِ حج میں رمل، یعنی اکڑ کر طواف کرنے، کی بابت بھی حضرت عمرؓ کا یہی خیال تھا اگرچہ کہ اس کو عملی صورت نہیں دی گئی۔

قرآن حکیم کی ہر نص کے پیچھے ایک علت ہوتی ہے۔ اس علت کا جاننا حکمت اور روح قرآن کا عرفان ہے۔ اگر کوئی مسلمان علت کے جانے بغیر محض نص کے الفاظ سے چمٹ جائے تو وہ خدا پرست ہونے کے بجائے الفاظ پرست ہو جائے گا۔

حرم جویاں درے را می پرستند فقیہاں دفترے را می پرستند
برافگن پردہ تا معلوم گردد کہ یاراں دیگرے را می پرستند

ہر عہد کا مصنف اپنے زمانہ کی پیداوار ہوتا ہے۔ جس خاص ذہنی سطح پر ایک عہد ہوتا ہے اور اس وقت حالات کے جو تقاضے ہوتے ہیں، انھیں کو لے کر وہ اپنی استعداد و صلاحیت کے موافق پورا کرنے کی کوشش کرتا ہے یہ انسانی افکار و خیالات کی تاریخ کے عام حقائق ہیں، جن سے کوئی قوم ملک اور معاشرہ مستثنیٰ نہیں ہاں یہ ضرور ہے کہ بعض استثنائی شخصیتیں ہر عہد میں ایسی پیدا ہوتی رہی ہیں جو اپنے خیالات و افکار کے لحاظ سے اپنے معاصر زمانہ سے بہت آگے بڑھی ہوئی تھیں، جن کا شمار ہمیشہ مجددین

امت میں ہوتا رہا۔ غرض یہ کہ ہمیں کسی مصنف کے تصنیفی کارناموں پر تنقید کرتے وقت اس عہد کے حالات ماحول اور گرد و پیش کو مدنظر رکھنا ضروری ہے، تاکہ ہم اپنے فیصلے میں راہِ صواب پر رہیں، ہر زمانہ کی ضرورتیں اور تقاضے جداگانہ ہوتے ہیں۔ اپنے عہد کے مقتضیات وقت کو لے کر کسی گذشتہ دور کے مصنف پر جرح و تعدیل کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ ذہن انسانی ارتقاء پذیر ہے، اور وہ برابر عہد بہ عہد ترقی کرتا جا رہا ہے۔ احوال و ظروف جب بدلیں گے خیالات و افکار میں بھی تغیر لازمی ہوگا۔ محض اس بناء پر کہ حالاتِ حاضرہ کے لحاظ سے ان کا معیارِ فکر پست تھا۔ کسی کو قابلِ ملامت قرار دینا، حقایق سے چشم پوشی اور کوتاہ نظری کے مترادف ہے جس طرح ہم آج ان کے خیالات کی ہنسی اڑا رہے ہیں۔ ایسے ہی آنے والی نسلیں ہمارے افکار و خیالات کا مضحکہ اڑائیں گی۔

آسماں نسبت بہ عرش آمد فرود ورنہ بس عالی است پیش خاکِ تود

یہ قصور ہمارا ہے کہ ہم اپنے عہد کا مطالعہ اپنے بزرگوں کی عینک لگا کر کر رہے ہیں، جو ہماری بصارت سے میل نہیں کھاتی، اور جس کے سبب ہر چیز غیر واضح اور دھندلی ہو کر رہ گئی ہے۔ ان بزرگوں نے کبھی یہ خواہش کی اور نہ اصولاً یہ درست ہے۔ ان کے فکر و نظر کے نتائج ذہن انسانی کے ارتقاء کی تاریخ سمجھنے میں تو مفید ہو سکتے ہیں مگر موجودہ حالات پر ان کا انطباق یہ ہماری کوتاہ فہمی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لسانِ نبوت نے ہر زمانہ میں اجتہاد کی ترغیب و تحریص دلائی ہے، یہاں تک کہ اس میں غلطی کو بھی موجب ثواب گردانا ہے۔

زاتش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن عذاب است
اگر دستِ تو کار نادر آید گناہے ہم اگر باشد ثواب است

اس وقت ہم مسلمانوں کے پاس فقہا اور علماء کا مرتب کردہ ایک دفتر بے پایاں موجود ہے، اور مسلمان اس دفتر پارینہ کی پرستش کر رہے ہیں۔ حالات اور زمانے کا جائزہ لینے کے بجائے اپنی سہل انگاری سے وہ ہر مسئلہ کا حل ان کتابوں میں ڈھونڈ رہے ہیں۔ بیع و شرا، مالیات و اقتصادیات کے تمام مسائل یکسر بدل چکے ہیں، اور ان کی ایسی صورتیں پیدا ہو گئی ہیں، جن کا وہم و گمان آج سے

صدی دو صدی قبل کسی کے حاشیہ خیال میں بھی نہیں گذر سکتا تھا۔ لونڈی غلاموں کے متعلق تمام فقہی موشگافیاں از کار رفتہ اور فرسودہ ہو چکی ہیں، لیکن ہمارے اصحاب جبہ و عمامہ اب تک اسی لکیر کو پیٹتے اور اپنی ذہنی کاوشوں سے داد سخن گستری دے رہے ہیں۔

زمانہ از رخ فردا کشود بند نقاب معاصران ہمہ سرمست بادۂ دوشند

حضور کا ارشاد ہے، جو قوم جہاد یعنی زندگی کے ہر شعبہ میں جد و جہد کرنا چھوڑ دے گی وہ مغلوب و ذلیل ہو جائے گی۔ ہم نے اپنی فقہ کی کتابوں کو شریعت قرار دے کر انھیں اصلاح و ترمیم سے بالاتر کر دیا ہے۔ عقائد و عبادات بعینہٖ برقرار رکھتے ہوئے زمانہ کا شدید تقاضہ یہ ہے کہ معاشی، سیاسی اور تمدنی امور، جن کا تعلق ابواب معاملات سے ہے، تمام فقہ کی از سر نو تدوین کی جائے۔ پرانی عمارت کو گرا کر ایک نئی عمارت تعمیر کرنے کی شدید ضرورت ہے۔

کہنہ را در شکن و باز بہ تعمیر خرام ہر کہ در ورطۂ لا ماند بہ الا نرسید

اس پرانی عمارت کا ملبہ اور مسالہ بہت کچھ کام آسکتا ہے۔ اس نئی عمارت کی بنیاد دین اسلام کے اساسی اصول ہوں گے، لیکن بالائی تعمیر (superstructure) کا نقشہ اپنے سابقہ نقشوں کے بالکلیہ ہم رنگ نہ ہوگا۔ یہ سنت اللہ ہے یہ چیز ہو کر رہے گی، خواہ درس و افتاء کے مسند نشینوں اور تجرد و انقطاع کے خلوت گزینوں کو کتنا ہی گراں گذرے۔ اسلام ایک زندہ، ابدی اور ارتقاء پذیر مذہب ہے اس کا محافظ و نگراں خود خلاق فطرت ہے۔ "اِنَّا لَہٗ لَحَافِظُوْنَ" اگر کوئی قوم اس کی خدمت گزاری میں تساہل برتے گی، خواہ وہ باعتبار نسل و خاندان کتنی ہی قدامت کی حامل ہو خالق کائنات کسی دوسری قوم کو اس سعادت اندوزی کے لئے پیدا کر دے گا۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗۤ (المائدہ - ۵۷)

مسلمانو! تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائیگا تو وہ یہ نہ سمجھے کہ اس کے پھر جانے سے دین حق کو کچھ نقصان پہنچے گا، قریب ہے کہ اللہ ایک ایسا گروہ (سچے مومنوں کا) پیدا کر دے، جنہیں خدا دوست رکھتا

ہو گا، اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن اس دینِ فطرت کی ہمہ گیری اور عام قبول و تسلیم کی بابت عالمِ انسانیت کو یہ مژدۂ روح پرور سناتا ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ۗ

عن قریب ہم ان کو نفسِ انسانی کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنے نشانات دکھائیں گے، حتیٰ کہ ان پر ثابت ہو جائے گا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے"

اس وعدہ کی تکمیل پذیری میں اب زمانہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اس دورِ برکت و سعادت کی بشارت لسانِ نبوت نے ان الفاظ میں دی ہے "خوش ہو جاؤ! خوش ہو جاؤ! میری امت کی مثال ایک بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا زیادہ اچھی ہے یا انتہا یا ایک باغ کی طرح ہے جس سے ایک لشکر ایک سال خوراک حاصل کرتا رہا، اور پھر دوسرا لشکر دوسرے سال خوراک حاصل کرتا رہا۔ ممکن ہے جو بعد میں آنے والا لشکر ہے، وہ زیادہ شان و شوکت کا حامل ہو اور زیادہ طاقتور اور کثیر التعداد ہو" عمل ارتقا قانونِ قدرت ہے۔ انسانیت یقیناً درجہ بدرجہ ترقی کرتی جائے گی اس کا ہر سابق اپنے لاحق سے بلند تر ہوتا رہے گا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ ، فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔

یقیناً تم ایک مقام سے دوسرے مقام تک درجہ بدرجہ بلند ہوتے جاؤ گے، پھر آج کیوں ایمان نہیں لاتے۔

شبہائے تارکی گراں خوابیاں ختم ہو رہی ہیں جبینِ فلک پر آنے والے دور کی افق تابیاں درخشاں، اور مدراتِ سماوی بہ نویدِ جاں بخش ساکنانِ ارضی کو سنا رہے ہیں، فضائیں مست و بے خود، اور کائنات جھوم رہی ہے۔ زبان پر ترنم اور لبوں پر تبسم رقصاں ہے، جذبات میں تلاطم برپا اور نگاہوں میں شوخیاں مچل رہی ہیں۔

آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش ــ اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچہ کی نوا ہوجائے گی
آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی
آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (الصف - ۹)

استدراک

اس مقالہ کی تیاری میں جو مسالہ کام میں لایا گیا ہے وہ تمام تر امام الہند مولانا آزاد، ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؔ، مفکرِ اسلام ڈاکٹر خلیفہ عبد الحکیم اور دیگر اکابرینِ امت کے افکار و خیالات سے ماخوذ و مقتبس ہے۔ میرا اس میں اپنا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ الفاظ اور پیرایۂ بیان بھی خود ان ہی حضرات کا ہے۔ میں نے صرف ان کی جمع و تالیف کی ہے، اور ایک خاص طرز و اسلوب میں انھیں باہم آمیز کر دیا ہے۔ یہ چند خوشنما پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جو چمنستانِ اسلام کے مختلف گوشوں سے انتخاب کر کے فردوسِ نظر بنایا گیا ہے۔ البتہ ان سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں، وہ میرا اپنا استنتاج و استخراج ہے، جس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے، خواہ اس کے لئے نشانۂ ملامت بنایا جاؤں یا موردِ عنایت۔

جرم منست بیش تو گر قدرِ من کم است — خود کردہ ام پسند خریدارِ خویش را

آیاتِ قرآنی کے معانی و مطالب کی توضیح و تشریح امام راغب اصفہانی اور امام الہند مولانا آزاد کے مختارات سے ہے۔ اس مضمون میں جہاں اصحابِ جبہ و عمامہ اور زاویہ نشینانِ تجرد و انقطاع

ہوگا، اور وہ خدا کو دوست رکھنے والے ہوں گے۔

ایک دوسرے مقام پر قرآن اس دینِ فطرت کی ہمہ گیری اور عام قبول و تسلیم کی بابت عالمِ انسانیت کو یہ مژدۂ روح پرور سناتا ہے۔

سَنُرِيهِمْ آيَاتِنَا فِي الْآفَاقِ وَفِي أَنفُسِهِمْ حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ لَهُمْ أَنَّهُ الْحَقُّ ؕ

عن قریب ہم ان کو نفس انسانی کے اندر اور خارج کی دنیا میں اپنے نشانات دکھائیں گے، حتیٰ کہ ان پر ثابت ہو جائے گا کہ قرآن خدا کی سچی کتاب ہے"

اس وعدہ کی تکمیل پذیری میں اب زمانہ کو زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ اس دورِ برکت و سعادت کی بشارت لسانِ نبوت نے ان الفاظ میں دی ہے۔" خوش ہو جاؤ! خوش ہو جاؤ! میری امت کی مثال ایک بارش کی طرح ہے کہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی ابتدا زیادہ اچھی ہے یا انتہا یا ایک باغ کی طرح ہے جس سے ایک لشکر ایک سال خوراک حاصل کرتا رہا، اور پھر دوسرا لشکر دوسرے سال خوراک حاصل کرتا رہا ممکن ہے جو بعد میں آنے والا لشکر ہے، وہ زیادہ شان و شوکت کا حامل ہو اور زیادہ طاقتور اور کثیر التعداد ہو" عمل ارتقاء قانونِ قدرت ہے۔ انسانیت یقیناً درجہ بدرجہ ترقی کرتی جائے گی اس کا ہر سابق اپنے لاحق سے بلند تر ہوتا رہے گا۔

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَن طَبَقٍ، فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ۔

یقیناً تم ایک مقام سے دوسرے مقام تک درجہ بدرجہ بلند ہوتے جاؤ گے، پھر آج کیوں ایمان نہیں لاتے۔

شبہائے تار کی گراں خوابیاں ختم ہو رہی ہیں جبینِ فلک پر آنے والے دور کی انق تابیاں رخشاں، اور مدبراتِ سماوی بہ نویدِ جاں بخش ساکنانِ ارضی کو سنا رہے ہیں، فضائیں مست و بے خود، اور کائنات جھوم رہی ہے۔ زبان پر ترنم اور لبوں پر تبسم رقصاں ہے، جذبات میں تلاطم برپا اور نگاہوں میں شوخیاں مچل رہی ہیں۔

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچہ کی نوا ہوجائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک — بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہوجائے گی

پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود — پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی

آنکھ جو کچھ دیکھتی ہے لب پہ آسکتا نہیں — محوِ حیرت ہوں کہ دنیا کیا سے کیا ہوجائے گی

شب گریزاں ہوگی آخر جلوۂ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمۂ توحید سے

هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ (الصف۔ ۹)

استدراک

اس مقالہ کی تیاری میں جو مسالہ کام میں لایا گیا ہے وہ تمام تر امام الہند مولانا آزاد، ترجمانِ حقیقت علامہ اقبالؔ، مفکرِ اسلام ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم اور دیگر اکابرینِ امت کے افکار و خیالات سے ماخوذ و مقتبس ہے۔ میرا اس میں اپنا کچھ نہیں۔ یہاں تک کہ الفاظ اور پیرایۂ بیان بھی خود ان ہی حضرات کا ہے۔ میں نے صرف ان کی جمع و تالیف کی ہے، اور ایک خاص طرز و اسلوب میں انھیں ہم آمیز کر دیا ہے۔ یہ چند خوشنما پھولوں کا ایک گلدستہ ہے جو چمنستانِ اسلام کے مختلف گوشوں سے انتخاب کر کے فردوسِ نظر بنایا گیا ہے، البتہ ان سے جو نتائج اخذ کئے گئے ہیں، وہ میرا اپنا استنتاج و استخراج ہے، جس کی ساری ذمہ داری مجھ پر ہے، خواہ اس کے لئے نشانۂ ملامت بنایا جاؤں یا موردِ عنایت۔

جرم منست پیش تو گر قدرِ من کم است — خود کردہ ام لپسند خریدارِ خویش را

آیاتِ قرآنی کے معانی و مطالب کی توضیح و تشریح امام راغب اصفہانی اور امام الہند مولانا آزاد کے مختارات سے ہے۔ اس مضمون میں جہاں اصحابِ جبہ و عمامہ اور زاویہ نشینانِ تجرد و انقطاع

کی طرف اشارات کئے گئے ہیں، ان سے پیشہ ور علماء اور دو کاندار متصوفین مراد ہیں، جو اپنے مستقل مفادات کے پیشِ نظر حالتِ موجودہ میں کسی قسم کی تبدیلی کے سخت مخالف ہیں، ورنہ علمائے اسلام اور صوفیائے عالی مقام کا دامن ان آلودگیوں سے ہمیشہ پاک اور بے داغ رہا ہے۔

گر تو آلودہ دامنی چہ عجب　　ہمہ عالم گواہ عصمتِ اوست

بہر حال ہم مسلمانوں کو اس وقت اسلام کے روح و مزاج کو سمجھنے کی سخت ضرورت ہے مطالعۂ کتاب و سنت اور عہدِ خلافت راشدہ پر غور و تدبر سے ذہن و دماغ جلا پاتے اور صحیح اسلامی فکر پیدا ہوتی ہے۔ لسانِ وحی نے مسلمانوں کو امت وسطیٰ کے خطاب سے سرفراز کیا ہے اس ذہنی انتشار اور روحانی خلفشار میں جو اس لا الٰہی (Godless) دور کے برگ و بار ہیں، ہمیں اپنے فرضِ منصبی سے آگہی کی ضرورت ہے تاکہ ہر شعبہ زندگی میں دنیا کی قیادت اور لیظہرہٗ علی الدین کلہٖ کی عملی تفسیر پیش کریں اقبال نے اپنے خطبات "افکار اسلامی کی تشکیلِ جدید" میں عہد حاضر کے مسلمانوں کو اس فرضِ منصبی کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلائی ہے :-

Let the Muslim of today appreciate his position, reconstruct his social life in the light of ultimate principles, and evolve out of the hitherto partially revealed purposes of Islam that spiritual democracy which is the ultimate aim of Islam

--

یہ مضمون اسی سلسلہ کی ایک کڑی، اور ان ہی افکار و خیالات کا اعادہ و تکرار ہے

عدی را تیز تر می خواں چو محمل را گراں بینی
نوا را تلخ تر می زن چو ذوقِ نغمہ کم یابی

عثمان رضؓ

صرف تاریخ کی روشنی میں

از

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم

(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

اسی وقت سے اسلام میں ایسے اشراف وخواص کی بنیاد پڑی جن کا جوہری جز یا یوں کہیے جن کا قوام رسول اللہؐ سے قرب اور آپ کی صحبت تھی، چنانچہ قریش کے لئے حکومت اور انصار کے لئے مشورہ طے ہوا، اور مشورہ دینا ہر مسلمان کا عام حق بھی ہے، بس قریش حکومت کریں اور مشورہ لیں اور عرب انصار وغیر انصار مشورہ دیں۔ ان کے لئے حکومت کرنے کا موقع نہیں، لیکن خواص واشراف کی حقیقت سمجھنے میں ہمیں جلدبازی سے کام نہیں لینا چاہئے اور غور کرنا چاہئے کہ حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے مہاجر ساتھیوں کا مطلب کیا تھا اور قریش والوں نے بعد میں کیا مطلب نکالا؟ اس میں شک نہیں کہ حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور ابوعبیدہؓ ابن جراح کے وہم وگمان میں بھی یہ بات نہ تھی کہ "خلفاء قریش میں سے ہوں" کا مطلب یہ ہے کہ عام قریشی خلافت کے حق دار ہیں، اندازہ یہ ہے کہ حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھیوں نے مہاجرین پر نظر ڈالی جو سب سے پہلے اسلام لائے اور اشاعتِ اسلام کے لئے مکہ کی انتہائی تنگی اور سختی کی زندگی میں اپنے مال ومتاع سے رسول اللہ کی مدد کی انھیں معلوم ہوا کہ ان مہاجرین کی اکثریت قریشی ہے نیز قرآن وحدیث میں اور عوام کی زبان پر مہاجرین کا ذکر پہلے اور انصار کا بعد میں ہے، میں خیال کرتا ہوں کہ حضرت ابوبکرؓ کا مطلب قریش کے اسی

ممتاز طبقے سے ہے جو سب سے پہلے اسلام لایا اور جس نے مکہ کی پر آشوب اور پرخطر زندگی میں نبی کے ساتھ مل کر جہاد کیا اور جس کے ساتھ مدینہ کی باشوکت زندگی میں انصار نے مل کر کام کیا،

اگر حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ نے ایک قبیلہ کی حیثیت سے قریش کا تصور کیا ہوتا جس کا تعلق نسبی اور قرابتی طور پر رسول اللہ سے ہے تو اس تخیل کا تقاضا یہ تھا کہ وہ خلافت کے لئے اس شخص کو پسند کرتے جو قریشیوں میں قرابت کے اعتبار سے رسول اللہؐ سے سب سے زیادہ قریب ہو تا وہ آپ کے چچا عباسؓ یا حضرت علیؓ کو امیدوار بناتے جو نہ صرف آپ کے داماد تھے بلکہ پرورش کردہ بھی، پس حضرت ابوبکرؓ اور آپ کے ساتھیوں کا مقصود قریش سے یہی مخصوص اور ممتاز مہاجرین تھے، اور یہ تو سب سے بڑی حماقت ہوگی اگر کوئی سمجھے کہ صدیق اکبرؓ اور ان کے ساتھیوں نے نبی سے قریش کی قرابت ہی کو خلافت کا سبب اور سرچشمہ قرار دیا، اگر اس قسم کی کوئی گنجائش ہوتی تو حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور ابو عبیدہؓ کے نزدیک بہت سے وہ سربرآوردہ اور آزاد قریشی خلافت کے زیادہ حقدار ہوتے جنہوں نے اسلام کی راہ میں بیش از بیش خدمات انجام دی تھیں اور انصاری بزرگوں میں سے ابوسفیان، صفوان بن امیہ، اور حارث بن ہشام بہتر سے بہتر مستحق تھے جو اپنے ایمان اور خدمات کا ثبوت دے چکے تھے، بہرحال قریش نے حضرت ابوبکرؓ کی بات کا وہ مطلب نکالا جو انؓ کا اور ان کے ساتھیوں کا مقصد نہ تھا اور یہ یقین کر بیٹھے کہ امامت قریش کا حق ہے جو کسی اور طرف منتقل نہیں کیا جا سکتا اس لئے کہ اس کی بنیاد نبی سے قرابت پر ہے، بلاشبہ قریش کا یہ مطلب نکالنا زبردستی کی کھینچ تان اور کھلی ہوئی غلطی ہے، قریش کی رائے اگر معقول ہوتی تو بنی ہاشم دلیل میں غالب آجاتے اور وہ جب تک بھی سنبھال سکتے خلافت کا بار اٹھانے کے زیادہ مستحق تھے، لیکن اسلام، نسب، نسل اور کسی منصب کی بنا پر کسی کو کسی پر فضیلت کا قائل نہیں وہ تو فضیلت کی بنیاد . . . . . خدا کے نزدیک اور لوگوں کی نگاہ میں تقویٰ، قابلیت اور آزمائش میں ثابت قدمی پر رکھتا ہے۔

ہمارے خیال کی تائید اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ جب حضرت عمرؓ سے اس خواہش کا

اظہار کیا گیا کہ وہ کسی کو خلیفہ بنا دیں تو آپ نے فرمایا اگر ابو عبیدہ زندہ ہوتے تو میں ان کو خلیفہ بناتا، اگر سالم مولی ابی حذیفہ زندہ ہوتے تو انھیں یہ امانت سپرد کرتا۔ اور یہ سالم مولی ابی حذیفہ قریشی نہیں تھے بلکہ وہ تو نسباً عرب بھی نہ تھے وہ بچپن ہی میں اصطخر سے لائے گئے تھے ایک انصاری عورت نے جو ان کی مالکہ تھی ان کو آزاد کیا تھا پھر ابو حذیفہ قریشی کی ولاءؓ میں آئے، نبی کی زندگی ہی میں لوگ انھیں دینی معاملات میں بزرگی دیتے تھے، وہ اس زمانے میں جب رسول اللہؐ کے مدینہ تشریف لاتے کا انتظار کیا جاتا تھا، مہاجرین کو جن میں خود حضرت عمرؓ بھی شامل تھے، نماز پڑھایا کرتے تھے۔ عہد صدیقی میں وہ یمامہ میں مرتدوں سے جہاد کرتے ہوئے شہید ہوئے۔

یہ سن کر کہ سالم ولاء کی بنا پر قریشی تھے کوئی صاحب یہ منطق پیش نہ کریں کہ اگر وہ زندہ ہوتے اور حضرت عمرؓ ان کو خلیفہ بنا دیتے تو بہر حال امامت قریش ہی میں رہتی، اس لئے کہ یہ ایک فضول سی بات ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ولاء کی بنا پر جو تعلقات قائم ہوتے ہیں وہ متعلقہ افراد کو آزادوں کے مساوی نہیں بنا دیتے۔ عرب سالم کے نسب سے واقف نہیں تھے اور چونکہ خدا نے حکم دیا تھا کہ "مولی" کو اس کے باپ کے نام سے پکارا جائے اور اسی لئے زید کو ان کے والد حارثہ کے ساتھ ملا کر زید ابن حارثہ کہا جانے لگا، سالم کو عرب "من الصالحین" کہا کرتے تھے کیوں کہ وہ ان کے والد کے نام سے واقف نہ تھے ہاں تو حضرت عمرؓ کوئی حرج نہیں سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کا خلیفہ اس کو بنا دیں جو قریشی نہ تھا بلکہ عرب بھی نہ تھا حضرت عمرؓ اپنے اس خیال میں بالکل صحیح راہ پر تھے اور اصولِ اسلامی کے ماتحت نسب اور نسل کی بنیاد پر فضیلت دینا نہیں چاہتے تھے، وہ تقویٰ، قابلیت اور آزمائش کے قائل تھے اور سالم میں یہ تمام خوبیاں موجود تھیں

بہر حال یہ قریشی اشراف و خواص کی بات یک بیک سامنے آگئی اور اس طرح آئی کہ عوام کو اس کا وہم و گمان بھی نہ تھا۔ حضرت ابو بکرؓ نے چاہا تھا کہ خلافت مہاجرین میں اس وقت تک رہے، جب تک ان میں اس کی قدرت اور قابلیت ہے۔ مگر قریش نے اس

خواہش کا رخ اپنی منفعت اور خاندان کی طرف پھیر دیا اور اسلام کے ایک اہم اصول یعنی "مسلمانوں میں مساوات" کی پرواہ نہ کی۔ اس لائن پر آجانے کے بعد قریش نے ایک قدم اور بڑھایا جس کے اثرات مسلمانوں کی زندگی پر بہت دور تک پہنچے۔ انھوں نے عرب کو ان تمام مسلمانوں پر فضیلت دی جن کا تعلق عرب خاندان سے نہ تھا۔ چنانچہ سب جانتے ہیں کہ خلافت کو قریش سے مخصوص کر دینے کی بنا پر مسلمان کیسے کیسے فتنوں میں مبتلا ہو گئے اور اسی برتری اور فضیلت کے تصور نے بنی اُمیّہ سے حکومت چھین کر بنی عباس کو دلادی۔

پس معلوم ہوا کہ صدرِ اول میں اسلام کا نظامِ حکومت دو خصوصیتیں رکھتا تھا۔ ایک معنوی یعنی دین جو نیکی اور انصاف کا حکم حاکم اور محکوم دونوں کو یکساں طور پر دیتا تھا دوسری خصوصیت ان خواص و اشراف کا وجود جو قابلیت، تقویٰ اور آزمائش میں نیز رسول اللہؐ سے قربت اور صحبت میں غیر معمولی درجہ رکھتے تھے۔ قریش نے بعد میں اسی دوسری خصوصیت سے کنارہ کشی کر لی یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ۔ یہ دونوں خصوصیتیں زمانہ اور اس کے حوادث کے ساتھ ساتھ باقی نہیں رہ سکتی تھیں۔ دین آشنا "زندہ" اور مضبوط دل کچھ لوگوں کو مل سکتا ہے لیکن اس کی توضمانت نہیں کی جاسکتی کہ بیٹوں اور پوتوں کو بھی وراثت میں وہی دل ملے گا۔ بلاشبہ جن لوگوں کو رسول اللہ کا قرب حاصل رہا اور جو براہ راست مشکوٰۃ نبوت سے تعلیم و تربیت کی روشنی حاصل کرتے رہے وہ اپنے اعمال، اقوال اور افکار میں وہ کیفیت پیدا کر سکتے ہیں جو سیرت نبوی کی نمائندگی کرتی ہو لیکن ان کی آنے والی نسل میں ایسی اولاد بھی ہو سکتی ہے جو ان کا نمونہ نہ ہو ان میں ایسے افراد بھی ہو سکتے ہیں جنھیں نبیؐ کی صحبت کا موقعہ بہت کم یا مطلق نہ ملا ہو، ایسی حالت میں اگر ان کے دلوں میں وہ مذہبیت وہ قوت اور وہ زندگی نہ ہو جو خاصانِ رسول کا حصّہ تھی تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہیے۔

پھر ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ حکومت کے معاملات اسی وقت ٹھیک ہوتے ہیں جب حاکم اور محکوم دونوں میں نظامِ حکومت سے متعلق تعاون اور اشتراک ہو۔ چنانچہ سیاسی مشکلات اور آویزشوں سے عہدہ برآ ہونے کے لئے یہ کافی نہیں کہ حاکم زندہ دل ہے، انصاف اور نیکی کے پھیلانے

میں موثر اور اللہ کی رضامندی کا حریص ہے، بلکہ اس کے لئے اس کی بھی ضرورت ہے کہ رعایا کے دل بھی زندہ ہوں ان میں انصاف اور نیکی کے لئے تڑپ ہو اور وہ بھی خدا کی خوشنودی کے لئے بے تاب ہوں۔

یہی وہ سب سے پہلی رکاوٹ تھی جو اس نئے نظام کی راہ میں حائل ہوئی۔ عرب سب کے سب رسول اللہ کے صحابہ نہ تھے ان کی اکثریت آپ کی صحبت نہ پا سکی۔ اور صحابہ کی تعداد کچھ بہت زیادہ بھی نہ تھی۔ پھر عام عربوں کے ایمان کو صحابہ کے ایمان سے کوئی نسبت نہ تھی بعضوں کا حال ٹھیک تھا اور بعض تو مسلمان تھے لیکن ایمان دار نہ تھے خود قرآن مجید کا ارشاد ہے۔

قَالَتِ الْأَعْرَابُ آمَنَّا قُلْ لَمْ تُؤْمِنُوا وَلَٰكِنْ قُولُوا أَسْلَمْنَا وَلَمَّا يَدْخُلِ الْإِيمَانُ فِي قُلُوبِكُمْ وَإِنْ تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُمْ مِنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

دیہاتی کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے کہہ دو کہ تم ایمان نہیں لائے بلکہ یوں کہو کہ ہم اسلام لائے ہیں اور ایمان تو ابھی تک تمہارے دلوں میں داخل ہی نہیں ہوا اور اگر تم خدا اور اس کے رسول کی فرماں برداری کروگے تو خدا تمہارے اعمال میں سے کچھ کم نہیں کرے گا بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔

اور بعض تو ایسے تھے کہ زبان سے اسلام کا کلمہ کہتے لیکن دل میں پوری "جاہلیت" بسا رکھی تھی خدا نے انھیں کی حالت کا نقشہ کھینچا ہے۔

الْأَعْرَابُ أَشَدُّ كُفْرًا وَنِفَاقًا وَأَجْدَرُ أَلَّا يَعْلَمُوا حُدُودَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ

دیہاتی لوگ سخت کافر اور سخت منافق ہیں اور اس قابل ہیں کہ جو احکام شریعت خدا نے اپنے رسول پر نازل (کئے ہیں ان سے ناواقف رہیں)

پس حاکم اور محکوم میں کوئی توازن نہیں تھا اور نہ خلیفہ اور اس کی زبردست عرب اکثریت رعایا میں کوئی صحیح اشتراک اور سچا اتحاد تھا، ہاں ممتاز صحابہ کا یہ طبقہ بلاشبہ خلیفہ کا معاون اور سچا مخلص تھا اور ان دونوں میں صحیح اشتراک اور سچا اتحاد تھا اور اسی اخلاص اور اتحاد کی بدولت حضرت ابوبکرؓ نہ صرف فتنۂ ارتداد کو فرو کرنے میں کامیاب رہے بلکہ آپ نے عربوں کا رخ فتوحات کی طرف پھیر دیا، پھر ہمیں یہ حقیقت بھی فراموش نہ کرنی چاہئے خواہ انسان کے بارے میں حسن ظن رکھنے والے

کتنا ہی پیچ وتاب کھائیں کہ یہ دین آشنا، بیدار اور زندہ دل اکثر ابتلا اور آزمائش کے آلام و مصائب کی آماجگاہ ہوتا ہے انسان بہت کوشش کرتا ہے کہ اس کا قلب حق اور انصاف کا گھر بنا رہے لیکن فتنہ و فساد کی لپیٹ اتنی سخت اور اس قدر پیہم ہوتی ہے کہ مجبور ہو کر شروع شروع میں تاویل کی زمین پر پاؤں ٹیک ہی دیتا ہے، پھر تاویل اور تعلیل کی مختلف منزلوں سے گذرتا گذرتا بالکل نئی شکل اختیار کر لیتا ہے اور جب وہ مڑ کر دیکھتا ہے تو اسے معلوم ہوتا ہے کہ اخلاص دیرینہ اور اس کے درمیان ایک بڑی لمبی مسافت حائل ہو چکی ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن نے نبی نے اور خلفاء و صالحین نے لوگوں کو دنیا اور فریب دنیا سے ڈرایا ہے اور ان تمام سرگرمیوں سے بچنے کی تاکید کی ہے جو ان کے لئے فتنہ اور ابتلا کا باعث ہوں، ان کی نیکیوں کو اپنی بدیوں کے ساتھ بہا لے جائیں انھوں نے ایسے ارادوں اور کاموں سے روکا ہے جو خوبیوں اور اچھائیوں کو اس طرح جلا کر راکھ کر دیں جس طرح آگ لکڑی کو، ان حالات میں ذرا بھی حیرت نہ ہونی چاہئے اگر بہت سے بزرگ حتی کہ بعض صحابہ بھی فتنہ اور فریب کی لپیٹ میں آگئے ہوں اور ان پر ایسے مصائب اور حوادث گذرے ہوں جنہوں نے ان کو اس فضا سے دور کر دیا ہو جس میں وہ دن رات نبی کی صحبت میں رہتے تھے اور جن کا یہ حال تھا کہ

اِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ	کہ جب خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل ڈر جاتے
وَاِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ اٰيٰتُهٗ زَادَتْهُمْ	ہیں اور جب انھیں اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی
اِيْمَانًا وَّعَلٰى رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُوْنَ	جاتی ہیں تو ان کا ایمان اور بڑھ جاتا ہے اور وہ
	اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں۔

آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ فریب اور فتنے کے اسباب بکثرت تھے اور ان میں اتنی قوت اور دل کشی تھی کہ اس کی تاب صرف اولوالعزم لا سکتے تھے جن کی تعداد ہر زمانہ میں بہت کم رہی ہے میری طرف سے اس میں نہ رنگ آمیزی ہے نہ تکلف، نہ دل آزاری نہ کینہ پروری لیکن میں اصحاب رسولؐ میں ایک ایسی جماعت پاتا ہوں جس نے اسلام کی راہ میں آزمائش کی وہ منزل

پالی جہاں پہنچ کر خود نبیؐ نے اپنی خوشنودی کا اظہار فرما کر اس کے لئے جنت کی ضمانت کی، پھر ایک زمانہ گذرنے کے بعد ایسے حالات نے ان کا استقبال کیا جن میں قوت واقتدار کے ساتھ ساتھ مال و دولت کی فراوانی تھی، وہ اس امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکے، ان کے معاملات میں خرابی آئی، ایک دوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہو گیا، بعض نے بعض کو قتل تک کر دیا، باہم دگر اتنے بدخواہ اور بدگمان ہو گئے جتنا کوئی انسان دوسرے سے ہو سکتا ہے، آپ اندازہ کیجئے کہ ان کے متعلق ہمارا نقطۂ نظر کیا ہو؟ ہم ان سب کے کارناموں سے اپنی رضامندی اور اتفاق کا اظہار نہیں کر سکتے کہ اس میں نہ صرف اپنی عقلوں کو معطل اور فکروں کو تاریک کر لینا ہے بلکہ دین کی عمارت کو بھی ڈھا دینا ہے جو حق و انصاف کی بنیاد پر اچھائیوں کے پھیلانے اور برائیوں کے روکنے پر قائم ہے اور نہ ہم ان میں ان لوگوں کو بھی خطا کار کہہ سکتے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ انھوں نے خطا کی ہے اس لئے کہ اول تو نبیؐ کے دربار میں ان کا ایک درجہ ہے، دوسرے نبی نے خدا کی خوشنودی اور جنت کی بشارت سے ان کو نوازا ہے، پھر اللہ اور اس کے رسول کے ساتھ ان کا حسنِ ظن اور اس کے وعدوں پر ان کا پختہ یقین بھی ہم کو اس کی اجازت نہیں دیتا، اور ہماری طبیعت کو یہ بھی گوارا نہیں کہ ان کے معاصرین کا مسلک اختیار کر لیں اور کسی کو حق پر اور کسی کو ناحق پر بتا دیں، اس لئے کہ ان کے معاصرین نے اپنی شرکت کی وجہ سے اپنے ماننے والوں کو حق پر سمجھا اور ان کی حمایت کی اور مخالفین کو غلط کار جانا اور مخالفت کی لیکن ہم تو ان حوادث میں شرکا کی حیثیت نہیں رکھتے اور نہ ان کے مابین اختلافی امور سے ہمارا تعلق، پس یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اپنے جذبات کو ان کے معاملات میں بے لگام کر دیں ہمارے لئے صحیح راستہ تو یہی ہے کہ ہم صرف ان کی ان باتوں اور ان کے کاموں پر نظر ڈالیں جن کا تعلق عوام کی زندگی اور تاریخ کے واقعات سے ہے اور صرف اسی نقطۂ نظر سے ان کو صائب یا خطا کار تصور کریں ان کے دین کے متعلق ہم کوئی فیصلہ نہ کریں اس لئے کہ دین اللہ کے لئے ہے ہمارے لئے یہ ہرگز ہرگز جائز نہیں کہ ہم ان کے معاصرین کی طرح یہ کہیں کہ یہ کافر ہیں اور یہ مومن، اور یہ بین بین، یا یہ کہ یہ جنتی ہیں اور یہ جہنمی، ہمیں یہ بحث نہیں کرنی چاہیئے اور نہ اس پر

بحث ہمارا حق ہے، یہ بات صرف خدا سے متعلق ہے ہمیں تو ان کے اعمال، اقوال اور سیرتوں میں صرف یہ پتہ چلانا چاہیئے کہ کون سی بات حق اور انصاف سے قریب ہے اور کون نہیں، اور یہی بقدر ضرورت

آپ نے دیکھا کہ صدر اول کے اسلامی نظام حکومت کی دو خصوصیتوں میں سے ایک یعنی دین آشنا دل کس طرح خطاؤں اور فریبوں کی منزل بنتا ہے اگر نبیؐ کے تمام صحابہ بے خطا ہوتے اور فتنہ و فساد سے بچ جاتے اور اس عصمت و اتقا کے ہاتھوں ان کے تمام معاملات ٹھیک ہو جاتے تب بھی ان کی اولاد مختلف مشکلات اور مصائب سے دوچار ہو کر رہتی۔

بس اس بات کی سخت ضرورت تھی کہ مسلمان اس زمانے میں تنہا دین آشنا اور متقی دل پر بھروسہ نہ کرتے اور خلیفہ کی للٰہیت کو بھی کافی نہ سمجھتے، بلکہ ایک ایسا نظام مرتب کر لیتے جو تحریری شکل میں حکومت کے مجمل اور مفصل حدود پر مشتمل ہوتا اس میں خلفاء کے فرائض بتائے جاتے کہ وہ یہ، یہ کریں یہ نہ کریں، ان ان معاملات میں ان کے لئے رخصت ہے اسی طرح اس میں عوام کے حقوق و فرائض بھی تفصیل سے لکھے جاتے۔ اس میں ان وسائل اور ذرائع کا بھی تذکرہ ہوتا جن کے ماتحت عوام خلیفہ کا انتخاب کرتے اور انتخاب کے بعد خلیفہ کا احتساب اور اس پر اپنی نگرانی قائم کرتے اور اگر اسے راہ حق سے منحرف پاتے تو ماخوذ کرتے اور سزا دیتے، مسلمانوں کو ضرورت تھی کہ وہ قرآن اور سنت کی روشنی میں ایک تحریری دستور وضع کرتے جس کے صاف صاف اشارات اور نکات ان کو اختلافات اور فرقہ بندیوں سے بچاتے اگر وہ ایسا کر سکتے تو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں جو کچھ پیش آیا اس سے اپنے آپ کو بچا لے جاتے ذرا ایک مثال ملاحظہ فرمایئے جو عوام کے لئے سخت حیرت انگیز ہے موافقین کے لئے خوش کن اور مخالفین کے لئے غصہ دلانے والی حضرت عثمانؓ سے ان بعض عطیات کے بارے میں بحث کی گئی جو انھوں نے اپنے رشتہ داروں کو دیا تھا حضرت عثمانؓ فرماتے ہیں "عمرؓ خدا سے ڈر کر اپنے رشتہ داروں کو محروم رکھتے اور میں خدا سے ڈر کر صلہ رحمی کرتا ہوں اور ہم میں آج عمرؓ جیسا کون ہے؟" یعنی حضرت عمرؓ مسلمانوں کے مال سے اپنے عزیزوں کو محروم رکھ کر نیک اور مخلص تھے اور حضرت عثمانؓ اپنے رشتہ داروں کو مسلمانوں کا مال دے

کر نیک اور مخلص ہیں اس لئے کہ اللہ کا حکم ہے کہ صلہ رحمی کیا کرو۔

حضرت عثمانؓ کا یہ جواب فقہی تاویل کرنے والوں کے نزدیک ممکن ہے درست ہو لیکن مصلحت عامہ کسی طرح اس کی تائید نہیں کر سکتی۔ یہ مال یا تو عوام کا ہے اور ایسی حالت میں بغیر عوام کی اجازت کے خلیفہ اس میں تصرف کا مجاز نہیں یا پھر خلیفہ کا ہے اور اس صورت میں عوام کا اس کے تصرف پر اعتراض کرنا غلط ہے لیکن یہ کہ بعض خلفا اس مال کو عام مسلمانوں کے لئے مخصوص اور محفوظ کر کے خدا سے قربت حاصل کریں اور بعض صلہ رحمی میں اس کو خرچ کر کے خدا کے عبادت گذار بنیں یہ صحیح نہیں، کھلی ہوئی بات ہے کہ اس سلسلے میں ہم حضرت عمرؓ کا مسلک پسند کریں گے کیوں کہ وہی حق و انصاف کے قرین اور خلفاء کے لئے جس پاک بازی اور بے نفسی کی ضرورت ہے اس کے مناسب حال ہے نیز عوامی معاملات کے احساس کا یہی تقاضا ہے، جیسا کہ آج بھی ہم سمجھ سکتے ہیں

ایک دوسری مثال جس کی روایت مورخین کرتے ہیں، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ اس پر خوش ہوں یا حیران، حضرت عثمانؓ نے اپنے مخالفین کے شدید محاصرے میں ان سے کہا "اگر خدا کی کتاب میں میرے پاؤں میں بیڑی ڈالنے کا حکم تم پاتے ہو تو ڈال دو" کیا یہ بات حضرت عثمانؓ نے اپنے مخالفین پر عتاب کرتے ہوئے خدا کا حکم تسلیم کرنے کے لئے کہا تھا اگر ایسا ہے تو کتاب اللہ میں کہاں یہ حکم ہے جو مسلمانوں کو اجازت دیتا ہو کہ اپنے امام کے دونوں پاؤں میں بیڑی ڈال دیں، یا آپ نے بطور چیلنج فرمایا۔ اس لئے کہ آپ جانتے تھے کہ قرآن مجید میں اس قسم کا کوئی تذکرہ نہیں اور اس میں کوئی ایسی آیت نہیں ہے جو غلطی کرنے یا راہ سے ہٹنے پر خلیفہ کے پاؤں میں بیڑیاں ڈال دینے کا حکم مسلمانوں کو دیتی ہو۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ سمجھتے تھے کہ ان کے مخالفین کتاب اللہ سے کوئی دلیل نہیں لا سکتے اور یہ کہ انھوں نے جو کچھ کیا اسے کرنے کا وہ حق رکھتے تھے اور اپنے اس عمل میں نہ وہ مجرم ہیں نہ کسی غلطی کی لپیٹ میں۔

اگر مسلمانوں کے پاس یہ لکھا ہوا نظام اور دستور ہوتا تو حضرت عثمانؓ کے زمانے میں وہ بلا اختلاف و بلا تفریق باخبر ہوتے کہ انھیں دستور کے ماتحت کیا کرنا چاہیئے

مسلمانوں کے لئے اس قسم کے نظام کے سلسلے میں غالباً ایک روشن مثال کے طور پر وہ روایت پیش کی جاسکے جس میں بتایا گیا ہے کہ عبدالرحمن بن عوف نے حضرت علیؓ سے کہا کہ میں اس شرط پر آپ کی بیعت کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کتاب و سنت اور شیخین کی سیرت کی پابندی کریں گے اور خلاف ورزی نہ ہونے دیں گے تو حضرت علیؓ نے اس شرط کو منظور نہیں فرمایا اور کہا

اللّٰھم لا! ولکن اجتھد فی ذالک — ایسا نہیں ہوسکتا مجھ سے جس قدر ہو سکے گا کروں گا

وانی ما استطعت

حضرت علیؓ بتانا چاہتے تھے کہ وہ ایک ایسی بات کی پابندی نہیں کر سکتے جس کی کوئی صورت نہیں نکل سکتی اس لئے کہ قرآن اگرچہ لکھا ہوا ہے اور سینوں میں محفوظ ہے لیکن وہ حکومت کی سیاسیات اور اس کے روزمرہ کے واقعات سے تفصیلی بحث نہیں کرتا اور نبی کی سنت بہرحال شائع ہے لیکن اس میں بعض حدیثیں ایسی ہیں جو غیر حاضر کو تو حفظ ہیں لیکن حاضر اس سے بے خبر ہے پھر بہت سی حدیثیں فتنہ ارتداد اور فتوحات کی لڑائیوں میں شہید صحابہ کے ساتھ دنیا سے چلی گئیں، اب رہی شیخین کی سیرت تو وہ بھی سنت نبوی کی طرح سب کی سب معلوم اور محفوظ نہیں اور پھر حضرت علیؓ کو پورا پورا حق تھا کہ وقت اور حالات کے بدلنے پر شیخین کی سیرت سے اختلاف کریں اور اگر انھیں شیخین کی سیرت سے اختلاف میں عوام کا مفاد اور مسلمانوں کی خیر خواہی نظر آئے تو وہ ضرور اختلاف کریں۔ جب عبدالرحمن بن عوف نے یہی شرط حضرت عثمانؓ کے سامنے پیش کی تو انھوں نے اللّٰھم نعم کہہ کر منظور کر لیا مقصد یہ تھا کہ وہ کتاب و سنت اور سیرت شیخین نافذ کرنے کی کوشش کریں گے اور اگر وہ اخلاص کے ساتھ اس کی کوشش کرتے تو ان کے لئے کتاب و سنت اور سیرت شیخین کی شدید پابندی ضروری تھی بلاشبہ لیکن آپ نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ کے ابتدائی دور خلافت میں کیا ہوا، حضرت عثمانؓ نے مسلمانوں کے مال کے بارے میں وہ مسلک اختیار کیا جو حضرت عمرؓ وان کی سیرت کے ٹھیک

حضرت عثمانؓ کا جواب ٹھیک تھا اور حضرت عثمانؓ نے بھی ....

خلاف تھا، اب جن لوگوں نے اس خیال سے بیعت کی تھی کہ حضرت عثمانؓ سیرتِ شیخین کی پابندی کریں گے انھوں نے دیکھا کہ حضرت عثمانؓ نے اپنے عہد کی پوری پابندی نہیں کی لیکن خود حضرت عثمانؓ سمجھتے تھے کہ انھوں نے سیرتِ عمرؓ کی ذرا بھی خلاف ورزی نہیں کی اور کسی حالت میں بھی اپنے عہد کو نہیں توڑا ان کی نظر میں حضرت عمرؓ کی سیرت کا جوہر خدا سے قرب حاصل کرنا تھا اور صلۂ رحمی کے ذریعے انھوں نے خدا سے قرب حاصل کیا پس انھوں نے وہی کیا جو حضرت عمرؓ اور حضرت ابوبکرؓ کرتے تھے اللہ سے قرب حاصل کرنے کے ذرائع میں اختلاف کی ذمہ داری تو حضرت عثمانؓ پر نہیں ڈالی جا سکتی اب اگر اس وقت مسلمانوں کے پاس کوئی لکھا ہوا انتظام ہوتا جس میں حدود اور نکات نمایاں اور واضح ہوتے تو حضرت علیؓ اس نظام پر بیعت سے ہرگز انکار نہ کرتے اور نہ حضرت عثمانؓ کو اس کی ضرورت پیش آتی کہ تاویل سے کام لیں اور نہ عوام دو جماعتوں میں منقسم ہوتے۔

ہمیں یہ بھی نہ بھولنا چاہیے کہ حضرت عمرؓ کی شہادت ہجرت کے ۲۳ سال بعد ہوئی یعنی حکومت کے قیام اور ہجرت پر پورے ۲۵ سال بھی نہیں گذرے تھے، پھر یہ مختصر مدت بھی اس طرح نہیں گذری کہ زندگی مطمئن اور معاملات درست ہو گئے ہوں دلوں کو سکون اور دماغوں کو راحت مل گئی ہو، اس میں دس سال تو عربوں کو اسلام کی دعوت دینے میں صرف ہوئے، ایک سال سے کچھ زیادہ دن فتنۂ ارتداد کے فرو کرنے میں لگے بقیہ دن دنیا کے گوشوں میں اسلام پہنچانے کے لئے عربوں کو آمادہ کرنے میں صرف ہوئے اس کے بعد ہی ایران میں انقلاب آیا، مصر و شام سے رومی رخصت ہوئے، فوج کی ترتیب اور تنظیم عمل میں آئی بڑے بڑے شہر بسائے گئے امن و جنگ کے سلسلے میں ابتدائی قواعد بنے، پھر ان محکموں کی داغ بیل پڑی جن کا تعلق بلادِ عربیہ کے داخلی معاملات اور بیرونی ممالک کے خارجی امور سے تھا، پس یہ انصاف نہ ہوگا کہ صدرِ اول کے مسلمانوں پر کوئی معترض ہو کہ انھوں نے اپنی طرف سے کوئی کوتاہی کی اور جو کچھ وہ کر سکتے تھے وہ نہ کر سکے۔

پھر اگر یہ حقیقت بھی پیش نظر رکھی جائے کہ حکومت کے معاملات میں تنظیم کے جو اقدامات شیخین فرماتے تھے وہ اس بدوی ماحول اور عربی سماج کے لئے جو سیاست، تمدن اور تنظیم سے یکسر ناآشنا تھا ایک ایجاد اور اختراع کا مرتبہ رکھتے تھے اور نہ صرف ایجاد و اختراع کی پیش کش، بلکہ انھوں نے اس قوم کو منظم کر دیا جو کسی تنظیم کی عادی نہ تھی اس کو مہذب اور متمدن بنا دیا جس میں پہلے سے تہذیب و تمدن کے آثار نہ تھے تب تو سچائی اور حق سے بڑی دوری ہو گی کہ یہ کہہ دیا جائے کہ شیخین نے مسلمانوں کے لیے جیسی تنظیم چاہئے تھی نہیں کی، حضرت عمرؓ خدا ان پر اپنی رحمت برسائے اس سلسلے میں اپنی انتہائی امکانی کوشش صرف فرمایا کرتے تھے، چنانچہ جیسے ہی کسی متمدن قوم کے کسی طریق کار کا پتہ چلتا اس کو معلوم کرتے اور نہایت گہری چھان بین کر کے اس میں سے وہ جز جو عربی مزاج، اسلامی افکار اور اس نوخیز حکومت کے مناسب حال ہوتا نکال لیتے،

اس سیاسی نظام کی دوسری خصوصیت یعنے صحابہ کے ممتاز افراد کا طبقہ تو وہ بھی طبعی طور پر ایک مدت گذر جانے کے بعد بہر حال زوال کی زد میں آتا اور ایک ایسی جدید نسل پیدا ہوتی جس کو اس امتیاز سے کوئی نسبت نہ ہوتی پس ضروری تھا کہ اس آنے والی نسل کے سامنے ایک مقررہ مرتبہ نظام ہوتا جو اس کو بتاتا کہ خلیفہ کا انتخاب کس طرح ہو اور انتخاب کے بعد اس پر کس طرح احتساب قائم کیا جائے اور اگر وہ خطا کا مرتکب ہو تو کس طرح سزا دی جائے، یہ نظام اگر وضع کر دیا گیا ہوتا تو حضرت عثمانؓ کی شہادت کے بعد مسلمانوں کا شیرازہ اس طرح منتشر نہ ہوتا جس طرح تاریخ بتاتی ہے، مسلمانوں میں خوارج کی وہ جماعت نہ ہوتی جو سنت نبی اور شیخین کی اندھی اتباع پر مصر تھی نہ وہ جماعت ہوتی جو بضد تھی کہ امامت اہل بیت ہی کا حصہ ہے، نہ وہ جماعت ہوتی جو خلافت کو قیصریت اور کسرویت کا جامہ پہنانا چاہتی تھی اور نہ وہ جماعت ہوتی جو چاہتی تھی کہ مسلمانوں کے معاملات شوریٰ کے ذریعے طے ہوں لیکن اس کا کوئی نظام یا خاکہ اس کے پاس موجود نہ تھا۔

لیکن جو کچھ ہم نے پہلی خصوصیت کے سلسلے میں عرض کیا تھا وہی اس خصوصیت سے متعلق بھی دہرانا چاہتے ہیں کہ شیخین اور ان کے ساتھیوں کو تہذیب و ترقی کے مسلسل مشاغل نے وہ سکون

اور فرصت نہیں دی جوان کو اس قسم کا نظام مرتب کرنے کا موقع دیتی، یہ کام ان لوگوں کا تھا جو بعد میں آئے اور فرصت و فراغت کے علاوہ کافی مال و دولت کا انبار اپنے ساتھ لائے، لیکن انھوں نے حکومتوں کے بدلنے کے لئے کوئی نظام بنایا اور نہ ایسا کوئی دستور مرتب کیا جس میں سیاسی اور سماجی انصاف کی رعایت پیشِ نظر ہو انھوں نے تو انتہائی غفلت برتی اور صرف اس بات کو اچھا سمجھا کہ وہ خود کس طرح حاکم، غالب اور اونچے بنے رہیں"۔

مگر ان لوگوں پر بھی کیا ملامت کی جائے، اگر ہم غور کریں کہ دنیا کو دستور سازی کا علم کب سے ہوا تو معلوم ہوگا کہ یہ ابھی پچھلے دنوں کی پیداوار ہے یہ کوئی بہت قدیم چیز نہیں میں جانتا ہوں کہ قدیم یونانی شہروں میں لکھے ہوئے سیاسی دستور تھے میں یہ بھی جانتا ہوں کہ روم کا بھی ایک مقررہ سیاسی نظام تھا لیکن اسی طرح میں یہ بھی جانتا ہوں کہ مشرق اور مغرب دونوں میں "شاہی" نے ان نظاموں اور دستوروں کو معطل کر دیا اور عوام سے اس کو اس قدر دور رکھا کہ انسانیت اس کو تقریباً بھلا چکی اور آج یہ نئی دنیا اسی فراموش کردہ حقیقت کا تدریجی طور پر انکشاف کر رہی ہے۔

علاوہ ازیں ایک اور بات قابلِ غور ہے جس کی طرف میں نے سلسلہ کلام میں اشارہ کیا ہے اور وہ یہ کہ حضرت عمرؓ ہر سال موسم حج کے موقع پر اسلامی قلمرو کے مختلف گورنروں اور ان کے باشندوں سے ملاقاتیں کرتے تھے گورنروں سے رعایا کے بارے میں اور رعایا سے گورنروں کے متعلق ان کے افکار و خیالات سنتے تھے اور تفصیلی باتیں کرتے تھے یہ طریقہ آپ نے مقرر کر لیا تھا اور بجز اپنی خلافت کے پہلے سال کے زندگی بھر اس پر عمل کرتے رہے، اگر حضرت عمرؓ کی زندگی کے اسباب کچھ بڑھ جاتے تو بہت ممکن تھا کہ گورنروں اور رعایا کا یہ اجتماع آپ کی فراست، بصیرت اور مسلمانوں کی خیر خواہی کے پیش نظر ایک مستقل نظام کی شکل میں تبدیل ہو جاتا جو اگر وہ پارلیمنٹری نظام نہ ہوتا جو قدما جانتے تھے اور جسے عصرِ جدید نے تلاش کیا ہے تو اس کے قریب تر ضرور ہوتا حضرت عمرؓ اسی موسمی اجتماع پر قناعت نہیں کرتے تھے بلکہ جس قدر مزید چھان بین بھی آپ سے ممکن تھی کرتے تھے۔ مدینہ منورہ اور اس کے قرب و جوار میں تو خود ہی تحقیق و تلاش کر لیتے اور دور دراز کے مقامات

کے لئے اپنے عمال اور اپنے سکرٹیری وقتاً فوقتاً بھیجتے رہتے، علاوہ ازیں وہ رپورٹیں بھی آپ کے پیش نظر ہوتیں جو لوگوں کے معاملات سے متعلق کبھی گورنروں کے ذریعے اور کبھی رعایا کے ذریعے پہنچتی رہتیں، اس پر بھی زندگی کے آخری دنوں میں آپ سوچ رہے تھے کہ تمام صوبوں کا احتسابی معائنہ کرنے کے لئے ایک دورہ کریں چنانچہ گفتگو میں اظہار فرماتے تھے کہ اگر زندگی نے وفا کی تو ہر شہر میں دو ماہ رہ کر دیکھوں گا کہ گورنر کس طرح کام کرتے ہیں اور ان کے کاموں سے رعایا کی رضامندی کا کیا حال ہے لیکن موت نے موقع نہ دیا اور آپ کے قبر میں اترتے ہی مسلمانوں کی سیاست دوسرے رخ پر چل پڑی۔

شاید اس بحث کا حق ادا نہ ہوگا اگر ہم حضرت عمرؓ کے اس طرز عمل پر روشنی نہ ڈالیں جو ممتاز صحابہ کے ساتھ آپ نے ضروری قرار دیا تھا اس سے پہلے ہم نے بتایا ہے کہ حضرت عمرؓ نے ان کو مدینہ چھوڑ کر کہیں جانے کی اجازت نہیں دی تاکہ نہ ان پر کوئی مصیبت آئے اور نہ وہ کسی مصیبت کا باعث بنیں حضرت عمرؓ کی یہ سیاست نہایت کامیاب سیاست تھی اور کیوں نہ ہم آج کی بولی میں حقیقت کا اظہار کریں اور چیزوں کی تعبیر ان کے اصلی ناموں سے کریں اور کہیں کہ حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو مدینہ منورہ میں اس لئے روکے رکھا کہ کہیں ان کے اثرات عوام میں نہ بڑھ جائیں عوام میں ان کے اثر و رسوخ کا بڑھنا خود ان کے لئے اور عام مسلمانوں کے لئے کسی طرح مفید نہ تھا، چنانچہ جب تک حضرت عمرؓ نے ان لوگوں کو مدینہ منورہ میں روکے رکھا اور ان کی نقل و حرکت کا دائرہ محدود رہا، مسلمانوں کے معاملات اور خود اس ممتاز طبقے کے حالات ٹھیک رہے لیکن جب حضرت عثمانؓ کا زمانہ آیا اور ان کے لئے نقل و حرکت کا راستہ صاف ہوا تو فتنہ و فساد نے پوری فضا گرد آلود کر دی اس لئے نہیں کہ صحابہ کے اس طبقے نے قصداً کوئی خرابی پیدا کی بلکہ اس لئے کہ ایک طرف تو ان کے پاس دولت کی فراوانی ہوئی جس نے حامیوں کی زبردست جماعت پیدا کر دی اور دوسری طرف عوام فرطِ عقیدت سے ان کی طرف جھک پڑے چنانچہ ان میں سے ہر ایک کے پاس حامیوں اور ساتھیوں کی اچھی خاصی تعداد جمع ہوگئی، حضرت

عمرؓ نے کبھی یہ گوارا نہیں کیا کہ مسلمانوں کے مال میں سے بطور صلہ یا اپنی عنایت خاص یا دل جوئی کی بنا پر لوگوں کو عطیات دیں، ان کا طریق کار یہ تھا کہ وہ عام مسلمانوں اور صحابہ دونوں کے لئے یکساں طور پر ایک مقررہ رقم عطیہ کرتے تھے، اور کاروبار کی اجازت دیتے تھے، جس طرح خدا نے دی ہے، لیکن جب حضرت عثمانؓ خلیفہ ہوئے تو انھوں نے صحابہ کو نہ صرف مختلف مقامات پر سفر کرنے اور قیام کی اجازت دے دی بلکہ ان کو بیت المال سے گراں قدر صلات و انعامات بھی دیئے کہا جاتا ہے کہ انھوں نے ایک دن حضرت زبیر کو ۶ لاکھ اور حضرت طلحہ کو دو لاکھ کا عطیہ دیا کسی جماعت کو بھی اگر اس طرح دولت ملنے لگے اور پھر اس کے لئے موقع ہو کہ وہ ملک کے مختلف حصوں میں زمینیں خریدے، شہروں میں مکانات بنوائے، حجاز میں بڑے بڑے محل تعمیر کرے، ہر جگہ اپنے خدام اور حامیوں اور ہوا خواہوں کی تعداد بڑھائے تو اس کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس پر فتنہ اور فساد کے دروازے کھول دیئے گئے اب یہ دشوار تر ہوگا کہ اس کے افراد ان دروازوں میں داخل ہونے سے رکے رہیں۔ ہاں رکنے والے رکے، چنانچہ سعد ابن ابی وقاص نے کنارہ کشی اختیار کی جن دنوں فتنہ و فساد کی آگ بھڑک رہی تھی وہ گوشہ نشین رہے عبدالرحمٰن بن عوف رکے رہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمانؓ کے انتخاب پر ان کو ندامت رہی اور یہ کہ وہ بقیہ ایام دار الہجرۃ ہی میں اپنے تجارتی کاروبار میں مصروف رہے اور اپنی بچت کا کافی حصہ اسی طرح خیرات کرتے رہے جس طرح رسول اللہؐ اور شیخین کے عہد میں کرتے تھے۔ حضرت علیؓ رکے رہے، چنانچہ ہمیں نہیں معلوم کہ آپ نے کوئی تجارت کی یا کہیں کوئی زمین خریدی یا مکان لیا آپ مدینے میں اسی جگہ مقیم رہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے آپ کو رکھا تھا، ہاں ینبع میں آپ کی کچھ جائداد تھی جہاں کبھی کبھی آپ جایا کرتے تھے لیکن حضرت علیؓ سے متعلق ایک اور بات ہے جو کہی جاتی ہے۔

ان تمام باتوں کا لب لباب یہ ہے کہ حضرت عمرؓ نے اس ممتاز طبقے کو اور عام مسلمانوں کو اس مصیبت سے بچایا جو اثر و اقتدار کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے اور ان سبھوں کو ان کے دین

پر قایم رکھا، اور وہ خود ان کے اور فتنہ و فساد کے درمیان دیوار بنے رہے اور خاصانِ رسول میں سے ایک مجلس تشکیل دی جسے آپ کی مجلس شوریٰ کہا جا سکتا ہے اور اور اگر کچھ دنوں آپ اور زندہ رہتے تو انھیں مجبور کرتے کہ وہ اپنے اسی درجہ پر قناعت کریں اور خلفار کے لئے شیروں کی طرح اربابِ حل و عقد بنے تفصیلی احکام میں مداخلت سے بلند و بالا رہیں۔

ایک دوسری بات یہ کہ جب حضرت عمرؓ کو محسوس ہو گیا کہ وہ دنیا سے سفر کرنے والے ہیں تو انھوں نے رسولؐ کی اتباع میں کسی مقرر شخص کو خلیفہ نہیں بنایا اور صدیق اکبرؓ کی اتباع میں مسلمانوں کو بلا مشورہ اور نصیحت بھی نہیں چھوڑا چنانچہ آپؓ نے اصحاب شوریٰ کو پسند کیا جن کا نبیؐ کے دربار میں مقررہ درجہ ہے جن کو مہاجرین اور قریش کی سرداری حاصل تھی جن کو عام مسلمانوں کی رضامندی اور اعتماد حاصل تھا۔ پھر عام مسلمانوں کو اجازت دے دی کہ ان میں سے جن کو چاہیں اپنے لئے خلیفہ پسند کرلیں۔

آگے چل کر آپ کو معلوم ہوگا کہ حضرت عمرؓ نے جو نظامِ شوریٰ وضع کیا وہ کافی نہ تھا اور نہ اس پر قناعت کی جا سکتی تھی لیکن توجہ اور اہمیت کی بات یہ ہے کہ انھوں نے خلفار کے انتخاب اور اختیار میں شوریٰ کو اصل قرار دیا اور یہ کوئی معمولی اقدام نہ تھا پھر یہ بھی نہ بھولنا چاہئے کہ یہ کام حضرت عمرؓ اس وقت کر رہے تھے جب آپ کا جسم قاتل کے خنجر سے زخمی تھا، آپ دنیا چھوڑ کر سفرِ آخرت کی تیاری کر رہے تھے، اس وقت آپ پر وہ سب کچھ گذر رہا تھا جو موت سے قریب مجروح انسان پر گذرتا ہے۔ پھر آپ کا دل خدا کے خوف اور اپنے چھوٹے بڑے اعمال کی حساب دہی کی ہیبت سے بیدار اور باخبر تھا، اس وقت آپ اس فکر میں بھی مبتلا تھے کہ اپنا کچھ انتظام کریں اور گھر والوں کا بھی بند و بست ہو، گھر والوں کا بند و بست یہ کہ ان کو ان ذمہ داریوں سے دور رکھیں جو خود اپنے سر لے رکھی تھیں اور اپنا انتظام یہ کہ خدا سے اس حالت میں ملیں کہ مسلمانوں کے مال میں سے ایک پائی کی ذمہ داری بھی ان کے سر نہ ہو اور ان سب افکار سے بڑھ کر آپ کو اپنی قبر کا خیال تھا آپ کی آرزو تھی کہ اپنے دونوں ساتھیوں کے پہلو میں دفن ہوں اور اس کے لئے حضرت عائشہؓ کی اجازت

ضروری تھی چنانچہ بے تابی تھی کہ مرنے سے پہلے حضرت عائشہؓ کی اجازت، حاصل ہو جائے اور مطمئن ہو جائیں کہ عبداللہ (ابن عمرؓ) وفات کے بعد حضرت عائشہؓ کے گھر میں دفن کر سکیں گے، ان تمام افکار کی موجودگی میں حضرت عمرؓ نے شوریٰ کا ایک نظام سوچا اور اس میں اپنے بس بھر احتیاط اور دور اندیشی ملحوظ رکھی۔

حضرت عمرؓ کی وفات اور ایک خلیفہ کے منتخب ہو جانے کے بعد مسلمانوں کا فرض تھا کہ وہ اس نظام شوریٰ پر غور کرتے اور ایک مستحکم بنیاد پر اس کا قیام اس طرح عمل میں لاتے کہ مسلمانوں میں نہ تو تفریق ہوتی اور نہ اُن کا خلیفہ تیزی کے ساتھ حوادث اور آویزش کا شکار ہوتا۔ لیکن حیرت کی بات ہے کہ مسلمانوں نے یہ کچھ نہ کیا اور حضرت عثمانؓ نے خلیفہ ہوتے ہی عطیات میں اضافہ کر دیا جو پابندیاں حضرت عمرؓ نے صحابہ پر لگا رکھی تھیں انھیں اٹھا دیا اور اجازت دے دی کہ جس کا جہاں جی چاہے جا کر آباد ہو اور اس کا کھلی موقع دے دیا کہ لوگ اپنی دولت اور گروہ بڑھائیں۔

اوپر کی سطروں میں جو کچھ میں نے عرض کیا ناظرین اسے ایک طویل داستان کہیں گے لیکن میرے خیال میں یہ بہت مختصر ہے بہر حال طویل ہو یا مختصر وہ حضرت عثمانؓ اور ان کے عہد کے فتنوں پر گفتگو کی تمہید ہے۔ اور اس میں کھلی ہوئی شہادت اس بات کی ہے کہ جو حوادث پیش آئے اور وہ جن نتائج تک پہنچے وہ ان اشخاص اور افراد کے بس سے باہر تھے جنھوں نے دور نزدیک سے ان میں کم و بیش حصہ لیا اور اس لئے انھیں ملزم قرار نہیں دیا جا سکتا اور نہ ملامت کی جا سکتی ہے البتہ ماحول اور حالات پر اگر عقل اجازت دے تو الزام لگایا جا سکتا ہے۔

نقشہ ملک مغرب
آندلس
اطالیہ
یونان
بحر اسود
ج صقلیہ
بحر متوسط
قیروان
مہدیہ
تاہرت
فاس
طرابلس
برقہ
اسکندریہ
افریقیہ
مصر
نیل
فرات
دجلہ
جزیرۂ عرب
بحیرۂ قلزم

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(ایک سیاح کے مشاہدات)

از
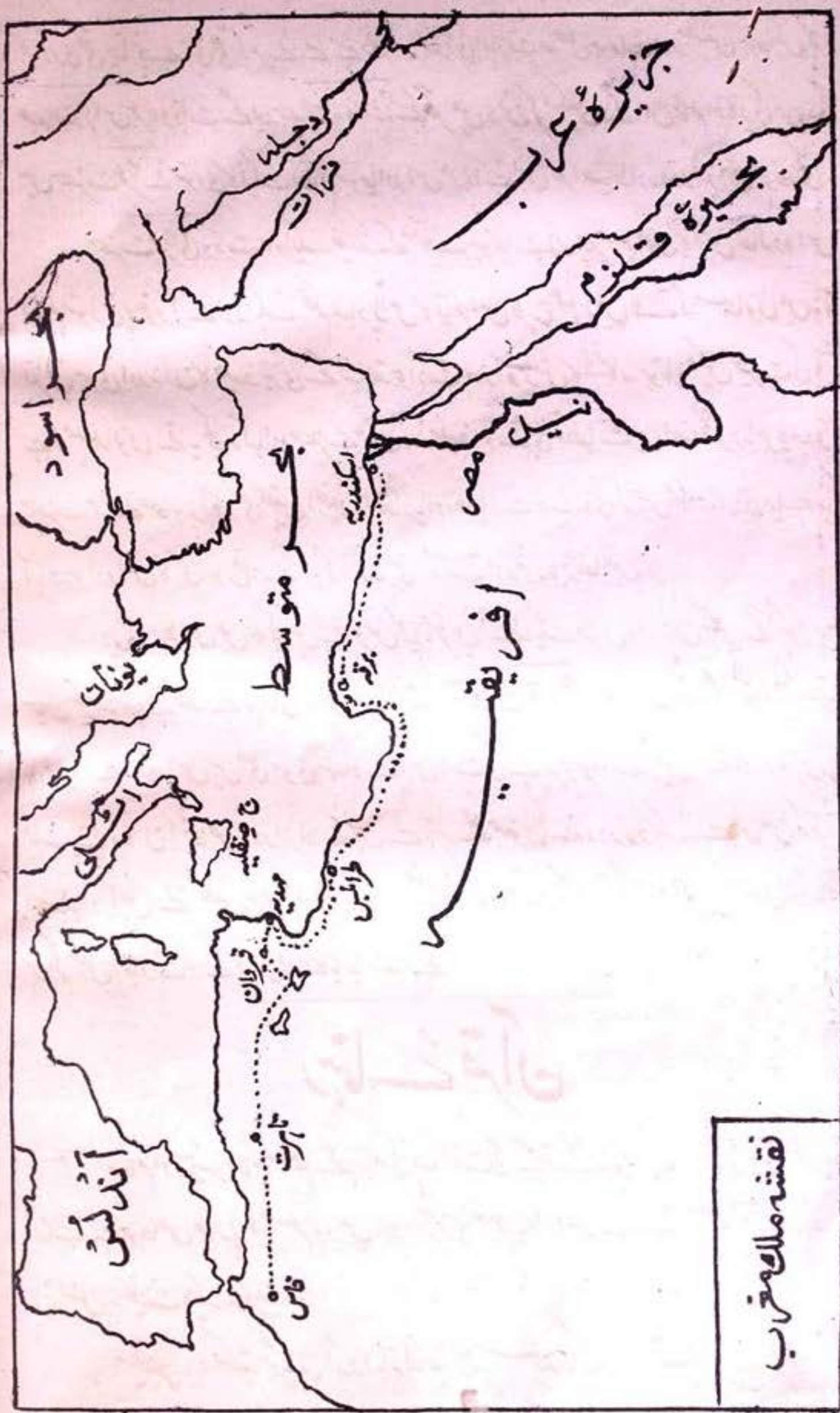
(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم اے)

(سلسلہ کے لئے دیکھئے برہان بابتہ جولائی)

ملک مغرب

اس ملک کے آٹھ صوبے تھے جن کے نام سمت مصر سے حسب ذیل ہیں:۔

۱۔ برقہ ۲۔ افریقیہ ۳۔ تاہرت ۴۔ سجلماسہ ۵۔ فاس یا سوس الادنیٰ ۶۔ سوس الاقصیٰ ۷۔ جزیرہ صقلیہ ۸۔ اندلس[1]

مغرب کا تعارف کرتے ہوتے سیاح لکھتا ہے: یہ ایک بڑا اور عمدہ ملک ہے جہاں بہت سے شہر، قصبے اور گاؤں ہیں، یہاں کی صنعتی، تجارتی اور قدرتی خصوصیات بھی بہت ہیں اور بحیثیت مجموعی ملک خوشحال ہے۔ یہاں بہت سے قلعے اور بڑی بڑی سرحدی چھاؤنیاں ہیں، دل کش باغوں کی کثرت ہے اور متعدد سمندری علاقے اور شہر ہیں جیسے تاہرت، سجلماسہ، طنجہ اور صقلیہ یہاں کے باشندے ہمیشہ مصروف جہاد رہتے ہیں۔ مال داروں کی دولت ضبط و ترقی کے خطرات سے محفوظ ہے، باشندوں کا رجحان نیکی اور بھلائی کی طرف ہے، حکومت انصاف پسند ہے، بادشاہ رعایا کے معاملات سے دل چسپی لیتا ہے اور ان کے طور طریق پر نظر رکھتا ہے، ملک سمندر کے کنارہ پھیلا ہوا ہے، شہروں میں زیتون، انجیر، اور انگور کے باغ بکثرت ہیں جن کو نہریں سیراب کرتی ہیں، البتہ یہ ملک بہت دور افتادہ ہے، اس میں بڑے خوفناک ریگستان اور دشوار گذار راستے ہیں۔ یہاں کے عالموں

[1] سیاح نے خود اندلس کا دورہ نہیں کیا بلکہ سنے سنائے کچھ حالات لکھے ہیں لہٰذا اس مضمون میں اندلس کا ذکر نہیں کیا جائے گا

اور زاہد ورع کو بھی کوئی خاص شہرت حاصل نہیں ہے۔ مال داروں میں بخل نمایاں ہے۔ یہاں اگر سیب نہیں تو وہ اکثر چیزیں مل جاتی ہیں جو دوسرے ممالک میں پائی جاتی ہیں اور سستی ملتی ہیں، کھجور اور زیتون کی بہتات ہے۔ ملک کی آب و ہوا بھی اچھی ہے بعض حصوں میں سخت گرمی پڑتی ہے اور بعض میں سخت سردی ہوتی ہے، مصر کی حد سے سوس اقصی کا ملک پہاڑی علاقوں کو چھوڑ کر بالعموم گرم ہے ملک میں یہودی، مجذوم، خصی، بخیل اور بدھو بہت ہیں۔ واعظوں کی کمی ہے۔ بایں ہمہ، لوگ نرم خو، خلیق اور علم دوست ہیں اور زیادہ تر تجارت کرتے ہیں[1]

ممتاز شہر

(۱) برقہ :- صوبہ برقہ کا صدر مقام اور ایک آباد و شاندار شہر تھا جہاں پھل افراط سے تھے اور زندگی کی ضروریات فی الجملہ وافر تھیں۔ باشندے خوش حال تھے، یہ ایک سرحدی چھاؤنی تھی جو سمندر سے نو دس میل کے فاصلہ پر ایک نشیبی میدان میں واقع تھی۔ اس کے اردگرد پہاڑ تھے۔ یہاں زراعت ہوتی تھی اور کئی قسم کے شہد پائے جاتے تھے، پانی کنوؤں اور بارش کا استعمال ہوتا تھا۔ باشندے خیر و صلاح کی طرف مائل تھے پردیسیوں کے ساتھ ہمدردی اور احسان سے پیش آتے تھے انقلاب اور سیاسی فتنے بھی یہاں کم ہوتے تھے مصر سے آنے والی سڑک یہاں سے ہو کر گذرتی تھی۔[2]

(۲) طرابلس :- یہ شہر عظیم ساحل سمندر پر پتھر کی چہار دیواری میں واقع تھا۔ لوگ کنوؤں اور بارش کا پانی پیتے تھے، دودھ۔ شہد۔ پھل اور سیب یہاں بہت ہوتے تھے۔ شہر کا دوسرا نام اطرابلس تھا[3]

(۳) قیروان :- ملک مغرب کا سب سے بڑا شہر اور پایۂ تخت تھا۔ اس کا کچھ حصہ پہاڑی تھا اور کچھ میدانی۔ پھل خوب وافر تھے اور چیزیں ارزاں۔ پانچ سیر اعلیٰ قسم کا گوشت نو آنے میں ملتا تھا اور دس سیر انجیر اتنی ہی قیمت میں۔ کشمش، انگور، کھجور اور روغن زیتون نہایت عمدہ اور ارزاں تھے شہر تجارت کی ایک اہم منڈی تھا، اس کے ماتحت بہت سے شہر تھے۔ باشندوں میں علم کا نمایاں

---

[1] مقدسی صفحہ ۲۳۶ صفحہ ۲۱۶ [2] مقدسی صفحہ ۲۲۴ [3] ایضاً۔

شوق تھا، وہ نہایت بامروت اور مہربان تھے، سیاح لکھتا ہے: یہاں صرف حنفی اور مالکی مسلک کے پیرو پائے جاتے ہیں اور حیرت و مسرت کی بات یہ ہے کہ دونوں فرقوں میں بڑی رواداری ہے نہ حنفی مالکی سے کوئی عداوت رکھتا ہے اور نہ مالکی حنفی کے ساتھ مسلکی عصبیت سے پیش آتا ہے یہ شہر سارے مغرب کا سرتاج اور حکومت کا مستقر ہے اور سارے عالم اسلام میں اس کو ایک ممتاز حیثیت حاصل ہے، یہاں نیشاپور سے زیادہ معاشی آسانیاں ہیں، رقبہ میں دمشق سے بڑا ہے اور مرتبہ اور علم و فضل میں اصفہان سے بڑھا ہوا ہے۔ بااین ہمہ یہاں کا پانی اچھا نہیں ہے، ادیب، ظریف اور خوش پوش لوگ بھی کم ہیں بارش اور نہر کا پانی حوضوں میں بھر کر کام میں لایا جاتا ہے، حکومت کی طرف سے دکانوں پر ٹیکس ہے۔ عمارتیں اینٹ اور مٹی سے بنی ہیں، روغن زیتون کے حوض بہت ہیں۔ شہر کے بازاروں میں کاروبار برائے نام ہوتا ہے، تاجر سامانِ تجارت لے کر ہر روز اس سے متصل صبرہ نامی گول شہر میں آجاتے ہیں جس کو فاطمی خلیفہ نے بغداد کی طرز پر تعمیر کیا تھا اور جہاں باشندے آباد ہو گئے ہیں۔ قیروان کی لمبائی تین میل سے بھی کچھ کم اور چوڑائی بھی تقریباً اسی قدر، اس کے گرد دیوار نہیں تھی۔[1]

(۴) مہدیہ:۔ یہ اہم بندرگاہ بحر روم پر بحیرہ کے حصار میں واقع تھا۔ قیروان کی رسد اور بیشتر ضروریات اسی بندرگاہ سے فراہم ہوتی تھیں، مصر اور صقلیہ کے جہاز یہیں لنگر ڈالتے تھے، خوش حال اور خوب آباد تھا۔ اپنی جائے وقوع اور بناوٹ کے اعتبار قسطنطنیہ سے بہت مشابہ تھا۔[2]

(۵) تاہرت:۔ صوبۂ تاہرت کا صدر مقام اور نہایت پر لطف شہر تھا۔ سیاح نے اس کو مغرب کا بلخ کہا ہے، کیوں کہ یہ بلخ کی طرح سرسبز اور جمالِ قدرت سے مالامال تھا۔ اس کے دائیں بائیں چشمے ابلتے تھے، نہریں رواں تھیں، درختوں اور باغوں نے شہر کو ڈھانپ لیا تھا، شہر کے باہر دور دور تک مرغزار تھے مغرب کی شان اس شہر سے دوبالا ہو گئی تھی، جمالی ذوق کو یہاں وہ تسکین ہوتی تھی اور یہاں کے قیام سے پردیسی کی ذہنی و جسمانی صحت بحال ہو جاتی تھی۔

---

[1] مقدسی ص ۲۲۴-۲۲۶　[2] مقدسی ص ۲۲۶

سیاح لکھتا ہے: لوگ اس کو دمشق اور قرطبہ پر ترجیح دیتے ہیں میری رائے میں یہ صحیح نہیں ہے گو اس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ یہ ایک نہایت عمدہ اور دل کش شہر ہے جہاں آب وہوا اور قدرتی مناظر کا لطف بھی ہے اور تجارت، معاشی سہولت اور ارزانی بھی خوب ہے بازار خوش وضع ہیں، پانی کی بہتات ہے، باشندے بھی اچھے ہیں، شہر کا طرز پرانا مگر عمارتیں مستحکم ہیں ان تمام خوبیوں کے باوجود اس کا مقابلہ دمشق یا قرطبہ جیسے شہرۂ آفاق اور فردوس نظر شہروں سے نہیں کیا جا سکتا۔[1]

(۶) فاس:- دو بڑے شہروں کا مجموعہ تھا جن میں سے ہر ایک قلعہ کے اندر محصور تھا، دونوں کے درمیان ایک بڑی وادی تھی جس میں باغ اور چکیاں تھیں ایک پر فاطمی خلیفہ قابض تھا دوسرے پر اُموی راج تھا یہاں جنگ وخوں ریزی، شکست وفتح کے بڑے بڑے معرکے رہتے تھے سیاسی حریفوں کی جنگوں نے باشندوں کو مصیبت میں ڈال رکھا تھا، عمارتیں مٹی کی تھیں اور قلعہ پکی اینٹوں سے بنا تھا جدال وقتال کے باوجود شہر میں ہر قسم کی فراوانی تھی، انجیر اور زیتون خاص طور پر زیادہ تھے، لوگ عام طور پر غیر دلچسپ اور بدھو تھے، علماء کی تعداد کم تھی شورش پسند اور اکھڑ لوگوں کی کثرت تھی۔[2]

(۷) سجلماسہ:- صوبۂ سجلماسہ کا صدر مقام اور ایک بڑا شہر تھا جس کے قریب سے ہو کر ایک دریا گذرتا تھا اس کے گرد مٹی کی شہر پناہ تھی جس کے وسط میں عسکر نامی ایک قلعہ تھا جس میں جامع مسجد اور حکومت کے دفاتر تھے، یہاں گرمی وسردی سخت ہوتی تھی، آب وہوا صحت بخش تھی، کھجور، انگور، کشمش، پھل، غلہ، انار بلکہ ضرورت کی سب چیزیں خوب تھیں۔ شہر پردیسیوں کے لئے نہایت سازگار تھا اور وہ بڑی تعداد میں یہاں آتے جاتے تھے، یہ ایک اہم سرحدی چھاؤنی بھی تھا۔ اس کے قصبوں اور دیہاتوں میں سونے چاندی کی کانیں تھیں، باشندے سنی اور خوش اطوار تھے۔ علماء اور اصحاب ہوش وتمیز بھی یہاں کافی تھے۔[3]

---

[1] مقدسی ص ۲۲۸-۲۹ [2] مقدسی ص ۲۲۹ [3] مقدسی ص ۲۳۱

(۸) بَلَرم :- جزیرۂ صقلیہ کا پایۂ تخت تھا۔ صقلیہ کے بارے میں سیاح لکھتا ہے: "مسلمانوں کے پاس کوئی اور جزیرہ ایسا نہیں جو اتنا بڑا ہو یا اتنا آباد یا جس میں اتنے شہر ہوں، اس کی لمبائی بارہ دن کی مسافت کے بقدر اور چوڑائی چار دن کی مسافت کے بقدر تھی" بَلَرم ساحلی شہر تھا، فسطاط سے زیادہ وسیع تھا مگر آبادی بکھری ہوئی تھی۔ عمارتیں سرخ و سفید پتھر کی تھیں، ان کے باہر فوارے چھوٹتے تھے اور بید کی جھاڑیوں کا دل فریب حاشیہ ہوتا تھا۔ وادیِ عباس نامی ایک نہر سے باغوں اور فواروں میں پانی پہنچتا تھا، شہر کے وسط میں چکیاں تھیں، پھل انگور اور ضروریاتِ معاش خوب وافر تھے، شہر کے گرد دیوار تھی اور اندر ایک اور شہر تھا جس میں جامع مسجد تھی، شہر کے باہر بھی ایک اور شہر تھا جس کا نام خالصہ تھا۔ اس کے گرد بھی فصیل تھی۔[۱]

حکومت

اندلس کو چھوڑ کر جہاں بنو امیہ کے نام پر خطبہ پڑھا جاتا تھا، سارے مغرب میں فاطمی خلفاء کا اقتدار تھا۔[۲]

زبانیں

اس ملک میں عربی بولی جاتی تھی لیکن اس میں عربی شستگی و فصاحت نہیں تھی بلکہ وہ مغلق اور بعض حیثیتوں سے دوسری اسلامی ملکوں کی عربی سے مختلف تھی عربی کے علاوہ ایک اور زبان بھی بولی جاتی تھی جو یونانی یا لاطینی سے ملتی جلتی تھی، اس ملک کے صحرائی حصوں میں بربری نسل کے لوگ آباد تھے جن کی زبان بالکل سمجھ میں نہ آتی تھی۔[۳]

تجارت

رقہ سے اونی و سوتی کپڑے اور صقلیہ سے مقصورہ نامی پارچہ کی برآمد ہوتی تھی۔ افریقیہ سے روغن زیتون، پستے، زعفران، اخروٹ، آڑو، توشہ دان، چمڑے کے فرش، مشکیزے، فاس سے کھجور، اور مذکورہ بالا سامان باہر بھیجا جاتا تھا،

---

[۱] مقدسی ص۲۳۱ [۲] مقدسی ص۲۴۳ [۳] مقدسی ص۲۴۳

تجارتی و قدرتی خصوصیات

مغرب کے سمندر میں ایک جزیرہ تھا جس کا صدر مقام مَرسَی الخزر تھا، اس کے قریب مرجان کے پہاڑ تھے کشتیوں میں بیٹھ کر لوگ اس پہاڑ کے قریب جاتے تھے ان کے ساتھ لکڑی کی صلیبیں ہوتی تھیں جن میں دھاگے کی لچھیاں پھانس دی جاتی تھیں، ہر صلیب پر دو رسیاں بندھی ہوتی تھیں جن کو دو آدمی پکڑے ہوتے تھے، یہ دونوں مل کر صلیب کو پہاڑ کی طرف پھینکتے تھے جو کسی شاخ مرجان میں اٹک جاتی تھی پھر اس کو کھینچتے تھے، کسی کی صلیب میں دس ہزار درہم قیمت کے مرجان آجاتے اور کسی کی صلیب میں صرف دس درہم کے، یہ مرجان بازار میں سستے مول بکتے تھے کیوں کہ ان میں نہ رنگ ہوتا تھا نہ چمک، پھر بعض کیمیاوی طریقوں سے ان میں چمک دمک پیدا کی جاتی تھی جس سے ان کی قیمت بہت بڑھ جاتی تھی۔ سَطیلہ شہر میں سمور بڑی مقدار میں فراہم ہوتا تھا۔ اندلس میں کشتیوں کی لکڑی سے تلوار کے دستے بنائے جاتے تھے۔ سال کے ایک حصہ میں بحر محیط کے کنارہ بڑی مقدار میں عنبر آ جمع ہوتا تھا۔ صقلیہ سے نوشادر کی برآمد ہوتی تھی اس ملک میں ایک جانور بوقلمون نامی ہوتا تھا جو ساحل سمندر پر چٹانوں پر لوٹتا تھا جس سے اس کے بال گرتے تھے، یہ بال ریشم کی طرح نرم اور سنہرے رنگ کے ہوتے تھے اور ان کی نرمی اور رنگ ہمیشہ قائم رہتا تھا، یہ جانور کمیاب تھا، اس کے بالوں سے کپڑے بنے جاتے تھے جو مختلف زاویوں سے روشنی کے سامنے آکر مختلف رنگ اختیار کرتے تھے، حکومت کی طرف سے ان بالوں کو باہر لے جانے کی ممانعت تھی اس کے بنے ہوئے کپڑوں کی قیمت کبھی کبھی دس ہزار دینار تک پہنچ جاتی تھی۔[1]

رسم و رواج

ملک کے تمام علاقوں میں صرف وہ لوگ جن کی ثقاہت سرکاری طور پر مسلم ہوتی اور جن کو مُعدّل کہا جاتا شہادت دے سکتے تھے۔ تراویح کی ہر دو رکعت کے بعد آرام کیا جاتا تھا بکریاں کھال اتارے بغیر بھونی جاتی تھیں۔ لوگ زیادہ تر بلا تہبند حماموں میں نہانے جاتے تھے۔

---

[1] مقدسی ص ۲۳۹-۲۲۱

یہاں کی اکثر رسمیں مصر کی رسموں سے ملتی جلتی تھیں۔ البتہ یہاں فارسی طیلسان کا استعمال بہت کم تھا، زیادہ تر رنگی ہوئی ٹوپیاں پہنی جاتی تھیں۔ بربر نسل کے لوگ سیاہ رنگ کے برنس (لمبی ٹوپیاں)، پہنتے تھے، دیہات میں سر پر کپڑا ڈالنے کا رواج تھا، عوام اور گھٹیا درجے کے لوگ سر پر رومال باندھتے تھے۔ تاجر سرخ رنگ کے مصری گدھوں اور خچروں پر سوار ہوتے تھے۔ کتابت کے فن میں اندلس کے لوگ بازی لے گئے تھے، ان کا خط مدوّر ہوتا تھا[1]

مذاہب

ملک میں تین مذہب رائج تھے: اندلس میں امام مالک کے فقہ اور نافع کی قرأت پر عمل ہوتا تھا یہاں کے علماء کہتے تھے کہ ہم صرف قرآن اور موطأ امام مالک کو جانتے ہیں اگر ان کو کسی حنفی یا شافعی کا علم ہوجاتا تو اس کو شہر سے نکال دیتے اور اگر کسی معتزلی، شیعی یا دوسرے فرقہ کے پیرو کا سراغ ملتا تو اس کو بعض اوقات قتل کر ڈالتے مغرب کے دیگر حصوں میں سرحدِ مصر تک کہیں شافعی مذہب کے پیرو نہیں تھے، جمہور یا تو حنفی تھے یا مالکی۔ سیاح لکھتا ہے: میں نے ایک مغربی عالم سے کسی مسئلہ پر مباحثہ کے دوران میں امام شافعی کا قول پیش کیا تو وہ بپھر کر بولا: خاموش رہو، شافعی کون ہوتا ہے! علم کے سمندر بس دو ہوئے ہیں، ابو حنیفہ اہل مشرق کے لئے اور مالک اہل مغرب کے لئے، ان سمندروں کو چھوڑ کر کیا ہم بمبوں اور نالوں کی طرف رجوع کریں گے! امام مالک کے پیرو امام شافعی سے نفرت کرتے ہیں اس بنا پر کہ شافعی نے مالک سے علم سیکھا اور بعد میں استاد سے مسلکی اختلاف کیا، یہاں کے حنفی اور مالکی فرقوں میں جو اتحاد و رواداری ہے اس پر مجھ کو حیرت ہوتی ہے میں نے کسی جگہ دو مذہبی فرقوں میں ایسی صلح و آشتی نہیں دیکھی یہاں تک سننے میں آتا ہے کہ اب سے بہت پہلے ایک سال حنفی حاکم مقرر ہوتا تھا اور ایک سال مالکی۔ میں نے بعض مغربی عالموں سے دریافت کیا کہ آپ کے ہاں حنفی مذہب کیسے رائج ہوا جب کہ اس کی ابتدا عراق جیسے دور افتادہ ملک میں ہوئی۔ انھوں نے کہا کہ جب وَهَب بنِ وَهَب امام مالک سے

[1] مقدسی ص۲۳۹

فقہ اور حدیث پڑھ کر لوٹے تو اَسَد بن عبد اللہ کی ذاتی تمکنت اور غرورِ علم نے ان کے درس میں بطور شاگرد بیٹھنے سے ابا کیا اور وہ امام مالک سے تحصیل علم کرنے مدینہ چلے گئے۔ امام مالک اس وقت علیل تھے بہت دن انتظار کرنے کے بعد بھی جب ان کو صحت نہیں ہوئی تو انھوں نے اَسَد کو وطن لوٹنے اور ابن وہب سے تحصیلِ علم کا مشورہ دیا اور کہا کہ میں نے اپنا سب علم ان کے سینہ میں اتار دیا ہے اور اب کسی کو وہاں سے میرے پاس آنے کی ضرورت نہیں ہے، یہ مشورہ اسد کو بہت شاق گذرا اور انھوں نے لوگوں سے پوچھا کہ مالک جیسا کوئی فقیہ کسی دوسری جگہ پایا جاتا ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ کوفہ میں ایک جوان فقیہ محمد بن حسن شیبانی ہیں جنہوں نے امام ابو حنیفہ سے علم دین حاصل کیا ہے، یہ سن کر اَسَد کوفہ چلے گئے اور محمد شیبانی کے درس میں شامل ہو گئے امام محمد ان کے شوق و ذہانت سے ایسے متاثر ہوئے کہ ہر شاگرد سے زیادہ اپنی توجہ کرنے لگے اور اپنا سب فقہی علم ان کے سینہ میں اتار دیا متاعِ علم سے پوری طرح بہرہ اندوز ہو کر اسد مغرب آگئے اور اپنا درسی حلقہ شروع کیا جوان طلبہ نے جب ان کی فقہی لیاقت کے جوہر دیکھے تو دنگ رہ گئے اَسَد نے ایسے ایسے مسائل کی عقلی و قیاسی تخریج و تفریع کی جو ابن وہب کے وہم میں بھی کبھی نہ گذرے ہوں گے، نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ بڑی تعداد میں ان کے حلقہ میں آنے لگے اور حنفی فقہ کی اشاعت مغرب میں خوب ہونے لگی میں نے دریافت کیا اندلس میں حنفی مذہب کیوں نہیں پھیلا تو مجھے بتایا گیا کہ اول اول وہ وہاں اسی طرح رائج تھا جیسا کہ مغرب میں پھر حنفی اور مالکی عالموں میں ایک دن بادشاہ وقت کے سامنے مناظرہ ہوا تو انھوں نے ابو حنیفہ اور مالک کا وطن پوچھا جب ان کو معلوم ہوا اول الذکر کوفہ میں رہتے تھے اور آخر الذکر مدینہ میں تو انھوں نے کہا دار الھجرۃ کا عالم زیادہ لائق تقلید ہے، ہم کو اسی کی طرف جھکنا چاہئے اور اسی کے فقہ اور حدیث پر عمل کرنا چاہیئے میں یہ پسند نہیں کرتا کہ میری حکومت میں دو مذہبوں پر عمل ہو اس لئے ابو حنیفہ کے متبعین کو ملک سے نکل جانا چاہیئے۔

تیسرا مذہب فاطمی تھا، اس کی تین شاخیں تھیں جو شیعی، معتزلی، باطنی، قرمطی اور اسماعیلی اصولوں پر مبنی تھیں، مغرب کے باشندے فاطمی مذاہب کے بارے میں تین رائیں رکھتے تھے کچھ اس کو درست خیال کر کے اس پر عمل کرتے تھے، کچھ اس کو غلط جان کر اس کی تردید کرتے تھے اور کچھ ایسے تھے جو نہ معتقد تھے نہ منکر بلکہ اس کو امت کے چند درچند فقہی و اجتہادی اختلاف کی ایک شکل سمجھتے تھے صقلیہ کی بیشتر آبادی حنفی تھی جہاں تک کہ قرارت قرآن کا تعلق تھا سارے ملک میں صرف نافع بن نعیم متوفی ۱۶۹ھ کی قرارت پر عمل ہوتا تھا[1]

---

[1] مقدسی ص ۲۳۶-۲۳۸

ادبیات

داستانِ حرم

از

(جناب بسمل سعیدی ٹونکی)

جناب بسمل سعیدی ٹونکی نے یہ نفیس نظم ۱۰ ذی الحجہ ۸۳ھ آل انڈیا ریڈیو کے کشمیری پروگرام سے نشر کی تھی جو اب آل انڈیا ریڈیو کی اجازت سے شکریہ کے ساتھ شائع کی جا رہی ہے۔

مزاجِ دہر میں تھی وحشتِ جہل اک زمانے میں
نہ تھا تمکینِ حق کا باب باطل کے فسانے میں

دماغِ بندگی معمور تھا شیطان کے شر سے
سرِ انسانیت تھا منحرف اللہ کے در سے

نہ تھی توحیدِ حق، معبود تھے اصنام کثرت کے
بپا تھے افتراق و انتشارِ عام کے فتنے

بالآخر ناگوارِ غیرتِ حق جب ہوئی کثرت
ہوئی جب ناگزیر اصلاحِ انساں کے لیے وحدت

تو ارضِ پاکِ بطحیٰ پر بحکمِ حضرتِ باری
بنا رکھی خلیل اللہ نے اک ایسے مرکز کی

سمٹ آئیں زمانے بھر کی ساری کثرتیں جس میں
بنی نوعِ بشر کی جاگ اٹھیں قسمتیں جس میں

نظر افلاک پر جب اس زمینِ پاک نے ڈالی
زمیں پر اپنی رفعت کی سپر افلاک نے ڈالی

یہی وہ پاک مرکز ہے، خدا کا گھر جسے کہیئے
یہی ہے، خاتمِ دارین کا گوہر جسے کہیئے

فرازِ عرش سے ارفع در و دیوار ہیں جس کے
اور ابراہیم و اسمٰعیل سے معمار ہیں جس کے

اسی کا نام ہے کعبہ، یہی ہے قبلۂ عالم
دو عالم کے لئے ہے وجہِ بہبودِ بنی آدم

بغیرِ امتیازِ نسل و رنگ اس میں سمائی ہے
خدا کے سارے بندوں کے لئے اس کی خدائی ہے

وہ چشمے اس سے پھوٹے حکمت و رشد و ہدایت کے
سمندر جذب جن میں ہو گئے جہل و ضلالت کے

فلاحِ دین و دنیا ہے اسی سے نوعِ انساں کی
دعا تعمیر میں اس کی جو مضمر تھی ہوئی پوری

اِسی کے سلسلے کی یادگار اک عیدِ قرباں ہے   ذبیح اللہ اِسی کی داستاں کا پاک عنواں ہے

وہی اِس عیدِ قرباں کی خوشی کے مستحق ہوں گے
حسین ابنِ علی کی طرح جو قربانِ حق ہوں گے

غزل

از

(جناب برج لال جگی رعنا)

پیامِ غم ناگہاں ہر نفس ہے   مگر پھر بھی جینے کی باقی ہوس ہے
محبت تو ہے ایک ہی گُل پہ مرنا   یہ پھولوں سے دامن کو بھرنا ہوس ہے
یہ سب وہم کی شعبدہ کاریاں ہیں   کوئی آشیاں ہے نہ کوئی قفس ہے
کہاں آ گیا کارواں زندگی کا   نہ منزل نہ جادہ نہ بانگِ جرس ہے
کریں کس سے جورِ زمانہ کا شکوہ   کوئی دادرس ہے نہ فریادرس ہے
یہ مانا ہے باریک بیں عقل لیکن   نگاہِ محبت بڑی دوررس ہے
محبت کا ہے دم قدم جاودانی   خرد مختصر مثلِ موجِ نفس ہے
محبت کو ہے لاگ سود و زیاں سے   خرد کو غمِ بیش و کم پیش و پس ہے
ہے پروانہ حسن و ایثار الفت   خرد محوِ لذّت مثالِ مگس ہے
نہ ہو بُو اگر تو ہے گُل عکسِ گُل کا   نہ اخلاص ہو تو محبت ہوس ہے
محبت کو ہے بس یہ نسبت خرد سے   یہ سورج وہ شبنم یہ بجلی وہ خس ہے

حقیقت پہ مبنی ہے یہ قولِ رعنا
کہ اللہ بس اور باقی ہوس ہے

تبصرے

نقش حیات جلد دوم از حضرت مولانا سید حسین احمد المدنی تقطیع کلاں ضخامت ۲۸۶ صفحات طباعت و کتابت اعلیٰ قیمت مجلد للعہ پتہ: الجمعیۃ بکڈپو دفتر جمعیۃ علمائے ہند گلی قاسم جان دہلی ۶

یہ وہی کتاب ہے جس کی پہلی جلد کا مطالعہ کرنے کے بعد لوگوں کو بے چینی کے ساتھ شدید انتظار تھا جیسا کہ توقع تھی اس میں حضرت مولانا نے بڑی تفصیل سے مدلل اور محققانہ طور پر یہ بتایا ہے کہ جب انیسویں صدی کے آغاز میں عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کا پورے ملک پر اقتدار ہو گیا اور بادشاہت صرف برائے نام رہ گئی تو اسی وقت سے علمائے ہند نے کس طرح استخلاصِ وطن کے لئے اپنی کوششوں کا آغاز کر دیا تھا اس سلسلہ میں حضرت شاہ عبد العزیز کا فتویٰ حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک اور اس کے اغراض و مقاصد پر سیر حاصل کلام کیا گیا ہے اس سلسلہ میں راقم الحروف کو ذاتی طور پر یہ دیکھ کر فخر آمیز مسرت ہوئی کہ ۱۹۴۸ء میں راقم الحروف نے برہان میں "علمائے ہند کا سیاسی موقف" کے زیر عنوان چند قسطوں میں ایک مقالہ لکھا تھا جو بعض مصروفیتوں کی وجہ سے ناتمام ہی رہ گیا۔ اس مقالہ کی ایک قسط میں حضرت سید احمد صاحب شہید کی تحریک پر گفتگو کرتے ہوئے ثابت کیا تھا کہ یہ تحریک جمہوری اور ہندوستانی تھی۔ اس پر بعض علماء بڑے ناراض ہوئے لیکن خاکسار نے حسب عادت کسی کو کوئی جواب نہیں دیا۔ حضرت مولانا مدنی نے زیر تبصرہ کتاب میں نہ صرف اس رائے سے اتفاق ظاہر فرمایا ہے بلکہ 'برہان' کے حوالہ سے اس پوری قسط کو از صفحہ ۶ تا صفحہ ۱۶ نقل فرما کر گویا خاکسار کی رائے پر مہر تصدیق ثبت کر دی ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت سید صاحب کی تحریک کا محرم راز مولانا سے بڑھ کر اور کون ہو سکتا ہے فالحمد للہ علیٰ ذالک۔

حضرت سید صاحب کی تحریک کے بعد ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی اور اس میں علماء کا حصہ ہندوستان کے علاوہ بیرونی ممالک اسلامیہ میں انگریزوں کی شاطرانہ چالیں۔ جنگ طرابلس و بلقان

ترکوں کی شکست، صلحنامہ سیوارسٹ ان سب پر مفصل کلام کرنے کے بعد حضرت شیخ الہند کی انقلابی تحریک کا ذکر کیا گیا ہے اور یہی اس کتاب کا اصل مغز ہے۔ حضرت شیخ الہند کی تحریک اور آپ کی انقلابی سرگرمیوں کے بہت سے پہلو جو اب تک سربستہ راز تھے اور جن کا علم سوائے چند خاص حضرات کے اور کسی کو نہیں تھا وہ سب بڑی تفصیل کے ساتھ اس میں بتمام وکمال بیان کر دیئے گئے ہیں اس حیثیت سے یہ کتاب صرف ایک سوانح عمری یا تذکرہ نہیں بلکہ ایک بہت بڑی تاریخی دستاویز ہے جس کو تاریخ آزادی کے طالب علم سر آنکھوں سے لگائیں گے اور جس کے بغیر ہندوستان کی جدوجہد استخلاص وطن کی کوئی تاریخ مکمل نہیں ہو سکے گی۔ اس کتاب کے مطالعہ سے واضح ہو گا کہ دنیا جس طبقہ کو صرف بوریہ نشین علماء کے نام سے جانتی ہے ان میں درحقیقت کیسے کیسے جواہر تابندہ اور گوہر ہائے گرانمایہ پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے ملک کی ایک نہایت عظیم الشان انقلابی تحریک کی قیادت کی اس کی تنظیم کی اور اس طرح انھوں نے اپنے دل و دماغ، عزم و ہمت اور خلوص و استقلال کا ایسا عجیب و غریب مظاہرہ کیا کہ ملک کی کوئی دوسری جماعت اس کی نظیر پیش کرنے سے قاصر ہے سخت ضرورت ہے کہ اس کتاب کا انگریزی، عربی، ہندی اور روسی زبانوں میں فوراً ترجمہ کیا جائے اور اس کو زیادہ سے زیادہ تعداد میں چھپوا کر گھر گھر پہنچایا جائے۔ جمعیۃ علمائے ہند اگر اس اہم کام کا ذمہ لے تو اس کا پورا ہونا چنداں مشکل نہیں ہے اس کتاب سے اندازہ ہو گا کہ جن ضعیف و نحیف کالبد ہائے خاکی کے خاکستر میں فقر بوذر، شجاعت حیدری اور تدبر و حوصلہ فاروقی کی چنگاریاں خوابیدہ ہیں وہ اگر طوفان حوادث سے کل نہیں ڈرے تو آج کیوں ڈریں گے فجزاہ اللہ عن المسلمین جزاءً یلیق حقہٗ۔ حضرت مولانا کے وابستگان ارادت کو اس کتاب کے مطالعہ کے بعد اس اعتبار سے حسرت آمیز شکایت ہو گی کہ مولانا نے اس میں اپنی مجاہدانہ زندگی کے حالات و سوانح بیان نہیں کئے ہیں لیکن حق یہ ہے کہ مولانا کے مزاج میں جو فروتنی، انکسار اور تواضع ہے اس کی وجہ سے خود مولانا کے قلم یا زبان سے ان کی توقع نہیں کی جا سکتی اس ضرورت کو مولانا سید محمد میاں صاحب نے حیات شیخ الاسلام لکھ کر پورا کر دیا ہے خاص مولانا کے حالات کے لئے اس کتاب کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

معارف الحدیث | از مولانا محمد منظور نعمانی تقطیع کلاں طباعت وکتابت اعلیٰ ضخامت ۲۸۸ صفحات قیمت غیر مجلد ۱۲/ روپیہ، پتہ :- کتب خانہ الفرقان لکھنؤ۔

اردو میں احادیث پر کافی کتابیں موجود ہیں اور خصوصاً ترجمان السنہ جو جلد بجلد ندوۃ المصنفین سے شایع ہو رہی ہے ایک عظیم الشان اور مستند ترین کتاب ہے لیکن ایسی کتاب کی پھر بھی ضرورت تھی جس میں موجودہ زمانہ کی ضرورتوں کے مطابق صحیح احادیث کو ایک خاص ترتیب کے ساتھ آسان وعام فہم زبان میں پیش کیا جائے اور جس میں فن حدیث کی علمی اور دقیق بحثوں سے زیادہ تعرض نہ کیا جائے زیر تبصرہ کتاب اسی ضرورت کی تکمیل کی غرض سے تالیف کی گئی ہے یہ کتاب کی پہلی جلد ہے۔ فاضل مولف کے خاکہ کے مطابق ابھی اس کی چار جلدیں اور تالیف کی جائیں گی۔ یہ جلد کتاب الایمان پر ہے اور اس ذیل میں اسلام۔ ایمان۔ احسان۔ خیر وشر۔ خیر وقدر۔ عالم قبر۔ حشر ونشر اور جنت ودوزخ سے متعلق احادیث صحیحہ جو تقریباً سب کی سب مشکوٰۃ شریف سے ماخوذ ہیں ترتیب وار لائی گئی ہیں ہر حدیث کا متن نقل کرنے کے بعد اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے اور پھر اس کی تشریح وتوضیح کی گئی ہے زبان دل نشین اور اندازِ بیان صاف سادہ اور موثر ہے بعض احادیث جن کا مضمون آج کل کے متعقلین کو خلاف عقل معلوم ہوتا ہے ان کے آغاز میں ایک مختصر تقریر کے ذریعہ اس استبعاد کو دور کیا گیا ہے شروع میں جناب مولانا حبیب الرحمٰن الاعظمی کا طویل مقدمہ ہے جس میں حدیث کی حجیت واستناد پر محققانہ اور بصیرت افروز کلام کر کے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ اگر حدیث کو تشریعی طور پر حجت نہ مانا جائے تو پھر دین کی تکمیل نہیں ہوتی اور خود قرآن مجید کی متعدد آیات واحکام کا مطلب ومنشا واضح نہیں ہوتا۔ حق تعالیٰ فاضل مولف ومقدمہ نگار کو اجر جزیل عطا فرمائے کہ اس کتاب کی تالیف سے وقت کی ایک بڑی ضرورت پوری ہو گئی امید ہے کہ باقی چار جلدیں بھی جلد شائع ہوں گی۔

نوائے وقت | از پروفیسر نظام الدین الیس گوریکر تقطیع متوسط ضخامت ۱۰۳ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت مجلد دو روپیہ پتہ :- رائٹرس امپوریم لمیٹڈ پیلیس بلڈنگ سر فیروز شاہ مہتا روڈ بمبئی ۱

جناب نظام الدین الیس گوریکر بمبئی کے سینٹ زیویرس کالج میں اردو اور فارسی کے استاذ

ہیں۔ موصوف کی صدارت میں کالج کی اردو بزم ادب تقریباً دس سال سے قایم ہے۔ یہ بزم کالجوں کی عام بزموں کی طرح سال بھر میں دو تین جلسے وغیرہ کر لینے ہی پر اکتفا نہیں کرتی بلکہ اس نے کالج کے اندر اور کالج سے باہر پورے صوبۂ بمبئی میں اردو زبان و ادب کی مفید اور تعمیری خدمات انجام دی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب تقریباً ان ہی تقریروں کا مجموعہ ہے جو گوریکر صاحب نے بزم کے مختلف جلسوں اور تقریبوں میں اردو زبان و ادب کے مختلف پہلوؤں۔ اس زبان کی نامور شخصیتوں یا بزم کی سرگرمیوں پر کی ہیں یہ تقریریں اگرچہ مختصر ہیں لیکن ان سے فاضل مقرر کو اردو زبان کے ساتھ جو والہانہ شغف ہے اور اس سلسلہ میں انھوں نے جس خلوص اور انہماک کے ساتھ اردو کو ٹھوس طریقہ پر ہر دل عزیز بنانے میں جد و جہد کی ہے اس پر روشنی پڑتی ہے۔ علاوہ بریں چونکہ فاضل مقرر کالج میں اردو کے استاذ بھی ہیں اور ایم۔ اے کلاس تک کو پڑھاتے ہیں اس بنا پر ان کی مختصر تقریروں میں بھی زبان و ادب سے متعلق بعض بڑے کام کی باتیں آگئی ہیں عہد حاضر کی تاریخ زبان اردو کے طلبہ کے لئے اس کا مطالعہ خاص طور پر مفید ہوگا۔

ملکہ حیات بخشی بیگم از جناب نصیر الدین ہاشمی صاحب، تقطیع خورد ضخامت ۴۵ صفحات طباعت وکتابت بہتر قیمت ۱۲؍ پتہ:۔ سب رس کتاب گھر۔ خیریت آباد۔ حیدر آباد دکن۔

ملکہ حیات بخشی بیگم جو دکن کے سلطان محمد قلی کی بیٹی۔ سلطان محمد قطب شاہ کی بیوی اور سلطان عبد اللہ قطب شاہ کی والدہ تھیں تاریخ دکن کی ان چند نامور شہزادیوں اور شاہی بیگمات میں سے ہیں جو اپنے اخلاق و عادات، فہم و تدبر اور سیاسی دانشمندی کے لئے مشہور ہیں موصوفہ نے ایک نہایت نازک موقع پر بڑی جرأت و ہمت سے کام لیا اور قطب شاہی سلطنت کو شاہ جہاں کے عہد میں مغلیہ سلطنت کے ہاتھوں برباد ہونے سے بچا لیا۔ اس کے علاوہ ملکہ بڑی فیاض رحم دل اور سخی بھی تھیں۔ حیدر آباد میں بہت سے رفاہ عام کے کام انھوں نے اپنی یادگار چھوڑے، اس کتاب میں موصوفہ کے ہی حالات و سوانح مستند تاریخی حوالوں کی روشنی میں لکھے گئے ہیں جس کا مطالعہ دلچسپ بھی ہوگا اور سبق آموز بھی۔

برہان

جلد ۳۳ شمارہ ۴

اکتوبر سنہ ۱۹۵۴ء مطابق صفر المظفر سنہ ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

"اسلام تلوار کے زور سے پھیلا ہے" یہ نعرہ سب سے پہلے مشنری مصنفین یورپ نے بلند کیا تھا اور مقصد یہ تھا کہ یورپ میں مذہب کی نشاۃِ ثانیہ کے بعد عیسائیت کو اسلام کی طرف سے جو خطرہ پیدا ہو گیا تھا مسیحیت کو اس سے محفوظ رکھا جائے۔ مشنری مصنفین نے اس کا چرچا اس زور شور سے کیا کہ

انگلستان کی ہر مِس سیمیں بدن کہنے لگی

"بوئے خوں آتی ہے اس قوم کے افسانوں سے"

لیکن آخر جب یورپ میں علم اور سائنس کی روشنی پھیلی اور مذہبی تعصب و تنگ نظری کے بجائے تاریخی حقائق و واقعات کا سنجیدہ شعور و فکر پیدا ہوا تو خود یورپ میں کا دلائل ایسے انصاف پسند مصنفین وادبا پیدا ہوئے جنہوں نے اس بے بنیاد الزام کی تردید کی اور اسلام کے محاسن و فضائل کا برملا اعتراف کیا اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ ڈاکٹر ڈبلیو۔ ٹی۔ آرنلڈ نے تو سالہاسال کی دراز کی محنت و تحقیق کے بعد "دعوت اسلام" (دی پریچنگ آف اسلام) کے نام سے ایک ایسی ضخیم اور محققانہ کتاب لکھی کہ جہاں تک اس خاص الزام کا تعلق ہے اس کتاب نے ہمیشہ کے لئے مخالفین کا منہ بند کر دیا۔ پھر آج یورپ اور امریکہ میں جگہ جگہ اسلامی علوم و فنون، اسلامی دینیات اور اسلامی فلسفۂ حیات اور اسلامی کلچر پر جو لاکھوں روپیہ کے خرچ سے تحقیقات ہو رہی ہیں اور اس مقصد کے لئے بڑی بڑی یونیورسٹیوں میں جو ادارے قائم ہیں یہ خود اس بات کی دلیل ہیں کہ یورپ اور امریکہ نے اسلام کی ثقافتی اور تہذیبی عظمت کو تسلیم کر لیا ہے ورنہ جو مذہب تلوار کے بل بوتہ پر فروغ پائے وہ ہرگز اس لائق نہیں ہو سکتا کہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کے موجودہ دورِ ترقی میں اس کے ساتھ اعتنا کیا جائے۔

لیکن افسوس ہے کہ اب خود ہندوستان میں بعض کوتاہ نظروں نے پھر اسلام کے خلاف اسی قسم کے اوچھے ہتھیار استعمال کرنے شروع کر دئے ہیں اور وہ ہی اسلام اور تلوار کا افسانۂ دیرینہ شد و مد کے ساتھ دہرایا

جانے لگا ہے۔ حالانکہ جہاں تک ہندوستان کا تعلق ہے یہ حقیقت یہاں کے ہر بام و در سے نمایاں ہے کہ جن مسلمان قوموں نے اس ملک کو فتح کیا۔ اور یہاں اپنی حکومت و سلطنت کا تخت بچھایا انھوں نے خود اس ملک کو اپنا وطن بنا لیا۔ اور آخر وہ اور ان کی اولادیں اسی ملک کی خاک کا پیوند ہو کر رہ گئے۔ ان کو اس ملک کے ساتھ وہ ہی محبت تھی جو انھیں اپنے آباء و اجداد کے جنم بھومیوں کے ساتھ ہو سکتی تھی۔ انھوں نے اس ملک کی دولت سے اپنے وطنوں کو جہاں سے وہ آئے تھے کوئی فائدہ نہیں پہنچایا بلکہ اس دولت سے اسی ملک کی خدمت کی۔ ملک کے پُرانے باشندوں کو اپنا ہم وطن سمجھا اور ان کے ساتھ ان کے علوم و فنون اور کلچر کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو از روئے شرافت و انسانیت اپنے برادرانِ وطن کے ساتھ کرنا چاہیے تھا۔

ان بادشاہوں اور فرمانروایانِ ہند کی طبیعتیں اور مزاج۔ ان کے عادات و اطوار مختلف قسم کے تھے جو ان میں انصاف پسند اور رحم دل تھا وہ ہندو ہوں یا مسلمان سب کے لئے تھا اور جو متشدد اور سخت گیر تھا وہ بلا امتیازِ فرقہ و نسل ہر ایک کے لئے ہی تھا علاوہ ازیں زمانۂ جنگ کے اخلاقیات عہدِ امن کے اخلاقیات سے مختلف ہوتے ہیں۔ کسی ایک گروہ نے جنگ کے زمانہ میں اپنے فریقِ محارب کے ساتھ جو کچھ کیا ہو اس کو دلیل بنا کر ہرگز یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس گروہ کے معتقداتِ مذہبی یہی ہیں اور اس کا مذہب اسی قسم کے برتاؤ کا حکم کرتا ہے ایک انسان جب غصہ میں ہوتا ہے تو بسا اوقات وہ خود اپنی زندگی اپنے ہاتوں ختم کر دیتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اس کا یہ فعل زندگی کے فطری قوانین کے خلاف ہوتا ہے اس کو کوئی شخص اصولِ حیات نہیں کہہ سکتا پھر کسی ایک قوم کے اخلاقی ضابطۂ حیات کا جائزہ لینے کے لئے اس قوم کے چند ایک افراد و اشخاص کے اعمال و افعال کو بہ طور معیار پیش کرنا صحیح نہیں بلکہ ضروری ہے کہ وسعتِ نظر اور دقتِ نگاہ کے ساتھ اس قوم کی پوری تاریخ کو فلسفۂ تاریخ کی روشنی میں جانچا اور پرکھا جائے۔

جہاں تک ہندوستان میں مسلمانوں کے دورِ حکومت کا تعلق ہے یہ بات دعوی کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ یہ حکومت اگرچہ اپنے ابتدائی دور میں ایک غیر ملکی حکومت کی حیثیت رکھتی ہو لیکن جلد ہی اس نے ملکی حکومت

کی شکل اختیار کر لی اور اسی وجہ سے وہ صدیوں تک قائم رہ سکی ورنہ یہ بات اس ملک کے باشندوں کے لئے بڑے ننگ وعار کا باعث ہوگی کہ وہ آٹھ سو سال تک اس حکومت کو ختم نہیں کر سکے اور اتنی طویل مدت انھوں نے اس کی غلامی کے زیر سایہ گذار دی۔ مسلمانوں اور ہندوؤں کا ایک دوسرے کے سماجی و معاشرتی رسوم وعادات کا اختیار کر لینا۔ ایک دوسرے کے علوم وفنون سے باخبر ہونا اور ان میں مہارت بہم پہنچانا ایک مشترک زبان بولنا۔ ایک دوسرے کے ساتھ مل جل کر رہنا۔ یہ سب اس امر کی دلیل ہیں کہ ہندو اور مسلمانوں کے باہم اختلاط وامتزاج سے ایک نئی قوم پیدا ہو گئی تھی جو مذہبی اختلاف کے باوجود قومی حیثیت سے صرف ہندوستانی تھی اور اس بنا پر یہاں جو حکومت تھی اس کو غیر ملکی اور اجنبی حکومت نہیں کہا جا سکتا"

اگر یہ حکومت غیر ملکی ہوتی تو ایک مرتبہ نہیں بلکہ متعدد بار ہندوؤں کو ایسے مواقع ملے کہ اگر وہ چاہتے تو اس حکومت کو وقت سے بہت پہلے بڑی آسانی سے ختم کر سکتے تھے، اورنگ زیب عالمگیر برسوں تک دکن میں اپنی فوجیں لئے پڑا رہا اور مصروفِ جنگ رہا لیکن یہاں اس کے دار السلطنت میں نہ ہندوؤں نے بغاوت کی اور نہ کوئی شورش پیدا ہوئی۔ ۱۸۵۷ء میں انگریزوں کے خلاف ہندو اور مسلمان دونوں نے ایک ساتھ جنگ لڑی یہ خود اس بات کا ثبوت ہے کہ اس وقت ہندو اور مسلمان دونوں ملکی وطنیت کے لحاظ سے ایک تھے

آگرہ اور دلی مسلمان بادشاہوں کا دار الحکومت تھی۔ ان کی فوجی طاقت اور حکومت کا رعب و داب جو یہاں ہو سکتا تھا ملک کے دوسرے حصوں میں ہرگز نہیں ہو سکتا تھا" پس اگر اسلام بزور شمشیر پھیلا ہے تو کوئی بتائے کہ اس کی کیا وجہ ہے کہ بنگال۔ پنجاب۔ سندھ اور سرحد میں عددی اعتبار سے مسلمانوں کی اکثریت تھی لیکن صوبہ متحدہ آگرہ و اودھ میں ان کی آبادی ۱۴ فی صدی سے متجاوز نہ ہو سکی اور پھر اقتصادی اعتبار سے بھی بحیثیت مجموعی جتنے خوش حال یہاں کے ہندو رہے مسلمان نہیں ہو سکے اگر حکومت کا سہارا صرف تلوار تھی تو بتانا چاہیئے کہ یہ کس قسم کی تلوار تھی جو ہندوؤں کو آٹھ سو سال تک غلامی کے شکنجے میں تو کسے رہی لیکن مسلمانوں کو اقلیت سے اکثریت میں تبدیل نہیں کر سکی۔

شیدی سعید کی مسجد (احمد آباد)

از
مولانا سید ابوظفر صاحب ندوی
(ریسرچ ورکر پوسٹ گریجویٹ ڈیپارٹمنٹ گجرات ودیا سبھا احمد آباد)

شیدی فارسی لفظ ہے، جو حبشیوں کے لئے اہلِ فارس اسی طرح استعمال کرتے تھے، جس طرح عربوں کے لئے تازی اور ترکوں کے لئے تاجیک، لیکن اب ایک قسم کا لقب ہو گیا ہے جو صرف حبشیوں کے لئے مستعمل ہے۔

حبشی گجرات میں کب آئے اس کا صحیح پتہ تاریخوں سے نہیں ملتا، احمد شاہ بانیِ احمد آباد سے لے کر سلطان محمود اعظم (عرف بیگڑھ) تک ان کا کچھ حال نہیں معلوم ہوتا، سلطان محمود کے عہد میں صرف اس قدر پتہ چلتا ہے کہ خود اُس کے حرم میں ایک حبشن تھی، اس سے قیاس کیا جاسکتا ہے کہ غالباً کچھ مرد بھی غلاموں کے سلسلہ میں ہوں گے۔

سلطان بہادر شاہ کے عہد میں ترکوں کے ساتھ حبشیوں کا بھی عروج شروع ہوا۔ ہمایوں کے ساتھ جو جنگ، محمود آباد کے پاس ہوئی تھی اُس کا سپہ سالار عماد الملک حبشی ہی تھا۔ اس سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ حبشیوں کی فوج اس عہد میں منظم اور مرتب ہو چکی تھی سلطان محمود ثانی کے زمانہ میں ان کو ترقی کا بہت کافی موقعہ مل گیا۔ اور ترکوں کے پہلو بہ پہلو بڑے بڑے عہدوں پر فائز ہوئے۔ اس وقت بحری بیڑہ ترکوں، اور توپ خانہ ان حبشیوں کے ماتحت تھا۔ محمود کے بعد احمد اور مظفر کے زمانہ میں سلطنت کے سیاسی معاملات میں اس قدر دخیل ہو گئے، کہ جس طرف یہ جھک جاتے اُسی کا پلہ بھاری ہو جاتا۔ چنانچہ امرائے گجرات کی خانہ جنگی میں انھوں نے بڑا حصہ لیا۔ اور انھیں اسباب کی بنا پر گجرات کے بڑے بڑے علاقے پر یہ قابض ہو گئے۔ انھیں میں سے ایک سردار بلال جھوجھار خاں تھا

اس کے مرنے پر اس کا لڑکا بھی جھجھار خاں کہلایا۔ یہی جھجھار خاں ہے جو شیدی سعید کا بڑا دوست اور رفیق تھا۔ اسی نے چنگیز خاں حاکمِ بھروچ کو قتل کیا تھا۔ جس کے قصاص میں اکبرِ اعظم نے ۹۸۰ھ/۱۵۷۲ء میں ہاتھی کے پاؤں کے نیچے روندوا ڈالا۔

شیدی سعید

شیدی سعید کی ولادت غالباً حبشہ میں ہوئی۔ اور پھر وہاں سے یمن آکر ترکوں کی فوج میں داخل ہوا۔ اور مصطفےٰ رومی خاں کے ساتھ گجرات آگیا۔ اور رومی خاں کے چلے جانے کے بعد یہاں اور ترکی اور حبشی سرکاری ملازم ہوگئے سعید بھی ملازم ہوا۔ اور آخر میں خاص سلطان محمود کے ملازموں میں شامل ہوگیا، اسی واسطے اس کو شیدی سعید سلطانی کہنے لگے۔ غالباً سلطان محمود کی شہادت کے بعد جب حبشی سرداروں نے ملک کے ایک بڑے حصہ پر قبضہ کرلیا، تو شیدی سعید نے بھی جھجھار خاں کی ہمراہی قبول کرلی۔ کیوں کہ ان دونوں میں پہلے ہی سے دوستی تھی۔ شیدی سعید ایک بہادر آدمی تھا۔ وہ جھجھار خاں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوچکا تھا اور اس جنگ میں بھی شریک تھا جو محمد الغ خاں کے ساتھ ہوئی تھی۔ اور اسی شیدی سعید کو ناصر جنگ نے جو گجراتی امرا میں طاقتور امیر تھا اس کی قابلیت کا اندازہ لگاکر بطور سفیر چنگیز خاں حاکم بھروچ کے پاس بھیجا تھا۔ جب فوجی خدمت ترک کرکے جھجھار خاں کے ساتھ رہنے لگا، تو اس نے بھی اس کو اپنا بھائی سمجھا، دونوں کی محبت بڑھ جانے کے سبب وہ معتمد علیہ ہوگیا۔ جھجھار خاں اور اس کے بھائی نے اس کی نیکی اور سعادت مندی کو دیکھتے ہوئے پچاس لاکھ ٹنکہ (روپیہ) کے گاؤں اس کے حوالے کئے، اور وظیفہ کے طور پر اس کے لئے علاحدہ مقرر کئے، تاکہ اس کی جانب سے کار خیر کرتا رہے۔

شیدی سعید کے نیک کام

شیدی سعید ایک بڑے دل کا آدمی تھا۔ اس کی فیاضیاں صرف نیک کاموں کے لئے ہوتیں، وہ مردِ صالح تھا، اس لئے کبھی بھی دولت کو اپنی ذات کے لئے بطورِ عیش پسندی کے صرف نہ کیا، اس نے غریبوں کے لئے مکانات بنائے، لوگوں کے لئے مدد معاش مقرر کئے، غلاموں کی امداد کی۔ اور مسکینوں کی غمخواری کرتا۔ اس کی مجلس میں صرف اچھے ہی لوگ ہوتے جو اس کو نیک مشورہ دیتے۔ اس نے جو مسجد بنوائی (جس کا ذکر آگے آئے گا) اس کی بائیں طرف

ایک لنگر خانہ قایم کیا۔ جس میں دشیشہ پکا کر لوگوں کو کھلاتا، اور دشیشہ اس کھانے کو کہتے ہیں، جو گندم کو بھگو کر اور پھر کوٹ کر پکاتے ہیں۔

اس عہد میں غیر ملکیوں کے حملے، اور خانہ جنگی کے سبب سے بے کاری اور افلاس بہت بڑھ گیا تھا، متوسط طبقے (سفید پوش) پریشاں حال ہو گئے تھے، شیدی سعید نے اس کو محسوس کیا، اور اپنے لنگر خانہ میں اس کا بندوبست کیا، اور لوگوں کو کھلانا شروع کیا، اور یہ بڑھتے بڑھتے اس قدر ہو گیا۔ کہ صرف کشکولی نقیروں کے لئے بیٹل من (گجراتی) اور سفید پوش غریبوں کے لئے بیٹل من علاحدہ پکتا، اس میں سے چوتھا حصہ (پانچ من) الگ ایک مکان میں پکایا جاتا جو لنگر خانہ سے قریب تھا۔ حاضر لوگ دسترخوان پر اسی جگہ کھا لیتے، باقی لوگوں کے لئے گھر گھر الگ تقسیم کر کے بھیجا جاتا[1] اور خاص شیدی سعید کے ساتھ دسترخوان پر دونوں وقت شرفا کی ایک جماعت بیٹھتی، جس میں حضرم (یمن کا ایک صوبہ) کے شریف لوگ، شہر کے علماء، مخلص احباب، اور ارباب تصوف سب شامل ہوتے، مخصوص مصاحبوں کے لئے بھی دس من روزانہ مقرر تھا۔ وہ خصوصیت کے ساتھ ان لوگوں تک کھانا پہنچانے کی کوشش کرتا جو دنیا ترک کر چکے تھے۔ سردیوں کے موسم میں کچھ قبائیں صاحب حیثیت لوگوں کو بطور تحفہ کے دیتا۔ اور ایک ہزار کے قریب غریبوں میں تقسیم کرتا، یہ دستور اکبر بادشاہ کے احمد آباد فتح کرنے تک برابر جاری رہا۔

کتب خانہ شیدی سعید کی مجلس میں بہترین آدمی جمع ہوتے تھے، وہ علم و فضل والوں کے ساتھ محبت رکھتا تھا اور انھیں سے اس نے مختلف قسم کے علوم و فنون حاصل کئے۔

علما و فضلا کی قدردانی کا یہ نتیجہ نکلا، کہ شیخ حمید بن قاضی عبداللہ سندھی محدثِ وقت نے جب

---

[1] ہر زمانہ میں مخیر لوگ ایسا کرتے رہے ہیں۔ حضرت نظام الدین اولیاء کی خانقاہ سے ہزاروں آدمی روزانہ کھاتے تھے، اور آج احمد آباد میں جمال پور دروازہ باہر ایک لنگر خانہ کھلا ہے جہاں اس گرانی کے زمانہ میں بھی ہزاروں آدمیوں کے علاوہ ایک ہاتھی کی خوراک بھی روزانہ مہیا کی جاتی ہے یہ ایک مندر کے مہاراج کی طرف سے ہے، جہاں کثیر تعداد میں زیادہ تر سادھو اور سنت دونوں وقت کھاتے ہیں۔

جامع حمیدی کی تبویب (مضامین کو باب باب میں الگ بیان کرنا) ختم کی تو شیخ سعیدی کے نام معنون کیا، اور "جامع سعیدی فی تبویب الحمیدی" اس کا نام رکھا جس نے اس کو ہمیشہ کی زندگی عطا کی۔

انھیں بزرگوں کی صحبت سے اس کو کتابوں کے جمع کرنے کا شوق پیدا ہوا۔ چنانچہ اس نے بڑی کوشش سے ایک کتب خانہ قائم کیا، شہر میں جس قدر کتابیں مل سکیں، اس میں جمع کیں، پھر ایک جہاز تیار کرا کر مصر روانہ کیا اور کتابوں کی خرید، خواجہ سلامت اللہ شاطر مغربی کے جہاز کے ناخدا کے سپرد کی، ان کو کتابوں کی ایک فہرست بھی دے دی گئی، تاکہ خصوصیت سے ان کتابوں کو ضرور خریدیں، چنانچہ وہ جہاز کتابوں کو لے کر جب گھوگھہ بندر (کاٹھیاواڑ) پر پہنچا، تو طوفان کے سبب سے جہاز نے کروٹ لی، اس میں سے کچھ کتابیں ضائع گئیں اور کچھ بچالی گئیں۔ اکبر کے فتح کے بعد سے پھر اس کتب خانہ کا ذکر کتابوں میں نہیں ملتا۔

ظفر الوالہ کے مصنف آصفی نے لکھا ہے کہ شیخ سیدی سعید میرے اوپر بڑا مہربان تھا۔ اور میرے ساتھ اس کا اچھا سلوک تھا، اسی سبب سے اس نے ایک نظم عربی میں شیخ کی تعریف میں لکھی ہے، اور اس کے آخر میں مسجد کی بنا کی تاریخ نکالی ہے۔

غرض ظاہر و باطن میں وہ بہترین شخص تھا، اس کا مکان وسیع، نیکیاں بہت زیادہ اور اس کا اخلاق بڑا بلند پایہ تھا، اس کے پاس ہنڈ[۱] سے زیادہ حبشی غلام تھے، اس کے نوکر ایک تنو، گھوڑے تیس[۲]، اونٹ دس سے زیادہ تھے، بہل (سواری کی گاڑی) اور سامان لادنے والی گاڑیوں کے لئے پچاس بیل تھے۔ گاؤں کا اس قدر بہتر انتظام کیا تھا کہ اس کی آمدنی دوگنی ہوگئی تھی، وہ جس طرح ظاہر میں ایک امیر تھا، وہ باطن میں بھی نیکیوں کا امیر تھا۔

وہ ابنائے جنس (حبشیوں) کا خصوصاً بڑا خیال رکھتا تھا۔ اس کا یہ عروج دیکھ کر لوگوں کو حسد ہوا، اور یہ دیکھ کر کہ جھوجھار خاں اس کا ادب کرتا ہے، بہت جلے، آخر جھوٹے بہتان لگا کر دونوں کو لڑا دیا، جھوجھار خاں نے وہ تمام گاؤں اس سے واپس لے لئے، اور اس قدر بگڑا کہ اس نے قتل کی دھمکی دی۔ پھر کچھ ایسے اسباب پیدا ہو گئے کہ الغ خاں نے اس کو اپنی وکالت میں لے لیا اور

جھوجھار خاں سے بہتر گاؤں اس کو دے،

اس کی نیکیوں میں سے ایک نیکی یہ بھی تھی۔ کہ اپنے جہاز پر ایک جماعت کو حج کرانے کے لئے اپنے ساتھ لے گیا، اور مدینہ کی بھی زیارت کرائی، اور دونوں حرم (مکہ اور مدینہ) میں بہت سے نیک کام انجام دئے۔

اکبر بادشاہ کے احمد آباد فتح کرنے کے تیسرے سال سرکاری طور پر ان کو امیر الحاج بنا کر بھیجا گیا، واپسی کے بعد ۳ شوال دوشنبہ کے دن ۹۸۳ھ مطابق ۴ر دسمبر ۱۵۷۵ء میں شیخ سیدی سعید کا احمد آباد میں انتقال ہوگیا، اور شیخ سعید حبشی سلطانی کے نام سے مشہور ہوئے اور جو مسجد انھوں نے بنوائی اسی مسجد میں وہ دفن کئے گئے، جس کا حال آگے آئے گا اور ان کا آخری نیک عمل یہی حج تھا۔[1]

جالی والی مسجد | یہ مسجد بہت قدیم زمانہ سے بنی ہوئی تھی پہلے یہ اینٹ کی تھی، جو سیدی سعید کے مکان سے متصل تھی۔ اس کو ولی مجذوب شیخ اتن نے بنوانی شروع کی لیکن وہ وفات پا گئے اور اسی جگہ دفن ہوئے۔ اس کے بعد شیخ سعید متولی ہوئے انھوں نے اس کو بنوانا شروع کیا، اور اپنی قبر بھی اسی جگہ بنوائی، اس نے یہ مسجد بنوانی شروع کی تو اس کی بنیاد مضبوط اور بلندی زیادہ کردی، اور اس کی چھت قبہ کے طرز کی بنوائی، اور پتھروں میں بڑے تکلف سے کام لیا، اس کو خاص قوانینِ فن کے مطابق پھیلایا ہے، ہر پتھر طول میں ایک ہاتھ یا دو ہاتھ تھا، مسجد کے اس طرف جدھر جالیاں ہیں مسجد کے احاطہ میں شامل ہے، یہ پتھر کی جالیاں چھیل کر منقش کی گئی ہیں۔ جو بڑی اونچی درجہ کی صنعت ہے۔ مسجد پہلے سے زیادہ وسیع کردی گئی ہے، اور آس پاس کی زمین مسجد کے مفاد کے لئے خرید لی گئی۔ اور مسجد کے صحن کے ساتھ اس نے ایک چبوترہ بنوایا اور اس کے دائیں طرف اس نے اپنی قبر پتھر کی بنوائی، اور جب وہ مسجد کا قبہ، سبیل اور چبوترہ بنا چکا تو اس کو موت آگئی، اور مسجد نامکمل رہ گئی۔[2]

جائے وقوع اور طول و عرض | قلعہ سے ذرا فاصلہ پر لال دروازے کے متصل یہ مسجد واقع ہے، یہ سیدی سعید کی مسجد

[1] ظفر الوالہ جلد دوم لندن [2] ایضاً

کہلاتی ہے، عمارت کی حیثیت سے اس کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ طول میں ۶۸ اور عرض میں ۳۷ فٹ ہے، پہلے زمانہ میں ہندوؤں کے مندر کی طرح آٹھ گوشہ بنا کر اس پر گنبد رکھتے تھے، لیکن اس میں کمان کے اوپر گنبد بنا کر سائبان بنایا گیا ہے، ایک ایک ستون پر چار چار کمانیں رکھی ہیں۔ کمان کی بلندی، عمارت کو بلند کرنے میں آسانی پیدا کرتی ہے۔ یہ احمد آبادی کمان ہے مینارے سادے اور آٹھ گوشہ والے ہیں، مینارے ابتدائی دروازے کے بجائے آخری حصّے میں بنانے کا رواج گجراتی سلاطین کے عہد سے شروع ہوا۔ زینہ کی دیواروں پر نقشی کام بھی ہے، "بہ قامت کہتر و بہ قیمت بہتر" کی مصداق ہے، ساری دنیا میں اس کی شہرت اس سے ہے۔ اس کا سبب اس مسجد کی جالیاں ہیں۔ جو دوسری جگہ نظر نہیں آتیں، شمال اور جنوب کی طرف تین تین حصہ کر کے جالیاں بنائی گئی ہیں۔ اور مغرب کی طرف پانچ، شمال کی جانب خالی پتھر ہیں اور جنوب کی طرف مربع کر کے جالیاں بنائی ہیں، مغرب کی طرف وسط جالی کے کمان میں پتھر رکھ کر بند کر دیا گیا ہے باقی کی چار جالیوں میں سے دونوں طرف کی دو جالیاں مربع بنائی ہوئی ہیں لیکن وسط کی بند کی ہوئی کمان کے آس پاس جو دو جالیاں ہیں ان میں درخت اور پتیوں کی ایک شاندار اور نادر تصویر بنائی گئی ہے، یہی دو جالیاں احمد آباد اور گجرات کے لئے آثارِ قدیمہ کے طور پر باعثِ عزت بنی ہوئی ہیں۔ اس کی اصلی اہمیت کا سبب یہ ہے کہ ایک ہی کمان میں ایک ہی طرح سے بنائی ہوئی تصویر ہے۔ اس کی چوڑائی دس سے گیارہ فٹ اور بلندی سات فٹ ہے اور گولائی نصف اس بڑی جگہ پر الگ الگ مربع پتھر کو رکھ کر اسی میں جالی کا نقش تیار کیا گیا ہے تصویر سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس میں کسی باغیچہ کا منظر ہو۔ کھجور یا ناریل کے درخت کی پتیاں ایسے دل کش طریقے سے بنائی ہیں کہ انسان انگشت بدنداں رہ جاتا ہے۔

غیر ملکیوں کی رائیں: مسٹر ہیپ نے لکھا ہے کہ دنیائے مشرق میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ فرگوسن کہتا ہے کہ دہلی، آگرہ وغیرہ کسی دوسری جگہ ایسی جالیاں نہیں نظر آتیں۔ یونان میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی اور ازمنۂ وسطیٰ میں بھی کسی جگہ اس کی نظیر نظر نہیں آتی، زارِ روس عالمِ شاہزادگی میں جب احمد آباد آیا۔ تو اس نے اس کو دیکھ کر کہا کہ نباتات کی خوبیاں اور ان کی خوبصورتی ان جالیوں میں دکھائی گئی ہیں۔

ان جالیوں کو دیکھ کر "گرداباد اور ریگستان" کو بھول جاتے ہیں[1]۔ حالانکہ اس وقت احمد آباد ویران جیسا تھا، اسی سبب سے غیر ملکی مسافر اور ماہران فن اس کو دیکھ کر دلدادہ ہو جاتے ہیں۔ سر جان مارشل جیسے نکتہ چین نے بھی اقرار کیا ہے، کہ ان جالیوں کی خوبصورت کاریگری کے سبب سے یہ مسجد ساری دنیا میں مشہور ہے پھول، پھل، درخت اور بیل کی ان دو جالیوں جیسا خوبصورت نقش و نگار، دوسری جگہ دیکھنے میں نہیں آیا، فرگوسن نے کہا ہے، کہ یہ مصنوعی نہیں بلکہ اصلی معلوم ہوتا ہے۔ اس کا بنانے والا اپنے فن کا بہترین ماہر تھا۔ اس نے اپنے وقت کے رسم و رواج کو ترک کر کے، صرف اپنے دماغ اور فکر سے ایک نیا نقشہ قایم کیا، گویا وہ یہ سمجھ رہا ہے، کہ پتھر کی بجائے کسی کپڑے پر نقش بنا رہا ہے، سونار، مصور، سنگ تراش معمار، سنجار سب کی روح اس نے ایک ہی جسم میں جمع کر دی ہے اس کا نمونہ پہلے ایک لکڑی کے تختے پر بنایا گیا، جس پر ایک ہزار روپیہ خرچ ہوا۔ پھر اس کا نمونہ پتھر پر اتار اگیا، آج لندن اور نیویارک (امریکہ) کے عجائب گھروں میں اس کی نقلیں موجود ہیں اس زمانہ میں لوگ اس نقش کی نقل فرنیچر میں کرنے لگے تھے سچ یہ ہے کہ مسجد کا یہ نقش و نگار ماہر کاریگروں کا ایک معجزہ ہے[2]۔

غلط فہمی کا ازالہ مرہٹوں کے زمانہ میں بھدر قلعہ کے قریب ہونے سے اگرچہ اس کی عمارت کو سخت نقصان پہنچا مگر اصل مسجد خوش نصیبی سے بچ گئی، فرگوسن سے لے کر ۱۹۴۲ء تک جن جن لوگوں نے اس کا حال لکھا ہے، ان کے بیانات تاریخ میں بہت کچھ غلط فہمی پیدا کرنے والے ہیں۔ چنانچہ ایک شخص نے لکھا ہے، کہ احمد شاہ کے شیدی غلام نے پندرھویں صدی کے نصف اول میں یہ مسجد بنائی، برگس صاحب نے ان کمانوں کو دیکھ کر گمان کیا کہ محمود اعظم کے وقت پندرھویں صدی کے نصف آخر میں بنائی گئی، حالانکہ مشہور جھوجھار خاں کے ہم قوم اور دوست شیخ شیدی سعید نے سنہ ۹۸۰ھ ۱۵۷۲ء میں تیار کرائی۔

اسی طرح اس میں نقشی صرف دو جالیاں ہیں۔ اور وسطی کی نہیں ہے، اس سے لوگوں میں ایسا مشہور ہو گیا، کہ انگریزوں کے عہد میں ایک انگریز، تیسری وسطی کی جالی نکال کر لندن لے گیا۔ بعض کی روایت یہ ہے کہ اس کے کسی متولی سے کسی امریکن نے خرید کر نیویارک (امریکہ) بھیج دی۔ لیکن اس افواہ میں کوئی صداقت نہیں۔

---

[1] جہانگیر نے احمد آباد کا نام "گرداباد" رکھا تھا تو زک جہانگیری جشن ۱۲ [2] کمار جنوری ۱۹۵۳ء

حقیقت یہ ہے کہ یہ مسجد رشیدی سعید کی وفات کے سبب نامکمل رہ گئی، چنانچہ وسط کی جالی کی تکمیل جس طرح نامکمل رہی، اسی طرح جنوب جد عمر مقبرہ ہے، اُس طرف کی اندر کی کمانیں بھی نامکمل رہ گئی ہیں۔ اس کا اصلی سبب یہ ہوا کہ جھوجھار خاں اور رشیدی سعید میں جب نااتفاقی ہوگئی، تو سعید سے اس نے وہ گاؤں واپس لے لئے جس کی آمدنی سے یہ مسجد تیار ہو رہی تھی، پھر الغ خاں نے اس کو گاؤں دے، مگر اکبر اعظم کی فتح گجرات سے ایسا انقلاب آیا کہ گجراتیوں کو سنبھلنے کی نوبت نہیں آئی الغ خاں کی جاگیر ضبط ہوگئی اور اسی سبب سے یہ گاؤں بھی سرکاری قبضہ میں چلے گئے۔

مسجد کی موجودہ حالت | مرہٹوں اور انگریزوں کے ابتدائی عہد میں اس مسجد کی حالت بہت خراب ہوگئی۔ اس میں چونا لگا کر بہت گندہ کر دیا تھا آخر انگریزوں نے اس کو لاوارث سمجھ کر اس میں معاملت دار کی عدالت قایم کر دی، اور مسجد کے بجائے سرکاری محکمہ کا دفتر قرار پایا۔ اور اس میں "ھذا تے وحدہ لاشریک" کے بجائے ایک انسانی پیکر کے آگے سر جھکانا طے پایا۔ عرصہ تک یہی حال رہا۔

لارڈ کرزن کو آثارِ قدیمہ سے ہمیشہ سے دلچسپی تھی، وہ جب ہندوستان میں وائسرائے بن کر آیا۔ تو تمام ہندوستان کے لئے ایک محکمہ "آثار قدیمہ" کا قایم کیا، چنانچہ اس محکمہ کے قانون کے مطابق تحصیلداری عدالت سے یہ مسجد خالی کرا کر اس کی حفاظت کا سامان کیا گیا۔

ابھی چند سالوں سے محکمہ آثارِ قدیمہ کے ماتحت "سُنّی وقف کمیٹی نے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لے لئے ہیں" مسجد کے لئے ایک امام، نمازیوں کے لئے صف، روشنی، وضو کے لئے حوض وغیرہ کا انتظام کیا ہے اور اب یہ مسجد آباد ہو گئی ہے، جہاں پانچوں وقت نماز ادا کی جاتی ہے، افسوس ہے کہ اس کے اردگرد کی زمین اس سے چھین لی گئی ہے۔ کاش اس کو مل جاتی تو اس کی آمدنی سے مسجد کی مرمت اور دیگر ضروریات پوری کی جاسکتیں۔

آصفی نے عربی نظم میں اس کی تاریخ لکھی ہے، جس کا آخری شعر یہ ہے،

عمّر الجامع لِلّٰہ   عامرجاء سعید

صرف اللہ کے لئے اس نے مسجد بنائی۔ بنانے والا سعید آیا۔

ابھی چند دن ہوئے کہ بھارت سے ایک وفد روس گیا ہے۔ اس کے لیڈر دو ملک کے مشہور مل مالک سیٹھ کستور بھائی لال بھائی ہیں جن کا وطن خاص احمد آباد ہے۔ وہاں پہنچ کر انھوں نے "احمد آباد کارپوریشن کے میئر سے درخواست کی ہے، کہ شیدی سعید کی جالیوں کا نمونہ چاندی کا بنوا کر جلد بھیجو تاکہ سرکار روس کے آگے بطور تحفہ پیش کروں۔ چنانچہ اس تار کے ملتے ہی میئر نے دو دن کے اندر تیار کرا کر ہوائی جہاز سے روس بھیج دیا۔

یہ خبر ۷ ار ستمبر ۱۹۵۵ء کے گجرات سماچار میں شائع ہوئی۔ بات یہ ہے کہ زار روس عالم شاہزادگی میں بطور سیاحت جب ہندوستان آیا، تو احمد آباد بھی آکر اس نے شیدی سعید کی مسجد دیکھی۔ اس جالی کو دیکھ کر اس کی صنعت کی بے حد تعریف کی اور اس کا فوٹو بھی اپنے ساتھ لے گیا امریکہ اور انگلستان میں تو اس کا نمونہ پہلے سے ہے، لیکن روس میں اس کا نمونہ پہلی دفعہ گیا ہے

عثمان رض
صرف تاریخ کی روشنی میں

از

ڈاکٹر طٰہٰ حسین

مترجم

(جناب مولانا عبد الحمید صاحب نعمانی)

(۵)

حضرت عثمان رض کی زندگی کے ابتدائی حالات بعض دوسرے صحابہ کی طرح عہد جاہلیت کی تاریکی میں ہیں اور تاریخ کی گرفت سے باہر ہیں، اسلام نے ان حضرات کے نہ صرف دلوں اور عقلوں کو نئی زندگی بخشی، بلکہ ان کی تاریخ کو بھی از سر نو جنم دیا، چنانچہ ان کی اسلام سے پہلے کی زندگی اس طرح ختم ہے جیسے وہ اسلام کے ساتھ ساتھ پیدا ہوئے ہیں، کہا جاتا ہے کہ حضرت عثمان رض واقعہ فیل کے سات سال بعد پیدا ہوئے یہ بھی کہا جاتا ہے کہ آپ کی ولادت طائف میں ہوئی، شاید آپ کی ابتدائی تاریخ سے متعلق یہ غیر مستند روایات ہیں، ان اختلافات کے صحیح ہونے کا سب سے بڑا ثبوت یہ ہے کہ شہادت کے وقت آپ کی عمر کے بارے میں لوگ متفق نہ تھے کوئی ۷۵ بتاتا تھا کوئی ۸۸ اور ۹۰ کہتا تھا کسی کے خیال میں اس وقت آپ کی عمر ۸۲ — ۸۳ — ۸۶ برس کی تھی، اگر آپ کی پیدائش کی ٹھیک تاریخ لوگوں کو معلوم ہوتی تو اتنا اختلاف ہرگز نہ ہوتا، اور یہ موقع تو ہرگز نہ ملتا کہ کوئی صاحب آپ کو ۶۳ ہی برس کا بتا دیتے محض اس خیال سے کہ اس طرح حضرت عثمان رض کا شمار بھی ۶۳ سال کی عمر میں خدا کی رحمت کو پہونچنے والوں میں ہو جائے اور ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابو بکر رض اور باختلاف خفیف حضرت عمر رض کا ہم عمر بنا دیا جائے۔

حضرت عثمانؓ کی دورِ جاہلیت کی زندگی میں سے راویوں کے پاس صرف آپ کا نسب نامہ ہے
چنانچہ وہ لکھتے ہیں کہ آپ ابن عفان بن ابو العاص ابن امیہ بن عبد شمس بن عبد مناف بن قصی ہیں
یعنے آپؓ کا نسب باپ کی طرف سے عبد مناف میں رسول اللہؐ سے مل جاتا ہے، لیکن ماں کی طرف
سے یہ تعلق اور بھی قریب ہو جاتا ہے اس لئے کہ آپ کی والدہ اروی بنت کریز ہیں جن کی والدہ عبد المطلب
کی بیٹی بیضا ام حکیم ہیں اس کے معنی یہ ہیں کہ اروی رسول اللہ کی چچی کی لڑکی ہیں۔

انھیں رشتوں کی بنا پر اموی، حضرت علیؓ اور ان کے ساتھیوں کے خلاف تھے، اور حضرت
علیؓ کو مطعون کرتے تھے کہ اپنے طرزِ عمل سے انھوں نے اپنے چچا اور چچی کے لڑکے کو ذلیل کیا، حضرت
عثمانؓ کا حضرت علیؓ کی چچی کا لڑکا ہونا تو آپ کو معلوم ہو چکا اب رہا چچا کا لڑکا ہونا تو وہ اس طرح
کہ حضرت عثمانؓ عبد المطلب کے لڑکوں کے ساتھ عبد مناف سے مل جاتے ہیں جو ہاشمیوں کے جدّ امجد
ہاشم اور امویوں کے جد اعلیٰ عبد شمس کے باپ ہیں، یہ عفان اور ان کے باپ اور بنو امیہ کا خاندان
بلکہ عبد شمس کا سارا کنبہ اور قریش کی اکثریت تجارت پیشہ تھی ان سب کا تجارتی تعلق شام سے تھا
عفان ایک تجارتی سفر کے دوران میں انتقال کر گئے، اور اپنے لڑکے کے لئے بہت کچھ مال و دولت
ترکے میں چھوڑ گئے، حضرت عثمانؓ نے باپ اور قبیلے کے نقش قدم پر چل کر کامیاب کاروبار کیا اور
کافی دولت پیدا کی۔

ایک دن جب وہ شام کے سفر سے واپس آچکے تھے اُس نئی تحریک کا کچھ حال سُنا جس
کی طرف اللہ کے رسول نے دعوت دینا شروع کر دی تھی، گھر والوں سے آپ نے اس سلسلے میں جو
کچھ سُنا اصحاب سیر اور محدثین اس کو ایک طویل روایت میں تفصیل سے بیان کرتے ہیں، ان
کا خیال ہے کہ آپ کی خالہ سعدی نے نبی کریمؐ کے متعلق آپ سے کچھ باتیں کیں اور آپ کو رغبت
بھی دلائی یہ کاہنہ تھیں اور غیب کی باتیں بتاتی تھیں، بعض کہتے ہیں کہ شام کے سفر سے جب آپ
طلحہ بن عبید اللہ کے ساتھ واپس آ رہے تھے تو راستے ہی میں آپ اللہ کے رسول سے باخبر کر دیئے
گئے تھے، آپ خواب اور بیداری کی درمیانی کیفیت میں تھے کہ ایک منادی کی آواز سُنی جو کہہ

رہا تھا کہ مکہ میں احمدؐ کا ظہور ہوا، پھر جب آپ مکہ پہنچے اور آپ کو واقع کی اطلاع دی گئی تو آپ کے دل پر اس کا خاص اثر ہوا اور جس بات پر تمام راویوں کا اتفاق ہے وہ یہ کہ حضرت عثمانؓ حضرت ابوبکرؓ سے ملے دونوں کی باہم گفتگو ہوئی صدیق اکبرؓ نے اسلام کی دعوت پیش کی حضرت عثمانؓ کچھ مائل سے ہو گئے، اور حضرت ابوبکرؓ کے ساتھ نبیؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے اللہ کے رسولؐ نے نصیحت فرمائی اور اسلام پیش کیا، حضرت عثمانؓ نے قبول کر لیا اور اس مجلس سے مسلمان ہو کر ہی اُٹھے، کہا جاتا ہے کہ حضرت طلحہ بھی اسی مجلس میں مشرف باسلام ہوئے، ایک روایت یہ بھی ہے کہ یہ دونوں حضرات زبیر ابن العوام کے بعد اسلام لائے، بہر حال حضرت عثمانؓ اسلام کے سابقین میں ہیں اُن چودہ صحابہ میں سے ایک ہیں جنہوں نے اسلام لانے میں سبقت کی اور آپ کا اسلام دار الارقم میں قیام نبوی سے قبل کا اسلام ہے،

پھر نبی کی صاحبزادی رُقیہ سے آپ کا عقد ہوا اور آپ دربارِ نبوت میں زیادہ سے زیادہ مقرّب ہوتے، اس کے بعد آپ پر بھی دوسرے مسلمانوں کی طرح آزمائش اور ابتلا کا دور آیا، کہتے ہیں کہ آپ کے چچا حکم بن العاص کو جب آپ کے اسلام لانے کا حال معلوم ہوا تو انھوں نے آپ پر بڑی سختی کی حد یہ کہ آپ کو رسی سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک عثمانؓ اپنے باپ دادا کے دین پر نہیں آجائے گا میں اسے نہیں کھولوں گا، لیکن حضرت عثمانؓ کا استقلال اور اسلام پر پوری شدت کے ساتھ ثابت قدمی دیکھ کر معاملہ ان کی مرضی پر چھوڑ دیا، اسی طرح کہا جاتا ہے کہ جب آپ کی والدہ کو آپ کے اسلام قبول کرنے کی اطلاع ہوئی تو وہ سخت ناراض ہوئی اور اپنی انتہائی بے زاری اور ناگواری کا اظہار کیا لیکن جب ان ناگواریوں کا نتیجہ کچھ نہ نکلا تو وہ بھی باز آگئیں، اس کے بعد جب آنحضرتؐ نے صحابہ کو حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت دی تو حضرت عثمانؓ اپنی اہلیہ سمیت ہجرت کر گئے پھر واپس آئے لیکن دوبارہ حبشہ کی طرف ہجرت کی، اس کے بعد آنحضرتؐ نے جب مدینہ منورہ کو دار السلام بنا لیا تو حضرت عثمانؓ مدینہ ہجرت کر گئے پھر جب اللہ کے رسولؐ اپنے صحابہ کے ساتھ غزوۂ بدر کے لئے نکلے تو حضرت عثمانؓ اپنی زوجہ رقیہ

کی بیماری کی وجہ سے آپ کا ساتھ نہ دے سکے، اور ان کی تیمارداری میں مصروف رہے، جب اللہ نے بدر کی لڑائی میں مسلمانوں کو فتح دی تو آنحضرتؐ نے مال غنیمت میں حضرت عثمانؓ کا حصہ لگایا اور ان کو شرکاء میں شمار کیا بعد ازاں رقیہؓ کا انتقال ہو گیا جس کا حضرت عثمانؓ کو انتہائی ملال رہا اس لئے کہ اس کے بعد دامادی کا رشتہ ٹوٹ گیا لیکن آنحضرت نے رقیہ کی بہن ام کلثوم سے آپ کا نکاح کر دیا ہر چند کہ وہ بھی زیادہ عرصہ تک زندہ نہ رہ سکیں اور انتقال کر گئیں۔

سیرت نگار روایتوں میں بتاتے ہیں کہ آنحضرتؐ نے فرمایا کہ اگر ہمارے پاس کوئی اور لڑکی ہوتی تو ہم عثمانؓ سے اس کا عقد کر دیتے، حضرت رقیہ سے حضرت عثمانؓ کے صرف ایک لڑکا پیدا ہوا تھا لیکن وہ ابھی اپنی عمر کی ساتویں منزل تک ہی پہنچا تھا کہ اللہ کی رحمت نے اسے دنیا سے اٹھا لیا اگر آپ کے صاحبزادے عبداللہ زندہ رہتے تو ان کی اور ان کے باپ کی بات ہی اور ہوتی پھر تو ان کا معاملہ حضرت فاطمہؓ کے دونوں لڑکوں حسنؓ اور حسینؓ کے معاملے سے بہت کچھ الگ نہ ہوتا رحمۃ اللہ علیہم اجمعین

حضرت عثمانؓ احد کی لڑائی میں آنحضرتؐ کے ساتھ ضرور تھے لیکن وہ اس اقلیت کا ساتھ نہ دے سکے جو آنحضرتؐ کے ساتھ آخر تک جمی رہی بلکہ اس اکثریت کے ساتھ جو میدان چھوڑ کر چلی آئی تھی واپس آ گئے لیکن اللہ نے اس اکثریت کو معاف کر دیا اور کہا

اِنَّ الَّذِيْنَ تَوَلَّوْا مِنْكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ	جو لوگ تم میں سے (احد کے دن) جب کہ مومنوں اور
اِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ الشَّيْطٰنُ بِبَعْضِ	کافروں کی دو جماعتیں ایک دوسرے سے گتھ گئیں
مَا كَسَبُوْا وَلَقَدْ عَفَا اللّٰهُ عَنْهُمْ اِنَّ	جنگ سے بھاگ گئے تو ان کے بعض افعال کے سبب
اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ	شیطان نے ان کو پھسلا دیا مگر خدا نے ان کا قصور معاف
	کر دیا بے شک خدا بخشنے والا بردبار ہے۔

اس کے بعد والے تمام غزوات میں حضرت عثمانؓ اسی طرح شریک رہے جیسے بڑے بڑے صحابہؓ لیکن حضرت عثمانؓ کا یہ امتیاز ہے کہ وہ فیاض اور دریا دل تھے اللہ کی راہ میں انھوں نے اپنی دولت اس طرح خرچ کی جس کی مثال ان کے ساتھیوں میں نہیں، جو کچھ انھوں نے کیا اس وقت کے بڑے سے

بڑے متموّل مسلمان وہ نہ کر سکے، انھوں نے ہزاروں کے خرچ سے بیئر رومہ خریدا اور اس کا استعمال مسلمانوں کے لئے عام کر دیا، آنحضرتؐ نے جنت میں ان کو اس سے بہتر عطیہ دینے کا وعدہ کیا اسی طرح جب مصلیوں کے لئے مسجد تنگ ہونے لگی تو انھوں نے زمین خرید کر دی جس سے آنحضرتؐ نے مسجد کو وسیع کر دیا اور حضرت عثمانؓ کو جنت میں اس سے بہتر زمین کے عطیہ کا وعدہ کیا پھر جب تبوک کی لڑائی پیش آئی، اور فقر و تنگی کا زمانہ تھا، خدا کے رسول نے اللہ کی راہ میں امداد کی اپیل کی تو حضرت عثمانؓ نے فوج کی تیاری کا خرچ اپنے ذمے لیا، چنانچہ روایات بتاتی ہیں کہ آپ نے مسلمانوں کو ان کی ضرورت کے مطابق اونٹ اور گھوڑے دیئے روایات ہی میں اس کا بھی تذکرہ ہے کہ حضرت عثمانؓ ایک ہزار دینار کی تھیلی اپنے ساتھ لائے اور آنحضرتؐ کی گود میں رکھ دی، جس کو آپ نے فوج کی تیاری پر صرف کیا، اور حضرت عثمانؓ کے لئے دعا کی کہ ان کے اگلے پچھلے گناہ معاف ہوں اور ان سے جنت کا وعدہ کیا۔

حضرت عثمانؓ انسانوں کے لئے نہایت نیک اور مسلمانوں کے لئے انتہائی ہمدرد تھے، عزیزوں اور رشتہ داروں کے غیر معمولی غم خوار تھے، وہ بے حد سخی، منکسر المزاج اور حلیم الطبع تھے، محدثین اور سیرت نگاروں کی روایات کے مطابق آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ کی جس خصلت کو امتیازی درجہ دیا ہے وہ سچی شرم اور سنجیدگی ہے، اللہ کے رسول فرمایا کرتے تھے کہ عثمانؓ سے تو ملائکہ شرم کرتے ہیں آنحضرتؐ اپنے صحابہ سے بے تکلف ملا کرتے تھے، لیکن جب آپ کو یہ معلوم ہو جاتا کہ عثمانؓ آ رہے ہیں تو پھر اہتمام فرماتے تھے اور ارشاد کرتے کہ ہم ایک ایسے شخص سے کیوں نہ شرم کریں جس سے خود ملائکہ شرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس اہتمام کا سبب بھی بیان فرماتے تھے کہ اگر وہ ایسا نہ کریں تو حضرت عثمانؓ تھوڑی دیر بھی وہاں ٹھہر نہ سکیں گے اور پھر نہ اپنی ضرورت پیش کر سکیں گے اور نہ کوئی گفتگو، حدیبیہ کے موقع پر آنحضرتؐ نے حضرت عثمانؓ کو قریش کے پاس سفیر بنا کر اسی خیال کے پیشِ نظر بھیجا کہ نبی امیہ اور قریش کی نگاہوں میں آپ محترم اور معزز تھے علاوہ ازیں آپ میں وہ نرمی، وسعت ظرف اور حسنِ اخلاق تھا جس کی ضرورت تھی، لیکن جب آپ کو معلوم ہوا کہ قریش نے حضرت عثمانؓ کے ساتھ دغا کی تو آپ نے جہاد اور نصرت کے لئے بیعت لی، قرآن مجید میں آیت نازل ہوئی۔

اِنَّ الَّذِیْنَ یُبَایِعُوْنَکَ اِنَّمَا یُبَایِعُوْنَ اللّٰهَ یَدُ اللّٰهِ فَوْقَ اَیْدِیْهِمْ فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِهٖ وَمَنْ اَوْفٰی بِمَا عٰهَدَ عَلَیْهُ اللّٰهَ فَسَیُؤْتِیْهِ اَجْرًا عَظِیْمًا۔	جو لوگ تم سے بیعت کرتے ہیں وہ خدا سے بیعت کرتے ہیں خدا کا ہاتھ ان کے ہاتھوں پر ہے پھر جو عہد کو توڑے تو عہد توڑنے کا نقصان اسی کو ہے اور جو اس بات کو جس کا اس نے خدا سے عہد کیا ہے پورا کرے تو وہ اس کو عن قریب اجر عظیم دے گا۔

آنحضرتؐ نے اپنے ایک ہاتھ سے حضرت عثمانؓ کی طرف سے بھی بیعت کی، اصحاب سیر اور محدثین نے بہت سی حدیثیں روایت کی ہیں جن میں صحیح بھی ہیں اور ان کی صحت محتاج بیان نہیں اور بعض موضوع بھی ہیں اور ان کا موضوع ہونا بالکل ظاہر ہے ہاں بعض حدیثیں ایسی ہیں جن میں کم و بیش شک کی گنجائش ہے لیکن یہ تمام حدیثیں متفقہ بتاتی ہیں کہ حضرت عثمانؓ آنحضرتؐ کے نزدیک بڑے چہیتے تھے اور آپ کے مقربین میں خاص درجہ رکھتے تھے، آنحضرتؐ نے آپ کو بار بار جنت کی بشارت دی، اور بار بار آپ کو بتایا کہ خدا آپ سے خوش ہے، پھر حضرت عبداللہ بن عمرؓ خدا کی ان پر رحمت ہو فرماتے ہیں کہ عہد نبوی میں مسلمان حضرت ابوبکرؓ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کو مقدم جانتے تھے، ان کے علاوہ صحابہ میں سے کسی کو امتیازی درجہ نہیں دیتے تھے اگر یہ حدیث صحیح ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ خود عہد نبوی میں یہ تینوں صحابی بقیہ صحابہ کے مقتدا تھے، بہر حال سلف نے اُن افراد کے لئے عشرہ کا عرف مقرر کیا جن کے جنتی ہونے کے آنحضرتؐ ضامن ہیں اور وہ حضرت ابوبکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، حضرت طلحہ ابن عبید اللہ، حضرت زبیر بن العوامؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ، حضرت ابو عبیدہ بن جراح حضرت سعید بن زید ابن نفیل ہیں،

پس حضرت عثمانؓ ان میں سے ایک تھے، اور یہ تو ہر مسلمان جانتا ہے کہ آپ اسلام کے سابقین اولین میں سے ہیں، دو مرتبہ آپ کو اللہ کے رسولؐ کی دامادی کا شرف ملا، اور خدا کی راہ میں جان و مال کی ہر آزمائش میں آپ ثابت قدم رہے،

وفات نبوی کے بعد جب صدیق اکبرؓ کے لئے بیعت لی جارہی تھی حضرت عثمانؓ فوراً بڑھے اور اخلاص ومحبت کی باتیں دیر تک کرتے رہے، پھر وہ تحریر جس میں حضرت ابوبکرؓ نے خلافت کے لئے حضرت عمرؓ کو منتخب کیا تھا حضرت عثمانؓ ہی نے لکھی تھی، حضرت ابوبکرؓ نے املا کرایا اور حضرت عثمانؓ نے لکھا، کہا جاتا ہے کہ املا کرانے کے درمیان حضرت ابوبکرؓ پر غشی کی سی کیفیت طاری ہوگئی اور حضرت عثمانؓ ابھی اس قدر لکھ سکے تھے "میری خواہش ہے کہ میں تمہارا خلیفہ ——— تو حضرت عثمانؓ نے اس کے بعد کے الفاظ "عمرؓ کو بناؤں" ——— اپنی طرف سے لکھ دیا، پھر جب افاقہ ہوا تو حضرت ابوبکرؓ نے املا کی ہوئی تحریر کو پڑھنے کے لئے کہا چنانچہ حضرت عثمانؓ نے پوری عبارت عمرؓ تک پڑھدی، صدیق اکبرؓ نے بلند آواز سے حضرت عمرؓ کے لئے اسلام اور مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر کی دعا کی، اور حضرت عثمانؓ کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تمہیں اس کا خطرہ پیدا ہوا کہ میں شاید ہوش میں نہ آسکوں اس لئے جو کچھ میرے دل میں تھا وہ تم نے پہلے ہی لکھ دیا اور تمہیں اس کا حق بھی ہے پھر جب حضرت عمرؓ کے لئے بیعت شروع ہوئی تو سب سے پہلے حضرت عثمانؓ نے بیعت کے لئے ہاتھ بڑھایا اور خلیفۃ المسلمین کے ساتھ مشورے اور اخلاص وخیر خواہی کی باتیں ہوئیں۔

اس کے بعد جب فاروق اعظمؓ خنجر سے زخمی ہوئے، اور حالات کی نزاکت کے پیش نظر لوگوں نے آپ سے خواہش کی کہ اپنی طرف سے کسی کو نامزد فرما دیں تو آپ نے اس سے انکار کیا لیکن مسلمانوں کو بلا مشورہ رکھنا بھی پسند نہیں فرمایا چنانچہ اس کے لئے ایک مجلس شوریٰ کی تجویز پیش کی اور یہ مجلس ان چھ افراد میں محدود کردی جن سے آنحضرتؐ خوش تھے اور دنیا سے رحلت فرمانے تک خوش تھے آپ نے اس مجلس میں اپنے چچا کے لڑکے سعید بن زید ابن نفیل کو نہیں رکھا حالانکہ وہ ان دس صحابہ میں سے ایک ہیں جن کے لئے جنت کی ضمانت خود اللہ کے رسولؐ ہیں لیکن حضرت عمرؓ نے یہ مناسب نہیں جانا کہ خلافت خاندان عدی میں دو مرتبہ آئے حضرت عمرؓ نے تو ان کو مجلس میں حاضری کی بھی اجازت نہیں دی مبادا مجلس شوریٰ کے کسی رکن پر سعید سے آنحضرتؐ کی خوشنودی کا اثر پڑے یا عمرؓ کا رشتہ کسی کو متاثر کردے ہاں اپنے صاحبزادے عبداللہ کو مجلس میں حاضری کی اجازت دی لیکن شرکت

اجلاس کے سوا انھیں کسی بات کا حق نہ تھا اس لئے کہ اول تو آپ کو یہ گوارا نہ تھا کہ خطاب کی اولاد میں سے دو خلیفہ ہوں دوسرے یہ کہ آپ اپنے لڑکے کو بار خلافت کے لئے کمزور پاتے تھے،

میں خیال کرتا ہوں کہ اگر حضرت ابو بکرؓ کچھ دنوں اور زندہ رہتے اور حضرت عمرؓ کی طرح آپ کو یہ موقع ملتا کہ فتوحات کا سلسلہ جاری ہے، حکومت میں ترقی ہے، حکومت کے معاملات اور اس کی مصلحتوں میں الجھاؤ بڑھتا جا رہا ہے مسلمان روزانہ نئے نئے حالات اور نئے نئے انقلابات سے دوچار ہو رہے ہیں خطرناک اور اہم مسائل اور مشکلات کا ایک سلسلہ جاری ہے جو کہیں سیاست کہیں انتظام اور کہیں دین کے حقائق کی حفاظت کی شکل میں سامنے آ رہے ہیں، بلا شبہ اگر حضرت ابو بکرؓ زندہ ہوتے اور جو کچھ حضرت عمرؓ کی آنکھوں نے دیکھا اس کو دیکھتے تو آپ کا نقطۂ نظر اور طرزِ عمل وہی ہوتا جو حضرت عمرؓ کا تھا، آپ بھی فاروق اعظم کی طرح کسی کو خلافت کے لئے نامزد کرنے یا نہ کرنے میں تردد فرماتے اور شاید آپ بھی کم و بیش اسی کے مشابہ کوئی نظم تجویز کرتے جو حضرت عمرؓ نے پیش کیا۔ آپ تو دنیا سے اس وقت گئے جب مسلمان تقریباً عہد نبوی کی سی حالت میں تھے آپ نے ارتداد کا شکار ہو جانے والے عربوں کو اسلام کا حلقہ بگوش کر کے بیرونی ممالک میں بھیج دیا، فتوحات کا آغاز ہو چکا تھا لیکن بات ابھی بہت آگے نہیں بڑھی تھی مگر فاروق اعظم کے دور میں مسلمان زندگی کے ہر شعبے میں ایک جدید ماحول پا رہے تھے، فتوحات کی طرف رخ کیا تو بڑھتے ہی چلے گئے، اتنے بڑھے کہ مصر، شام، اور جزیرے سے رومیوں کو نکال باہر کیا، ایران کی سرزمین پہنچ کر فارسی اقتدار کی بنیاد ڈھا دی۔ اور ان ممالک کے اکثر و بیشتر حصوں پر قابض ہو گئے، پھر فتوحات کی مصلحت نے مزید پیش قدمی پر مجبور کیا اور مسلمانوں نے بحرِ ابیض کے مشرقی ساحل سے رومیوں کو نکال دیا تاکہ ان کے اور اپنے درمیان ایک اطمینان بخش حدِ فاصل بنا لیں بلکہ قسطنطنیہ تک پہنچ کر روم کے بادشاہ کا خاتمہ کر دیں جس طرح فارس میں کیا، اور پھر ایران میں فتوحات کی تکمیل کر کے اپنی حکومت کے حدود مشرق میں اس آخری حد تک پھیلا دیں جہاں تک فوج کے پہنچنے کا امکان ہو، اس مقصد کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کی ایک مستقل حربی سیاست ہو جس میں تنظیم کے ساتھ

ایسی صلاحیت ہو کہ وہ دنیا میں پھیلے اور فتوحات کا سلسلہ زمین کے گوشوں تک پہنچا دے، اس قسم کی مسلسل اور پیہم فتح کے لئے اس کے مستقل اسباب کی فراہمی ضروری تھی یعنی ایسی فوج جو صرف مقررہ مقاصد کے لئے پیش قدمی کرے پھر اس فوج کی ترتیب اسی بدوی مزاج عناصر سے ہوئی تھی جو بعد کے باقاعدہ اور منظم جنگ کے طریقوں سے نا آشنا تھے، کسی تربیت یافتہ فوج سے مقابلہ ان کے بس کی بات نہ تھی اور وہ بھی ایک ایسی سرزمین پر جس کا انھیں نہ کچھ پتہ ہو نہ تجربہ، وہ تو غارتگری سے واقف تھے، اور لوٹ مار کرنا خوب جانتے تھے۔

اسلامی فتوحات کی تاریخ ہم پڑھتے ہیں تو ہمیں بڑی خوشی ہوتی ہے اور ہم عربوں کی قوت ان کی تیزی اور ان کے عزم پر دنگ ہو جاتے ہیں پھر بحث و تمحیص، تجزیہ اور تحلیل کے ذریعے دلوں میں سکون پیدا کرتے ہیں چنانچہ ان تمام فتوحات اور انقلابات کو اس وعدے کا ایفار خیال کرتے ہیں جو مسلمانوں سے خدا نے قرآن مجید میں کیا ہے اس ایمان کی طرف منسوب کرتے ہیں جس سے مسلمانوں کے دل معمور تھے، اور جس نے مشکلات اور مصائب کا مقابلہ کرنے کے لئے ان کو اس طرح آمادہ کر دیا تھا کہ ان کے دل خدا پر اعتماد سے لبریز تھے اور اطمینان کلی تھا کہ اللہ اپنا وعدہ ضرور پورا کرے گا اور انھیں ہر محاذ پر فتح و نصرت نصیب ہوگی۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سب باتیں بالکل سچ اور حق ہیں اور یہ بھی صحیح ہے کہ مسلمان فتوحات کے میدان میں وہ قوی ایمان لے کر نکلے جو راہ کی دشواریوں اور مشکلات پر غالب آگیا لیکن ہر بات کے کچھ اسباب اور وسائل ہوتے ہیں اور یہ اسباب و وسائل بنتے ہیں کوششوں سے بہت سی تدبیروں اور تخمینوں نیز غور و فکر پر عملی اقدامات سے تاکہ یہ منتشر اور متفرق دل پہلے تو ایک ہو سکیں پھر اپنے ملک سے دور باہر کے معرکوں میں کود پڑیں اور ان کی منظم طاقت کا ایک دوسری منظم طاقت سے ٹکراؤ ہو، پس حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے جو منظم اور جرار لشکر تیار کیا اور جس کو دنیائے قدیم کے حصوں میں بھیجا یہ کوئی معمولی مشکل یا آسان بات نہ تھی اور نہ یہ کوئی آسان کام تھا کہ اس لشکر کو معرکوں اور فتوحات کے بعد اس کے پڑاو پر مسلسل برسوں روکا جا سکے

جب کہ ہم جانتے ہیں کہ پرانی لڑائیوں اور حملوں میں عربوں کی عادت کیا رہی ہے وہ تو لڑتے ہی اس لئے تھے کہ غالب آجائیں اور مال غنیمت لے کر فوراً اپنے گھروں کو واپس ہوں تاکہ اس لوٹی ہوئی دولت سے کچھ دن امن چین سے گذاریں، لیکن ایسی لڑائی جس کے آغاز کا پتہ ہو لیکن یہ معلوم نہ ہو کہ وہ کب ختم ہوگی اور کہاں ختم ہوگی؟ پھر یہ کہ وہ عہد جاہلیت کی لڑائیوں بلکہ غزوات نبوی کی طرح کی بھی نہ ہو، نہ ارتداد کے زمانہ کی لڑائیوں سے میل کھاتی ہو ایسی لڑائی بلا شبہ جد وجہد کا وہ کارنامہ ہے جس کا تصور کرنا بھی دشوار ہے، حضرت عمرؓ ان کے رفقاء اور سپہ سالاروں نے شکوک اور تذبذب سے بلند ہو کر دانشمندی کے ساتھ اقدام کئے چنانچہ مقاصد میں انھیں کامیابی کی توفیق ملی، آپ اندازہ کیجئے، بڑے بڑے شہر آباد کرنا، ان میں فوجیں ٹھہرانا پھر باری باری سے فوجوں کی واپسی کی تنظیم برقرار رکھنا مزید براں یہ بھی ملحوظ رکھئے کہ یہ فوجیں انھیں بدوی عربوں سے مرتب کی گئی تھیں جو نہ تہذیب سے مانوس تھے نہ تمدن کے خوگر، ان باتوں کا صحیح اندازہ لگانے پر آپ ان اہم جنگی مشکلات کا احساس کر سکیں گے جن سے اپنا دامن بچا کر حضرت عمرؓ اور ان کے ساتھی آگے نکل گئے۔

اسی طرح ہم اسلامی تاریخ میں دفاتر کے قیام کی کارروائی پڑھتے ہیں اور تعجب اور خوشی کی لہروں میں آگے بڑھتے چلے جاتے ہیں اگر ہم تھوڑی دیر کے لئے اس مقام پر رک جائیں اور اس حقیقت کا پتہ چلائیں کہ یہ چھوٹا سا لفظ "دیوان" یعنی دفتر جس دقت نظر کے ساتھ میدان جنگ کے مجاہدوں اور فدا کاروں سے متعلق اعداد وشمار بتاتا ہے ان کے قبیلوں کی ان کے مقامات سکونت کی تفصیل کرتا ہے اسی اہمیت وباریکی کے ساتھ ان کے خاندان اور قبیلے کے ان لوگوں کے اعداد وشمار اور تفصیلات بھی متعین کرتا ہے جو ان کی معاشی کفالت میں تھے یا ان کی طرف سے حکومت ان کی ذمہ دار تھی۔ تو ہمیں معلوم ہوگا کہ عربوں کی بدوی زندگی میں حساب کتاب اور اعداد وشمار ایک ایسی اہم جدت ہے جس کی مثال ان کی پہلی زندگی میں نہیں ملتی اور یہ کوئی ایسی معمولی بات نہیں ہے کہ ہم سرسری طور پر اس سے گذر جائیں، جب ہم اس لشکر کے ساتھ میدان جنگ میں ہوتے دیکھتے ہیں یا روم وفارس کی بڑی بڑی لڑائیوں کے بعد اس کو شہروں میں مقیم پاتے ہیں اور اس دلکش نظام پر غور کرتے ہیں جو حضرت عمرؓ نے اپنے مشاورین کی رائے اور مشورہ سے تیار کیا تھا جس کی رو سے کوئی فوجی چھ ماہ سے زیادہ اپنے اہل وعیال سے دور لڑائی پر نہیں رہ سکتا تھا، تو ہم کو اندازہ ہوتا ہے کہ خلیفہ اور اس کے معاونین کو جنگی سیاسی مشکلات کا مقابلہ کرنے کے لئے کتنی زبردست معنوی اور مادی کوششوں کی ضرورت ہے۔

حیدر آباد کے چند کتب خانوں میں حدیث کی اُردو قلمی کتابیں

از

(جناب نصیر الدین صاحب ہاشمی)

چند سال پہلے رسالہ معارف میں مولانا ابویحیٰی امام خاں صاحب نے ایک مضمون "ہندوستان میں علم حدیث کی تالیفات" کے عنوان سے شائع کیا تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ مضمون معلومات آفریں اور بڑی کاوش سے قلمبند ہوا تھا۔ مگر مضمون میں شروع سے آخر تک جس قدر کتابوں کا ذکر کیا گیا تھا وہ تقریباً سب کی سب شمالی ہند سے متعلق تھیں۔ جنوبی ہند کو بالکل نظرانداز کر دیا گیا تھا۔

یہ ایک حقیقت ہے کہ شمالی ہند میں مسلمانوں کے قدم آنے کے پہلے جنوبی ہند میں وہ تاجر اور مبلغ کی حیثیت سے آچکے تھے۔ اس امر کا ثبوت ملتا ہے کہ جنوب میں آنے والے اصحاب میں کئی محدثین بھی تھے ان لوگوں کی اولاد نے اپنے اجداد کی میراث کو ترقی دی علم و فن میں اپنا مقام بنایا۔ اول تو حدیث کی عربی کتابیں لکھیں اور پھر فارسی اور دکنی کی جانب متوجہ ہوئے۔ اس کے علاوہ دکن کی اسلامی حکومتیں یعنی بہمنی، عادل شاہی اور قطب شاہی وغیرہ علم و فن کی سرپرست رہیں اس لئے عراق۔ عرب اور ایران سے سینکڑوں علماء، فضلا دکن آئے جن میں محدث بھی تھے اس موقع پر یہ تو سردست دشوار ہے کہ دکن کی علم حدیث کی تمام تالیفات کی تفصیل کی جائے یہاں بعض حدیث کی اردو قلمی کتابوں کا تعارف کرانا مقصود ہے۔

یہ ایک حقیقت نفس الامر ہے کہ اردو زبان میں مذہب اسلام کا جو ذخیرہ فراہم ہو گیا ہے وہ غالباً فارسی میں بھی نہیں ہے۔ اگر مذہبی ایک ایک فن مثلاً تجوید۔ تفسیر۔ حدیث وغیرہ کو منتخب

کرکے اردو قلمی اور مطبوعہ کتابوں کا جائزہ لیا جائے تو اس کے لئے طویل صفحات کی ضرورت ہوگی۔ اس موقع پر ہم صرف حدیث کی ان قلمی کتابوں کا تذکرہ کرتے ہیں جو حیدرآباد کے چند کتب خانوں یعنی کتب خانہ آصفیہ۔ کتب خانہ نواب سالار جنگ مرحوم۔ کتب خانہ جامعہ عثمانیہ اور کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں موجود ہیں۔ امید ہے کہ ناظرین کی دلچسپی کا موجب ہوگا۔ بلحاظ حروف تہجی ان کا تذکرہ کیا جاتا ہے

(۱) **انوار محمدی** —— یہ جامعہ عثمانیہ کے کتب خانہ میں موجود ہے۔ (سروری صفحہ ۲۱ صفحہ ۲۹۲ سطر ۱۶ سائز ۷×۶ انچ سنہ تالیف سنہ ۱۲۱۲ھ

یہ شمائل ترمذی کا اردو نثر میں ترجمہ ہے۔ اس کو مولانا علی جونپوری نے (جو کرامت علی سے موسوم تھے) کیا ہے۔ نفس مضمون کے پہلے ایک مختصر دیباچہ ہے اس میں اصل عربی متن بھی ہے اور ساتھ ساتھ ترجمہ شامل ہے۔ بقول پروفیسر سروری صاحب یہ نسخہ خود مترجم کے ہاتھ کا لکھا ہوا ہے۔

آغاز: "سب تعریف اللہ ہی کے واسطے لائق ہے جس نے ہم سب کو اپنے تمام مخلوقات سے افضل کرنے کے لئے آدمی بنایا اور سب امتوں سے عزت دینے کے لئے امت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم میں پیدا کیا"

(۲) **ترجمہ زواجر** (موسومہ ترجمہ آدم فی الحدیث)

اس کتاب کے کتب خانہ آصفیہ میں (تین) نسخے اور کتب خانہ سالار جنگ میں (دو) نسخے ہیں

(الف) **کتب خانہ آصفیہ**

۱۔ نمبر (۱۴۶) حدیث۔ سائز (۹×۶) صفحہ ۱۵۰ سطر ۱۵

۲۔ نمبر حدیث (۱۵۴۲) سائز (۹×۶ انچ) صفحہ (۲۵۱) سطر ۱۱

۳۔ نمبر مواعظ (۱۶۵) سائز (۱۰×۵ انچ) صفحہ (۲۰۲) سطر ۱۵

(ب) **کتب خانہ سالار جنگ**

۱۔ نمبر (۱۵۲) سائز (۱۲×۷ انچ) صفحہ (۱۵۳) سطر ۱۵

۲۔ نمبر (۵۴۹) سائز (۸×۵½ انچ) صفحہ ۸۰ سطر ۱۳

زواجر حدیث کی مشہور کتاب ہے جس کو امام ابن حجر ہیثمی نے مرتب کیا تھا اس میں ایسی حدیثیں

جمع ہیں جن کو آنحضرت صلعم نے مختلف قسم کے گناہ گاروں کو ان کی گنہ کی تنبیہہ میں ارشاد فرمایا ہے ترجمہ آدم فی الحدیث اس کا اردو ترجمہ ہے جو بعہد حکومت امیر الہند عمدۃ الامرا (۱۲۱۰ ھ تا سنہ ۱۲۱۶ ھ) ہوا ہے۔

عمدۃ الامرا ارکاٹ کے حکمران تھے اور محمد علی خاں والاجاہ کے فرزند تھے۔ ان کے بعد مسند نشین ہوئے اور صرف چار سال کے بعد انتقال کر گئے۔ یہ کتاب بارہ ابواب پر منقسم ہے جن کی تفصیل حسب ذیل ہے

۱۔ نماز اور وضو کا بیان

۲۔ ماں باپ کی فرماں برداری

۳۔ زنا اور حرام کاری

۴۔ مرد کا مرد کے ساتھ اور عورت کا عورت کے ساتھ زنا کرنا

۵۔ مرد کے حقوق

۶۔ عورت کے حقوق

۷۔ خودکشی۔ قتل اور اسقاطِ حمل

۸۔ زکوٰۃ

۹۔ سود

۱۰۔ شراب خوری

۱۱۔ مصیبت میں رونا اور نوحہ کرنا۔

۱۲۔ گناہ کبیرہ

مترجم نے اس امر کی صراحت کی ہے کہ پانچویں اور چھٹے باب کو تنبیہہ الغافلین سے ماخوذ کیا ہے ایک زمانہ میں یہ کتاب طبع ہوئی ہے مگر اب نایاب ہے۔ قلمی نسخے بعض کتب خانوں میں پائے جاتے ہیں چنانچہ ان کی صراحت کر دی گئی ہے۔

آغاز: الحمد للہ رب العالمین الخ جمیع حمد و ثنا خدا کے لئے سزاوار ہے جو گنہ گار کے

زہر کے تئیں توبہ کا زہر مہرہ بخشا ہے اور عصیاں کے کوہ کے تئیں عاصی کے عذر وحیلہ کی ٹانکی سے اکھاڑ دیا ہے

(۳) ترجمہ مرغوب القلوب

افسوس ہے کہ اس کے مترجم کا نام معلوم نہیں ہوا مگر یہ پایا جاتا ہے کہ ..ا ھ کے اوائل میں یہ ترجمہ ہوا ہے۔

کتاب چند ابواب میں تقسیم ہے جن کی صراحت یہ ہے۔

۱۔ توبہ

۲۔ نفس ۔ دل ۔ روح

۳۔ وضو

۴۔ ترکِ دنیا

۵۔ تجرید اور تفرید

۶۔ خودی کی شناخت

۷۔ عشق

۸۔ معشوق

۹۔ فنا اور بقا

سفر از دنیا

ہر باب میں اولاً حدیث لکھی گئی ہے بعض میں قرآنی آیت بھی ہے اس کے بعد اس کا اردو ترجمہ کیا گیا ہے۔

یہ کتاب کتب خانہ آصفیہ میں موجود ہے۔ حدیث (۶۱۲) سائز (۱۰×۶ انچ) صفحہ (۱۱م)

آغاز کی عبارت یہ ہے۔

"کل امر ذی بال لم یبدء الخ

پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہے جو کہ کچھ کام کرے گا کوئی خدا کا ناؤں نا لیکو تو او کام پائمال ہوئیگا

الحمد للہ رب العالمین - سرانا نوازنا خداکون کہوت کہ اوپانے ہارا ہے عالم کون"
(۴) ترجمہ مشکوٰۃ نمبر حدیث (۷۶۵) سائز (۱۶ × ۹ انچ) صفحہ ۹۹۹ سطر ۲۵ یہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے۔

یہ حدیث کی مشہور کتاب مشکوٰۃ ہے۔ اس کا اردو ترجمہ سنہ ۱۱۵۰ھ کے بعد سنہ ۱۲۰۰ھ کے قریب کسی نے کیا ہے اس کتاب کے مترجم کا نام معلوم نہ ہوسکا یہ نسخہ سنہ ۱۲۷۰ھ میں ایک صاحب علم دولت مند شخص کے ملک میں رہا ہے کیوں کہ محمد ابو سعید خاں تہور جنگ کی مہر ثبت ہے یہ نسخہ اس سنہ میں نقل ہوا ہے کیوں کہ خاتمہ پر حسب ذیل عبارت ہے۔

"رب کے فضل سیں یہ کتاب مشکات شریف دکھنی شرح کا لکھنا آج کے روز یکشنبہ کا دو تاریخ ستارین رجب المرجب سن بارہ سو الفتر ہجری کو بخیریت اختتام پایا۔"

اس سے واضح ہوتا ہے کہ جس سنہ میں اختتام کو پہنچی ہے اس سنہ میں تہور جنگ کی مہر ہے اس لئے یہ پایا جاتا ہے کہ موصوف کے لئے ہی یہ کتاب نقل کی گئی یا انھوں نے اس سنہ میں خریدی ہے

آغاز کی عبارت یہ ہے

در رکن اول کسب کرنا اور حلال کھانے کے بیان میں اس میں بیس باب! در سات فصل ہیں اور تین سو نو حدیث ہیں۔ باب اول اس میں تین فصل اور تیس پر ایک حدیث ہیں۔ فصل اول اس میں گیارہ حدیث ہیں۔ پہلے حدیث عربی میں لکھی گئی ہے اس کے بعد اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔ لفظی ترجمہ ہے۔

(۵ تا ۸) چہل حدیث

اس نام سے کئی نسخے ہیں ہم یکے بعد دیگرے کتب خانوں کے لحاظ سے صراحت کرتے ہیں

(الف) کتب خانہ آصفیہ میں چہل حدیث کے نام سے (۲) قلمی کتابیں ہیں

(۱) چہل حدیث ہے نمبر (حدیث ۵۹۸) سائز (۷ × ۴ انچ) صفحہ ۱۲۶

سنہ ۱۰۰۰ھ میں ترجمہ ہوا ہے مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا۔ اس رسالہ میں چالیس مختلف حدیث سیاہی سے لکھی گئی ہیں اس کے نیچے اس کا ترجمہ سرخی سے لکھا گیا ہے۔ حدیثیں مختلف النوع

ہیں۔ آغاز یہ ہے۔

"تمام شکر سزاوار اللہ تعالیٰ کیں اور رزق دیتا ہے تمام عالم کوں۔ بہور عاقبت کی خوبیاں پرہیزگاروں کوں،
درود بہور اسلام اوپر رسول کے اچھو او صاحب نام ان کا محمد ہور ان کی آل اوپر ان کے اصحابات کے اوپر
ہور سارے مسلمانان کے اوپر جیکوئی پر یکا چہل حدیث یاد رہے گا چالیس حدیث کوں میری امت کا
تاوں رکھے گا اللہ تعالیٰ بیچ آسمان کے نبی کر کر"

(۲) چہل حدیث نمبر (۴۰۹) سائز (۸×۵ انچ) صفحہ ۲۳ سطر ۱۵

اس کے مترجم کا نام بھی ظاہر نہیں ہوتا۔ سنہ ۱۲۲۵ھ کے بعد کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے اس میں بھی چالیس مختلف حدیثیں شامل ہیں۔

آغاز یہ ہے

الحمد للہ رب العالمین الخ

"ایک عربی حدیث لکھی گئی ہے اس کے بعد یعنی فرماتے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کہ جو کوئی چالیس حدیث میری امت میں یاد کریں گے تو آسمان میں نام اس کا ولی بولیں گے زمین میں فقہ کا عالم بولیں گے محشر میں اس کو صالح لوگوں کے ساتھ ملا دیویں گے"

(ب) کتب خانہ نواب سالار جنگ میں چہل حدیث کے نام سے دو[2] نسخے ہیں۔

(۱) نمبر ۳۰۹ سائز (۷×۶) صفحہ ۱۰۰ خط شکستہ

اس کے مترجم کا نام معلوم نہ ہو سکا البتہ زبان کے لحاظ سے اوائل سنہ ۱۱۰۰ھ کا ترجمہ قرار دیا جا سکتا ہے۔

اس رسالہ میں چالیس مختلف النوع حدیثیں درج ہیں اولاً عربی میں حدیث لکھی گئی ہے اور اس کے نیچے اردو میں معنی لکھے گئے ہیں۔

آغاز

"رسول اللہ کے عورتاں پر ہور الخ کے باران پر قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم حضرت پیغمبر نے فرمایا درود ہور

سلام بھیجو خدا تعالیٰ انو پر من حفظ علی امتی اربعین حدیث یعنی جو کوئی یاد کرے گا میری امت میں کا میری چالیس باتاں کوں۔

(۲) ترجمہ چہل حدیث نمبر (۱۶۹) سائز (۷×۶ انچ) صفحہ ۸۲ سطر ۵

مترجم نامعلوم اوائل سنہ ۱۱۰۰ھ کا ترجمہ معلوم ہوتا ہے کتابت سنہ ۱۲۳۷ھ

• اس رسالہ میں بھی چالیس مختلف حدیثیں لکھی گئی ہیں۔ اولاً عربی میں حدیث لکھی گئی ہے اور اس کے نیچے سرخی سے معنی لکھے گئے ہیں:۔

آغاز

"قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم ...... تمام شکر سزاوار ہے اللہ تعالیٰ کو رزق دیتے رہے سب عالم کوں ...... عاقبت کے خوبیاں پرہیزگاراں کوں۔ درود ہو سلام اور رسول کے اور صاحب ہے نام ہے ان کا محمد اور ان کے آل ہور اصحاب کے اوپر کہتے ہیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم جو کوں پڑیگا ہور جو کوئی یاد رکھے گا چالیس حدیث کوں۔"

(ج) کتب خانہ ادارہ ادبیات اردو میں چہل حدیث کے نام سے ایک نسخہ ہے۔

نمبر (۲۳۳) سائز (۱۰×۶) صفحہ (۸) سطر ۱۲

یہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی جمع کردہ چالیس حدیثوں کا ترجمہ ہے ۱۲۲۲ھ میں یہ نسخہ لکھا گیا ہے کاتب میر فخر الدین ہے یہ کاتب ہی مترجم معلوم ہوتے ہیں۔ جگہ جگہ حاشیہ پر وضاحت بھی کی گئی ہے

آغاز

"بعد تعریف خدا کے اور درود مصطفیٰ کے یہ چالیس حدیثیں مستند ہیں صحیح سند کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم تک ان کے بول تھوڑے ہیں اور مقصد بہت ہیں کہ پڑھے ان کو کھلی بات جاننے والا۔"

(۹) رسالہ حدیث

یہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے نمبر (۲۰۸) سائز (۱۲×۶ انچ) صفحہ ۵

اس رسالہ میں چند حدیثیں درج ہیں جو مختلف النوع کی ہیں

آغاز

بیان کرتے ہیں سجدیان کا کہ سجدے بارا ہیں ایک سجدہ بندگی کا ہنے ہور یک سجدہ تحیت کا ہے یعنی سلام رب ہے تعظیم کے بدل۔

(۱۰) سراج الغنیوۃ شرح شمائل ترمذی حصہ اول و دوم ،سوم و چہارم۔

یہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے (حدیث ۳۲۶ و ۳۲۷ و ۳۲۸ و ۳۲۹) سائز (۱۲×۸) صفحہ ۵۳۰ ،۴۰۴ ،۳۲۷ و ۳۲۹ و ۱۶۳ ہے سطر (۱۷) خط نسخ و نستعلیق تاریخ ترجمہ ۱۲۵۶ھ مترجم سید بابا قادری سید بابا قادری حیدرآباد کے متوطن تھے ان کے والد کا نام سید شاہ محمد یوسف قادری تھا اور دادا سید شاہ محمد قادری تھے۔ سید بابا قادری اپنے وقت کے ایک اچھے عالم تھے عربی فارسی کی اعلیٰ قابلیت رکھتے تھے۔

انھوں نے ایک تفسیر بھی قلم بند کی ہے جس کا نام تفسیر فوائد بدیہیہ اور تفسیر تنزیل بھی ہے

انھوں نے اس ترجمہ شمائل میں بیان کیا ہے کہ لوگوں کو اس قسم کی دینی کتابوں کی طرف رغبت نہیں ہے لیکن جو لوگ اس کے شائق معلوم ہوتے ہیں وہ لبا غنیمت ہیں۔ تفسیر کو بھی انھوں نے اپنے چند دوستوں کے اصرار سے قلمبند کرنے کا ذکر کیا ہے اور اس ترجمہ کے متعلق صراحت کرتے ہیں کہ دو اشخاص کی فرمائش سے اس ترجمہ کو کیا گیا ہے ایک تو کوئی دوست محمد علی نام تھے دوسری شخصیت ایک خاتون کی ہے۔ یعنی منیر النساء بیگم۔ مترجم نے ان کے متعلق یہ بھی صراحت کی ہے کہ نظام الدولہ رئیس دکن (آصف جاہ ثانی) کی دختر ہیں اور ہمیشہ خدا کی عبادت میں مصروف رہا کرتی ہیں۔ فقرا اور اہلِ باطن سے دلی شفقت ہے۔ ان کے ہی زیادہ اصرار پر انھوں نے اس کو مکمل کیا ہے۔

جیسا کہ تذکرہ کیا گیا ہے یہ کتاب چار جلدوں میں تقسیم کی گئی ہے اولاً دیباچہ ہے جو فارسی میں ہے اس کے بعد نفس مضمون شروع ہوا ہے اولاً عربی میں حدیث لکھی گئی ہے اس کے بعد ترجمہ اور شرح ہے۔ دس سال کی مدت میں اس کو مکمل کیا گیا ہے خاتمہ میں انھوں نے اس کی صراحت

کردی ہے۔ آغاز اور اختتام کی عبارت حسب ذیل ہے۔

آغاز

الحمد للہ الذی الخ

"اما بعد احقر العباد والمحتاج الی رب العباد سید بابا القادری الحیدرآبادی ابن حضرت سید شاہ محمد یوسف القادری عفر اللہ ..... چنین گوید کہ پس از تالیف تغیر تنزیل بزبان ہندی خواست کہ بعض احادث رابزبان ہندی ترجمہ کنند۔"

اصل مضمون کے اردو ترجمہ کا انداز یہ ہے۔

"ابو بکر صدیق کہے اے بلال اپنی آنکھوں کیں نیند سے نگاہ رکھ پس بلال نماز میں مشغول ہوتے جس قدر ہوسکا نماز ادا کئے بعد اس کے اپنی اونٹ، کی کاٹھی سے تکیہ لئے آنکھیں بند کئے۔"

"خاتمہ ..... الحمد للہ کہ رمضان شریف کی سترویں تاریخ یکشنبہ کے روز سنہ ۱۲۶۶ھ میں شمائل ترمذی کی شرح کرنے سے فراغت ہوئی۔"

(۱۱) صراط مستقیم

یہ کتاب کتب خانہ آصفیہ میں ہے نمبر (حدیث ۴۸۴ ۱۵) سائز (۹×۷ انچ) صفحہ (۱۳۰) اس کے مترجم شاہ محمد دکنی کے ایک عالم ہیں سنہ ۱۱۵۰ھ کے قبل مرتب کیا ہے۔

اس کتاب میں مختلف النوع حدیث جمع کئے گئے اور بعض قرآنی آیتیں بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسی حدیثیں ہیں جو گناہ سے اجتناب کرنے سے متعلق ہیں۔

آغاز

"این رسالہ ایکست مسمی بہ صراط مستقیم بوجہ کہ مرید حقیقی نے ارادتِ کاملہ سے اپنے تاثر سے قہر کے اور لطف کے ہر عضو آدمی کے وجود کا کیا از رائے ظاہر کے اور کیا از رائے باطن کے دیا اور گناہ صغائر سے اور کبائر سے تعبیر کیا ہے۔"

(۱۲) مقامات شاکر

یہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے نمبر (حدیث ۷، ۹۰) سائز (۱۲×۸) صفحہ ۵۴۳ - اس کے مولف ابو الخیر محمد عبد الشاکر ہیں سنہ ۱۲۵۰ھ کے مابعد کی کتاب معلوم ہوتی ہے۔

کتاب تیس باب پر منقسم ہے چند ابواب کے عنوان یہ ہیں۔

شکرِ الہٰی - شرک - علم - سماع - وعظ - عفویات - چغلی - کلمہ طیبہ - نماز وغیرہ

آغاز

"بعد حمد اور صلوٰۃ کے فقیر حقیر غریق بحر عصیاں الراجی بفضل اللہ تعالیٰ ابو الخیر محمد عبد الشاکر ابن محمد عبد القادر کان اللہ لہ ولوالدیہ اپنے نفس سرکش کو خطاب کرتا ہے کہ حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ نے انسان کو اشرف مخلوقات پیدا کیا اور اس کو انواع واقسام کی نعمتوں سے ممتاز وسرفراز فرمایا ہے۔"

(۱۳) قیامت نامہ - یہ کتاب سالار جنگ کے کتب خانہ میں (۲۳۶) سائز (۸×۶ انچ) صفحہ ۱۱ سطر (۱۱) مولف کا نام معلوم نہیں ہوا۔ سنہ ۱۲۰۰ھ کے مابعد کی تالیف معلوم ہوتی ہے - اس میں صرف وہ حدیثیں جمع کی گئی ہیں جو روز قیامت ہونے والے واقعات کے متعلق ہیں - انھیں امور کو ظاہر کیا گیا ہے۔

آغاز

"روایت کرتے ہیں معاذ بیٹے جبل کے رضی اللہ عنہ یک روز خدا کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کئے کہ قول ہے خدا تعالیٰ کا یوم ینفخ فی الصور فتاتون افواجا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے معاذ بوجھ سخت آیت بھی رسول اللہ علیہ السلام کی انکھاں نے انجو بھوت سے لگے۔"

(۱۴) تقریر بخاری - یہ کتب خانہ آصفیہ میں ہے نمبر حدیث (۱۴۳۳) سائز (۱۰×۵ انچ) صفحہ (۳۵۰) سطر ۱۴ مولانا محمود حسن دیوبندی کی تالیف ہے - جو سنہ ۱۳۳۳ھ میں ہوئی ہے مولانا محمود حسن کے متعلق کسی تفصیل کی ضرورت نہیں ہے موصوف عصر حاضر کے ان علماء میں شامل تھے جنھوں نے اپنے علم کی وجہ سے شہرت حاصل اور اپنی بہترین کردار کے باعث اپنا نیک کام چھوڑ گئے۔

اس کتاب میں سید محمد بشیر عبداللہ حسینی دیوبندی نے اپنے استاد مولانا محمود حسن سے جو تقریریں احادیث صحاح کے متعلق سنی ہیں ان کو ضبط تحریر میں لائے ہیں۔ اور حدیثوں کے متعلق جو تاویل، تطبیق، توجیہہ و تحقیق مولانا نے فرمائی اس کو قلمبند کر لیا گیا ہے۔

"آغاز

"بدالوحی۔ اس بات کو بیان کرنے میں کہ کیفیت وحی کی کیا تھی اور کیفیت بھی ابتدا کی کہ کس طرح ابتدا ہوئی اور بخاری کا طرز ہے۔ . . . . کہ کسی ترجمہ کے لئے جو صحابی کا قول یا آیت ہوتی ہے تو بیان کر دیتے ہیں کبھی اس لئے کہ اس میں کچھ تفصیل ہوتی ہے اور حدیث کے باب میں کس قسم کا رجحان تھا۔"

اگرچہ ان قلمی کتابوں کی تعداد زیادہ نہیں ہے مگر اس کے بعد جو حدیث کی کتابیں ترجمہ ہو کر شائع ہوئی ہیں ان کی تعداد اس سے بہت زیادہ ہے۔ یہاں یہ منشا نہیں تھا کہ دکن میں اردو کی حدیث کی کتابوں پر تنقید کی جائے اور ان کی تفصیلی صراحت ہو بلکہ صرف کتب خانوں میں ان کے موجود رہنے کا داخلہ ارباب علم کے علم میں لانا مقصد تھا جو اس مضمون سے پورا ہو جاتا ہے اگر کبھی موقع ہو تو دکن کی حدیث کی کتابوں کی صراحت کی جا سکتی ہے۔

جدید بین الاقوامی سیاسی معلومات

"بین الاقوامی سیاسی معلومات" میں سیاسیات میں استعمال ہونے والی تمام اصطلاحوں، قوموں کے درمیان سیاسی معاہدوں، بین الاقوامی شخصیتوں اور تمام قوموں اور ملکوں کے سیاسی اور جغرافیائی حالات کو نہایت سہل اور دلچسپ انداز میں ایک جگہ جمع کر دیا گیا ہے یہ کتاب اسکولوں، لائبریریوں اور اخباروں کے دفتروں میں رہنے کے لائق ہے، جدید ایڈیشن جس میں سیکڑوں صفحات کا اضافہ کیا گیا ہے قیمت مجلد آٹھ روپے (ع۸) علاوہ محصول ڈاک

منیجر:۔ ندوۃ المصنفین اردو بازار۔ جامع مسجد دہلی ۶

"دو سنگموں کا حیرت انگیز توافق"

از

(جناب ڈاکٹر محمد احمد صاحب صدیقی ایم۔ اے۔ ڈی۔ فل)

لیکچرر عربی و فارسی یونیورسٹی الہ آباد

اگر آپ سنگم کا نام کسی کے سامنے لیجئے گا تو معًا اس کا ذہن شہر الہ آباد (پریاگ) کے اس حصہ کی طرف منتقل ہو جائے گا جو دریائے جمنا (جمن) اور دریائے گنگا کے اتصال سے پرانی جھونسی کے قریب بن گیا ہے، اس سنگم کو ہندو حضرات نے کئی ہزار برس سے مقدس مانا اور اس کے ساتھ نہایت عظمت و احترام کا برتاؤ کیا ہے میرے نزدیک ان دونوں دریاؤں کے تقدس اور اس کے سنگم کا تبرک کا عقیدہ آرین قوم نے یہاں جاری کیا ورنہ ہند کے قدیم اقوام مثلاً دراوڑ وغیرہ کا یہ عقیدہ نہ تھا میرے نزدیک اس کی دو وجہیں ہیں۔ اول یہ کہ آرین قوم یہاں فاتح بن کر آئی تھی۔ قیاس باور نہیں کرتا کہ فاتح نے مفتوح کا عقیدہ اپنا لیا ہو۔ فاتح تو خود اپنی تہذیب، اپنے مذہب، اپنے اوضاع و اطوار اپنی روایات کی طرف مفتوح کو جذب اور ضم کرتا ہے نہ کہ اس کے برعکس۔ دوم یہ کہ میں نے دراوڑ قوم کا یہ عقیدہ تاریخ کی کسی کتاب میں نہیں دیکھا، مورخوں نے دراوڑ کے عقائد و اطوار کا کچھ نہ کچھ تذکرہ کیا ہی ہے مگر اب تک کسی نے یہ عقیدہ ان کا نہیں لکھا، میں اس کا تو اعتراف کرتا ہوں کہ تاریخ جیسے وسیع فن پر مجھے زیادہ عبور اور نظر نہیں ہے تاہم جن چند مستند مورخین کی کتابیں میں نے دیکھی ہیں ان میں ان کا یہ عقیدہ کہیں نہیں دیکھا۔

یوں تو قدیم قومیں جتنی بھی ہیں اور جہاں جہاں بھی ہیں سبھوں نے اپنے اپنے ملک کے دریاؤں کو محبوب و عزیز رکھا کیوں کہ انسانی ضروریات زندگی کا پورا کرنے میں پانی کا جو درجہ ہے ظاہر ہے حتیٰ کہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے یہاں تک فرما دیا کہ

وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَاءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ

ہم نے ہر زندہ چیز کو پانی ہی سے بنایا ہے۔

بلکہ یہ دیکھ کر کہ پانی ہی پر زندگی کا دارومدار ہے اور یہ مایۂ زندگی ہے بعضوں نے تو اسی عام پانی کو جو ہر جگہ دستیاب ہوتا ہے اور ہر شخص کے استعمال میں آتا ہے "آبِ حیات" کہہ دیا یعنی ہر پانی خود عینِ زندگی اور نفسِ حیات ہے۔ غرض جب عام پانی بھی اتنا کچھ ہر دل عزیز، نافع، حاجت روا، فرحت افزا اور جاں بخش ہے تو اگر کسی دریا کے متعلق کچھ مذہبی روایات کچھ عقیدت فزا واقعات و حکایات بھی ہوں تو پھر تو اس کی اہمیت اور ہر دلعزیزی کا بھلا کیا ٹھکانا ہوگا اور دریائے گنگا و جمنا کا معاملہ کچھ ایسا ہی ہے، ہندو حضرات کے یہاں ان دونوں کے متعلق مذہبی روایات ٹھیک اسی طرح موجود ہیں جس طرح عراق کے دریائے فرات اور مصر کے دریائے نیل کے متعلق خود اہلِ اسلام میں روایات موجود ہیں کہ ان دریاؤں کی سوتیں اور جڑیں جنت کی نہروں سے نکلی ہیں[1]۔ اب چونکہ انسان عاقل اور متمدن ہونے کے ساتھ ساتھ عجائب پسند بھی واقع ہوا ہے اس لئے بالعموم یہ صورت پیش آتی ہے کہ جب مذہبی روایتیں کسی چیز کی فضیلت میں موجود ہوتی ہیں تو ہر قوم میں دو قسم کے لوگ ہو جاتے ہیں ایک قسم بہت خوش عقیدہ اور سادہ مزاج لوگوں کی ہوتی ہے جو فرطِ عقیدت میں بعض وقت ان روایات کی مناسب حدود سے بھی کچھ آگے بڑھ جاتے ہیں اور دوسری قسم ان کی ہوتی ہے جو عقیدت اور عمل میں درجۂ اعتدال میں رہتے ہیں، آپ اگر دوسرے ممالک کے دریاؤں کے ہم سایوں کا جائزہ لیں گے تو یقیناً وہاں بھی آپ کو کچھ لوگ ایسے ملیں گے جو عقیدت مندی کی رو میں بہہ کر حدود سے دور نکل گئے ہیں۔

بہر حال ہندو حضرات میں ان دونوں دریاؤں کی نفع بخشی اور حاجت روائی کا مشاہدہ تو عام تھا ہی اس کے ساتھ مذہبی روایات بھی تھیں اس لئے ان کی بنیادوں پر ان سے متعلق بہت گہرے عقائد بھی ہیں۔ یہاں مجھے نہ تو ان کے عقائد کا جائزہ لینا ہے اور نہ ان کی روایات سے متعلق کوئی بحث کرنی ہے کہ یہ امور میرے موضوع سے خارج ہیں، میں تو اس وقت ان کے ایک مذہبی تخیل کا ذکر اس سلسلہ میں کرتا ہوں کہ مجھے تاریخ اور جغرافیائے عالم میں ایک اور سنگم کا حال بھی معلوم ہے جس کا حال بہت کچھ اس الٰہ آبادی سنگم کے حال سے ملتا جلتا ہے۔

---

[1] دیکھو مشکوٰۃ باب المعراج

ہندو حضرات کا تخیل اور تصور اس سنگم کے متعلق جہاں تک مجھے معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ:-

۱- دریائے جمنا اور گنگا چونکہ کسی رشی کی جٹاؤں سے نکلتی ہیں جو ہمالیہ کے کسی چشمہ کے قریب مقیم تھے اس لئے یہ دونوں دریا بھی بہت متبرک اور مقدس ہیں۔

۲- ان دونوں دریاؤں کے نقطۂ اتصال پر ایک چشمہ "سرسوتی" نام کا اور بھی موجود ہے جو نگاہوں سے مخفی ہے وہ بھی بہت مقدس ہے۔

۳- ان تینوں پانیوں (دریاؤں) کی وجہ سے اس نقطۂ اتصال کو "سنگم" (ملاپ کی جگہ) اور "تربینی" (تین کا مجموعہ) کہتے ہیں اور سارے تبرک و تقدس کا سرچشمہ دراصل یہی تربینی ہے اسی لئے گناہوں کا کفارہ اسی جگہ کا غسل بنتا ہے۔

(۲)

سنگم یا دریاؤں کے نقطۂ اتصال کو عربی زبان میں "مجمع البحرین" کہتے ہیں" (اور اگر بالفرض عام طور پر نہ کہتے ہوں تو کہا تو یقیناً جا سکتا ہے) لیکن واضح رہے کہ سنگم یا دو دریاؤں کے اتصال کا موقع ساری دنیا میں ایک ہی نہیں ہے چنانچہ تفسیر بیان القرآن میں ہے کہ "مختلف دو دریاؤں کے ملنے کے متعدد مواقع ہیں"[۱] اور ظاہر بھی ہے کہ دو دریا دو سمندر۔ ایک دریا اور ایک سمندر۔ یا کئی دریا و سمندر اس وسیع دنیا میں معلوم نہیں کتنی جگہوں پر ملے ہوں گے۔

آئیے تبدیلِ ذائقہ کے لئے آپ کو ایک دوسرے سنگم کا ایک مشہور واقعہ سناؤں:-

آج سے تقریباً چار ہزار برس پہلے ایک جلیل القدر شخصیت (حضرت سیدنا موسیٰ علیہ السلام کی مبارک ذات) عالم وجود میں آئی جو مظلوموں کی ہمدرد اور ظالموں کی سرکوب تھی۔ جو مزدوروں اور محکوموں کی حمایتی اور مغرور رئیسوں کے لئے قہرِ خداوندی تھی۔ اس نامور ہستی نے وادیِ نیل جیسی زرخیز سرزمین کے عیش پسند اور خود پرست بادشاہ طوطمیس[۲] اول (یا مصعب بن[۳] ریان) نام کی ساری فرعونیت کو تن تنہا اپنی خداداد معجزانہ طاقتوں سے ختم کر کے دھر دیا تھا۔

---

[۱] ج ۶ ص ۱۲۸ [۲] عبداللہ یوسف کا ترجمہ قرآن انگریزی [۳] بیضاوی ۲۳

خیر فرعون کی ان سے دشمنی اور اس دشمنی کے باوجود خود اسی کے محل میں ان کا پرورش پانا۔ پھر دوسرے شہر کو ان کا چلا جانا۔ پھر شادی پھر نبوت کا ملنا یہ سب ایک طویل داستان ہے جو ہمارے موضوع سے خارج ہے اس لئے ہم ان واقعات کو نظر انداز کر کے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صرف اس واقعہ کا تذکرہ کرتے ہیں جو ایک سنگم کے قصہ سے وابستہ ہے:۔

ایک دن حضرت موسیٰ علیہ السلام ایک مجمع میں تبلیغی وعظ فرما رہے تھے جب وعظ ختم ہوا تو ایک آدمی نے آپ سے پوچھا کہ بھلا بنی اسرائیل میں آپ سے بھی بڑھ کر کوئی عالم ہے؟ موسیٰؑ نے فرمایا کوئی نہیں اگرچہ آپ کا یہ جواب ایک واقعہ اور حقیقت نفس الامری تھا مگر چونکہ اس سے بظاہر اپنی بڑائی کا دعویٰ بھی ثابت ہوتا تھا اس لئے اللہ تعالیٰ کو اپنے محبوب بندہ (موسیٰؑ) کی زبان سے یہ جواب ان کے اخلاقِ عالیہ کے مخالف اور ناپسند معلوم ہوا تو وحی میں ارشاد ہوا کہ میرا ایک بندہ ہے' اسے میں نے اپنے پاس سے ایک خاص علم عطا فرمایا ہے' وہ تم سے علم میں بڑھا ہوا ہے۔ اس ارشاد میں جو ایک مخفی لطیف تنبیہ تھی حضرت موسیٰؑ اسے سمجھ گئے اور اپنے دعویٰ نما جواب پر استغفار کیا پھر عرض کیا بارِ الٰہا آپ کے اس بندۂ خاص کا کیا نام ہے اور ان کی جائے قیام کہاں ہے؟ ارشاد ہو تا کہ میں بھی ان کی زیارت کروں اور ان کے علم سے کچھ مستفید ہو سکوں' حق تعالیٰ نے فرمایا کہ "وہ مجمع البحرین[2] یعنی دو دریاؤں کے ایک سنگم پر ملیں گے' ان سے ملنے کے لئے جب جانے لگو تو مچھلی نمک لگا کر تل بھون کر ساتھ ضرور لے لینا جس سنگم پر وہ مچھلی زندہ ہو کر تمہارے پاس سے نکل جائے بس اسی جگہ سنگم پر میرا بندہ تمہیں ملے گا' یہی ان کا پتہ ہے۔

صاحبِ حیاتِ خضر کی رائے ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سنگم کی تعیین حضرت موسیٰؑ سے کردی تھی (ص۱) مگر صاحبِ بیان القرآن کے مذکورہ جملہ (دو دریاؤں کے ملنے کے متعدد مواقع میں) سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ اس سنگم کا متعین پتہ حضرت موسیٰؑ کو نہیں بتایا گیا تھا نیز دو قرائن اور بھی ہیں جن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اس سنگم کی تعیین نہیں کی گئی تھی۔

قرینہ اول۔ اگر سنگم کی تعیین ہی کر دی گئی تھی تو پھر مچھلی کے عجیب زندہ ہو کر پاس سے نکل

جلنے کا پتہ مقرر کرنا اور بتانا تقریباً بے کار ہو جاتا ہے۔

قرینہ دوم۔ اگر تعیین ہوتی اور جیسا لوگوں نے لکھا ہے کہ بحر احمر کی دو شاخوں کے باہم ملنے کی جگہ ہی مراد تھی تو گو موسیٰؑ کے لئے اس کا تصور تو نہیں کیا جا سکتا کہ آپ جغرافیائی نقشہ سے اطلاع رکھتے ہوں مگر تاہم ان کے اہلِ وطن میں اس کی واقفیت ناممکن نہ ہونی چاہئے کہ فلسطین کے پاس والا دریا دراصل ایک بڑے دریا کی ایک شاخ ہے جو کہیں آگے چل کر مل گیا ہے اور وہ جگہ زیادہ دور نہیں تو اس کے لئے آپ کا یہ طرزِ بیان کہ "میں جب تک اس سنگم تک نہ پہنچ لوں گا چین نہ لوں گا چاہے مجھے سالہا سال چلنا پڑے" کسی طرح مناسب اور معقول نہیں معلوم ہوتا اس لئے میرے نزدیک سنگم کی تعیین نہیں کی گئی تھی بلکہ اس سنگم کا بھی پتہ وہی مچھلی کا زندہ ہو کر غائب ہو جانا تھا اور حضرت موسیٰؑ نے اسی لئے یہ فرمایا کہ جب تک ایسے سنگم پر جہاں وہ مچھلی گم نہ ہو جائے نہ پہنچ لوں گا چین نہ لوں گا گو سالہا سال گذر جائیں۔

بہرحال یہ تو ایک علمی بحث ضمناً نکل آئی تھی۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ موسیٰؑ نے سامانِ سفر درست کرنا شروع کیا سب سے پہلے رفیقِ سفر کے انتخاب کا مسئلہ تھا تو آپ نے حضرت یوشعؑ کو ساتھ لے جانے کا فیصلہ فرمایا جو اس وقت تو آپ کے صحابی تھے مگر آپ کے بعد آپ کے جانشین اور پیغمبر ہوئے اس کے بعد آپ نے مچھلی نمک ملا کر تل بھون کر ساتھ لی۔ اس کے بعد آپ طلبِ علم کی دھن میں ایک طالبِ صادق بن کر اس نامعلوم درسگاہ کی طرف اس نامعلوم استاد کی تلاش میں چل کھڑے ہوتے اور چونکہ کسی دو سمندروں کے ملنے کی جگہ یعنی سنگم ہی کی انھیں تلاش تھی اس لئے انھوں نے سمندر کے کنارے کنارے ہی چلنا شروع کیا اب خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ حضرت موسیٰؑ کو کتنے برسوں کی مدت اور کتنی مسافت طے کرنے کے بعد وہ سنگم ملا اور پھر پہلے ہی سنگم پر وہ معلم مل گئے یا کتنے سنگموں سے آپ کو ناکام گذرنا پڑا بہرحال ایک دن آپ کو یہ سنگم ملا دونوں مسافر وہاں ٹھہر کر کچھ دیر تک تو مچھلی کے غائب ہونے کا انتظار کرتے رہے اس کے بعد دونوں حضرات اپنے سامانِ سفر ہی کے قریب سو گئے کچھ

دیر کے بعد پہلے حضرت یوشعؑ کی آنکھ کھلی، انھوں نے وضو کے لئے پانی لینا چاہا تو دیکھا کہ دونوں سمندر (یا دونوں دریا) تک تو پھر بھی کچھ فاصلہ ہے مگر ایک چھوٹا سا چشمہ صاف پانی کا بالکل قریب ہی ہے انھوں نے اسی کا پانی لیا اور قریب ہی ایک پتھر پر بیٹھ کر وضو کرتے (منہ ہاتھ دھونے) لگے پانی جو زمین پر گر رہا تھا اس کی کچھ چھینٹیں توشہ دان پر اور تلی ہوئی مچھلی پر بھی پڑیں بس چھینٹوں کا پڑنا تھا کہ مچھلی پہلے کچھ کلبلائی پھر اس نے ایک جست جو لگائی تو سنگم کے قریب گری اور وہاں سے جو تڑپی تو پانی میں جا پہونچی اور حضرت یوشعؑ حیرت میں دیکھتے ہی رہ گئے وہ چشمہ جس کا پانی حضرت یوشعؑ نے لیا تھا دراصل آب حیات کا چشمہ تھا مگر حضرت یوشعؑ اس کو آب حیات اس لئے نہ سمجھ سکے کہ وہ تو مچھلی کے زندہ ہو کر غایب ہونے کے خود ہی انتظار میں تھے اور جب وہ زندہ ہوئی تو اس کو براہ راست خدا کی قدرت کاملہ کی وجہ سے سمجھ رہے تھے، مچھلی کا زندہ ہونا انھوں نے دیکھا مگر ان کا ذہن ادھر منتقل ہی نہ ہو سکا کہ یہ اس چشمہ کے پانی کی تاثیر ہی سے زندہ ہوئی۔

اس کے آگے واقعہ طویل بھی ہے اور ہمارے موضوع سے خارج بھی اس لئے ہم اس کی تفصیلات تو نظر انداز کرتے ہیں لیکن تاہم اگر ذیل کی چند اطلاعات یہاں ہم درج نہ کر دیں گے تو ہمیں یقین ہے کہ ناظرین اس واقعہ مذکورہ ہی کے سمجھنے میں بھی بے حد تشنگی محسوس کریں گے اس لئے اس حکایت لذیذ کو کچھ اور بیان کرنے کی اجازت اور معافی چاہتے ہیں۔

۱۔ حضرت موسیٰؑ کو کچھ تکلیف اٹھانے کے بعد سنگم ہی پر (یا اس کے متصل ہی کسی جزیرہ پر) ایک بزرگ نظر آئے یہ حضرت خضرؑ تھے، [۱]

۲۔ حضرت کا نام بلیا مین بن ملکان تھا خضر ان کا لقب تھا جو اس وقت سے آج تک نام سے زیادہ مشہور ہے۔ [۲]

۳۔ خضر ان کو اس لئے کہتے ہیں کہ وہ جہاں بیٹھتے یا لیٹتے یا خدا کی عبادت کرتے اس جگہ کی

---

[۱] جلالین ص ۲۳۶ کا حاشیہ ع ۱۱۔ ابن کثیر ج ۳ ص ۹۳ [۲] حیات خضر ص ۱۹ [۳] ایضاً ص ۔

خشک گھاس بھی ہری ہو جاتی چوں کہ سبز چیز کو عربی میں خضر کہتے ہیں اس لئے آپ اپنی کرامت کے سبب اس نام اور لقب سے مشہور ہو گئے [غالباً یہی تخیل آپ کے ساتھ اس قدر وابستہ ہو گیا ہے جس کے باعث جس کسی نے بھی آپ سے اپنی ملاقات کا ذکر کیا ہے اس نے آپ کے لباس یا چادر یا عصا یا عمامہ وغیرہ کے سبز ہونے کا ذکر ضرور کیا ہے]

۴۔ ان کا مشہور زمانہ پیغمبر ابو الاقوام سیدنا ابراہیم علیہ السلام سے قبل کا ہے اور یہی صحیح ترین قول ہے سیدنا ابراہیمؑ کے دادا (ناحور) اور حضرت خضر دونوں چچیرے بھائی تھے اب تاریخ اٹھا کر دیکھئے تو ابراہیمؑ کا زمانہ آج سے تقریباً پانچ ہزار برس پہلے (تین ہزار برس قبل مسیح) معلوم ہوتا ہے

۵۔ حضرت خضرؑ کے زمانہ میں ایک مسلمان بادشاہ عبداللہ بن ضحاک نامی تھا آپ اس کے مختلف سفروں میں ہمراہ تھے، وہ کسی وجہ سے ذوالقرنین کے نام سے مشہور تھا (جس کا ذکر قرآن میں ہے) کہتے ہیں کہ اسے بھی چشمۂ آب بقا کی تلاش تھی حضرت خضرؑ نے ان سفروں میں کسی جگہ بے خبری میں محض "بخت و اتفاق" سے بلا قصد اور بغیر تلاش کے ایک چشمہ سے پانی پی لیا جو آب حیات تھا مگر چونکہ آپ نے اسے آب حیات نہیں سمجھا تھا اس لئے اس کی کوئی علامت یا اس کا کوئی پتہ بھی آپ یاد نہ رکھ سکے کہ کسی کو بتا سکتے۔[3]

۶۔ حضرت خضر علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے قیامت تک کی طویل زندگی (جسے گو عرفِ عام میں حیاتِ ابدی اور عمر جاوداں کہتے ہیں مگر کہنا نہ چاہئے کیوں کہ ابد تک کی مسلسل زندگی ان کو نہیں ملی ہے بلکہ صرف قیامت تک کی زندگی ملی ہے صور پھونکنے پر ساری مخلوقات کے ساتھ ان کو بھی موت آئے گی) اپنے فضلِ خاص سے عطا فرمائی ہے اور اس کا سببِ ظاہری یہ بھی ہو گیا کہ آپ نے اس چشمہ کا پانی پی لیا جس کی تاثیر حیات بخش ہے تمام مسلمانوں کا اور اکثر علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ وہ زندہ ہیں، اکثر لوگوں سے ملے اور ملتے ہیں۔[4]

۷۔ حضرت موسیٰؑ اور حضرت خضر علیہما السلام کی ملاقات جس جگہ ہوئی ہے اس کی تعیین

---

[1] حیات خضر ص۲ [2] ایضاً ص۳ و ۴ [3] حیات خضر ص۴ و ۵ [4] ایضاً ص۳۰

بھی مفسرین نے کی ہے کہ بحر احمر کی دو شاخیں[1] (خلیج عقبہ اور خلیج سویز) جہاں باہم ملی ہیں وہ سنگم ان کی جائے ملاقات ہے [احقر کو اس سے کچھ اختلاف ہے جیسے اشارتاً اوپر عرض کر چکا ہوں]

(۳)

یہاں پہنچ کر جی چاہتا ہے کہ اوپر کے بیانات کا خلاصہ دوبارہ لکھ دیا جائے اور دونوں سنگموں کے خصائص پر بالمقابل بھی ایک نظر ڈالی جائے۔

۱۔ الٰہ آباد کے سنگم پر بھی دو دریا ملتے ہیں اور ان میں ساتھ ہی ساتھ ایک تیسرا چشمہ یا دریا سرسوتی نام کا ملنا بھی مانا جاتا ہے موسیٰؑ اور خضرؑ کے اس تاریخی سنگم پر بھی دو دریا ملے اور ایک تیسرا چشمہ بھی ان کے قریب بلکہ درمیان ہے جیسا اوپر آ چکا۔

۲۔ الٰہ آباد کا تیسرا چشمہ یا دریا بھی عام نگاہوں سے مخفی مانا گیا ہے اور موسیٰ و خضر کے سنگم پر بھی تیسرا چشمہ عام نگاہوں سے مخفی ہی ہے کیوں کہ اگرچہ حضرت خضر نے بھی اسے دیکھا بلکہ اس کا پانی بھی پی لیا اور اس طرح حضرت یوشع نے بھی اسے دیکھا اور اس کے اثر سے مچھلی میں جان پڑ گئی مگر چوں کہ دونوں اس کی خاصیت اور حقیقت سے بے خبر تھے اور بے خبر رہے اس لئے اس کا نظر آنا نہ آنا دونوں برابر ہیں اب بھی اسے مخفی ہی سمجھنا چاہیئے۔

۳۔ الٰہ آباد کے اس تیسرے چشمہ سرسوتی کو علم کی دیبی مانا گیا ہے اور موسیٰ و خضر کے اس تاریخی سنگم کے تیسرے چشمہ کو علم سے بڑی قوی مناسبت ہے کیوں کہ علم ہی حاصل کرنے کے لئے موسیٰؑ چلے تھے خضر کے علم ہی کی شہادت خدا نے دی، وہ سنگم علم ہی کے حصول کی جگہ تھی۔

۴۔ جس طرح پریاگ میں ایک بڑے رشی رہا کرتے تھے جن کا نام بھردواج تھا اسی جگہ اس سنگم پر بھی حضرت خضر رہا کرتے تھے۔

۵۔ الٰہ آباد کے دونوں دریا غالباً خود اپنی فضیلت کی روایتوں کی بنا پر متبرک ہیں اور ان کا ہر حصہ جو کسی سرزمین سے گذرتا ہو متبرک ہے لیکن سنگم کا حصہ تو سرسوتی ہی کے باعث زیادہ متبرک ہے

---

[1] ترجمہ قرآن از عبداللہ یوسف علی صفحہ ۷۴۳ حاشیہ ۲۴۰۵

موسیٰ و خضر کے دونوں دریا (خلیج عقبہ و خلیج سویز) بھی اپنی پڑوسی قوموں کی نظروں میں یقیناً اسی طرح متبرک اور روایات سے افضل ہوں گے جیسے یہاں کے دریا لیکن ان کا سنگم اس تیسرے چشمہ کے باعث بہت ہی زیادہ قابلِ ذکر ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ کوئی قوم اپنے مذہب کی معتدل اور مستحکم تعلیمات کے باعث عجائب پسندی ہی کے درجہ میں رہ گئی اور حدود سے آگے بڑھ کر عجائب پرست نہیں بن گئی ورنہ موسیٰؑ کی جیسی عظیم شخصیت، خضرؑ جیسے پُراسرار اور حیرت آفریں بزرگ کے جہاں قدم جائیں اور وہ بھی علم جیسے متبرک گوہر کی تلاش میں اس جگہ کے مقدس ہونے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے وہ جگہ متبرک کیوں نہ ہوتی جب

اس جگہ کو بعض مفسرین کرام نے موسیٰؑ و خضرؑ کے یک جائی کے ساتھ ساتھ علم تشریح (احکام) اور علم تکوین (اسرار) کا بھی سنگم کہا ہے، وہ حضرت موسیٰؑ کو شریعت و احکام کا نمایندہ اور حضرت خضرؑ کو تکوین و اسرار کا نمایندہ مان کر فرماتے ہیں کہ بعض لوگ جو شریعت کو اسرار سے الگ مانتے ہیں، یہ غلط ہے دیکھو دونوں ایک جگہ جمع ہوئے کچھ دنوں ساتھ رہے اسی طرح علم تشریع و تکوین بھی جمع ہوئے اور ہو سکتے ہیں اور ساتھ بھی رہ سکتے ہیں مگر آگے چل کر دونوں کا الگ ہونا ضروری ہو جاتا ہے ورنہ دنیا کا نظام قایم نہ رہے۔ مثلاً خضرؑ نے ایک لڑکے کو خدا کے حکم سے اسرارِ خدا پر مطلع ہو کر قتل کر دیا پھر اس کی وجہ بتلائی کہ یہ بڑا ہو کر بڑا خبیث بد باطن ہوتا، دوسروں کو گمراہ کرتا، غور کیجئے اگر وہ بڑا ہو جانے پاتا اور اپنی بد باطنی ظاہر کرنے پاتا تو کیا وہی حضرت موسیٰ جنہوں نے اس کے قتل پر تو حضرت خضرؑ پر اعتراض جڑ دیا تھا اس بد باطن کو قتل نہ کر دیتے پس معلوم ہوا کہ علم تکوین و اسرار دراصل علمِ تشریع و احکام سے الگ تو نہیں ہے ہیں دونوں ایک ہی چیز مگر فرق کچھ ظہور و خفا کا ہے۔ شریعت اور احکام اس وقت کسی کی جان لیں گے یا کسی معاملہ میں مداخلت کریں گے جب کوئی برائی ظہور کرے گی۔ علم تکوین و اسرار اس کا انتظار نہیں کرتا وہ [illegible] ([illegible]) کا قائل ہے، ہیں دونوں علمِ صحیح اور علمِ عظیم البتہ ایک عقل و برہان کے مطابق اور دوسرا عقل و برہان سے بالا۔

۲- وہ ایک طرح سے حضرت خضرؑ کی مستقل جائے قیام سی بن گئی تھی چنانچہ ان کے پتہ میں وہی جگہ بتائی گئی تھی [اور اسی جگہ سے یہ بات عین مطابقِ قیاس اور قرینِ عقل سی معلوم ہوتی ہے کہ حضرت خضر نے بھی یقیناً اسی سنگم کے اسی چشمۂ آبِ حیات ہی سے لے کر پانی پی لیا تھا وہ کوئی دوسرا چشمہ نہیں تھا]

(۴)

اس حیرت انگیز توافق کو معلوم کر لینے کے بعد بھی - سچ پوچھئے تو - ذہن کچھ خلا سا کچھ تشنگی سی محسوس کرتا ہے یعنی یہ کہ "کاش کسی طرح ان دونوں متوافق سنگموں کے تقدس و تبرک کی تاریخ برسوں اور سنوں میں یا صدیوں میں بھی معلوم ہوتی تاکہ دو باتوں کا فیصلہ کرنا ممکن ہوتا۔

(الف) ان دونوں کے تقدس و تبرک میں کون زیادہ پرانا اور تاریخ میں مقدم ہے

(ب) آیا یہ توافق محض اتفاقی ہے (کہ اس کے بھی نظائر و امثال اس عجائب خانہ عالم میں کم نہیں ہیں) یا اس معاملہ میں بھی کوئی ایک قوم دوسری سے کچھ متاثر ہوئی ہے (کہ اس کے بھی نظائر و امثال تاریخ کے نمایش گھر میں کثرت سے ہیں"

تاریخ مشائخ چشت

یہ سلسلۂ چشت کے صوفیائے کرام اور مشائخ عظام کی نہایت مستند اور محققانہ تاریخ ہے - اردو زبان میں صوفیہ کا یہ پہلا تذکرہ ہے جس میں امت کے ان پیشواؤں کے مقصدِ حیات، نظام اصلاح و تربیت اور طریقۂ تبلیغ حق پر نہایت مدلل اور سیر حاصل بحث کی گئی ہے صرف مقدمہ ۳۰۰ صفحات پر مشتمل ہے جو ہر اعتبار سے تلاش و تحقیق کا شاہکار ہے -

کتاب ہر حیثیت سے لائق مطالعہ ہے اس کی اشاعت سے ہندوستان کے مشائخ چشت کے حالات کی تحقیق کا ایک نیا باب کھل گیا ہے۔ صفحات ۸۱۸، بڑی تقطیع کتابت، طباعت، کاغذ نہایت اعلیٰ قیمت بارہ روپے (عہ)، مجلد تیرہ روپے (عہ)

کیا مسلمانوں کو اپنی موجودہ حالت کا کچھ علم ہے

(از)

(جناب مولانا محمد عبدالرحمٰن خاں صاحب صدر حیدرآباد اکاڈمی)

گذشتہ ساڑھے تیرہ سو سال تک حضرت محمد مصطفی صلعم اور خلفائے راشدین کے فیوض و برکات سے مسلمانوں کو جو فائدے پہنچے ایسی مستحکم بنیادوں پر قائم تھے کہ باوجود شدید اندرونی اختلافات اور مسلسل بیرونی مخالفتوں کے دولِ اسلام کو نہ صرف ان سے کوئی ناقابلِ تلافی ضرر نہیں پہنچا بلکہ عرصۂ دراز تک وہ سیاسی و ثقافتی میدانوں میں آگے ہی بڑھتے گئے۔ مسلم علم و ہنر چودھویں صدی عیسوی کے پہلے نصف دور میں معراجِ کمال کو پہنچ گیا جب کہ دوسری قوم یا ملت کے لوگ ان کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے تھے۔ تیرھویں صدی عیسوی کے ختم تک بھی مسلمان اپنے بلند مقام پر قائم رہے۔ اس کے بعد ممالکِ مغرب کے اقوام جو قبل ازیں مسلمان حکماء کے ہر شعبہ میں خوشہ چین تھے آہستہ آہستہ ان کے ہم پلہ ہونے لگے۔ پندرھویں صدی کے ختم تک میدانِ علم و ہنر میں مسلمانوں پر سبقت لے گئے اور مسلمان بالکلیہ پستی کی حالت میں گر گئے اگرچہ کبھی کبھی کچھ دنوں ترقی کی راہ پر واپس آنے کی کوشش کرتے رہے۔

چودھویں صدی عیسوی تک باوجود بعض بڑی شکستوں کے مسلمانوں کی سیاسی قوت ممالکِ مشرق میں عملاً برقرار رہی۔ البتہ ۱۲۵۸ء تاتاریوں میں دولت بغداد کا قلع قمع کر دیا اور اسپین کے عیسائیوں نے غرناطہ کی باقی ماندہ علم پرور ریاست کو بھی ۱۴۹۲ء میں نیست و نابود کر دیا۔ اس طرح عرب ثقافت دنیا سے بالکلیہ اٹھ گئی۔ مگر ۱۴۵۳ء میں عثمانی ترکوں نے قسطنطنیہ کو فتح کر کے مسلم مگر غیر عرب سیاسی اقتدار کو پھر سے فروغ دیا اور مشرقی یورپ کے بیشتر عیسائی علاقے ان کے مطیع و فرماں بردار بن گئے۔ یہ کامیابی صرف میدانِ جنگ تک محدود رہی۔ علمی دنیا میں ترک اپنے پیشرو عربوں کا کھویا ہوا وقار حاصل نہ کر سکے۔

سلطان سلیمان اعظم کے عہدِ حکومت میں ترکی عمل داری اور سیاسی اقتدار اعلیٰ معراجِ کمال کو پہنچ گیا۔ بحر و بر پر ترکوں کا کوئی مدِ مقابل نہ تھا۔ اس کے بعد وہ میدانِ سیاست میں بھی مسلسل زوال ہی کے راستہ پر اتر آئے۔

زمانۂ حال میں ترکی اور مصر ہی ایسے مسلّم دول تصور کئے جا سکتے ہیں جو بیرونی اقوام کے مقابلہ میں سنبھلنے کی سکت رکھتے ہیں۔ ان کی مالی و اقتصادی حالت بھی کسی قدر مضبوط سمجھی جا سکتی ہے۔ مصر کی جامعات علمی و اعلیٰ تحقیقاتی کاموں میں یورپ و امریکہ کی جامعات سے کچھ بہت کمتر نہیں ہیں۔ وہاں ان دنوں چند قابل عالم و فاضل نہ صرف ادب و تاریخ میں بلکہ جدید سائنس و ریاضی میں بھی نمایاں کام کرتے نظر آرہے ہیں۔ ترکی بدقسمتی سے عیسائی یورپ کے دستِ تظلّم اور آفتہائے آسمانی (مثل زلزلوں وغیرہ) کی وجہ سے ہنوز اچھی طرح سنبھل نہیں سکا۔ پاکستان کو جو اسلامی ریاستوں کا سب سے جدید اور نوخیز خطہ ہے۔ ہندوستان کی مغل بادشاہت کا کامیاب جانشین بننے کے لئے ابھی بڑی کٹھن منزلوں سے گزرنا ہے تاکہ کامل اقتدار حاصل کرلے۔ دوسری مسلم ریاستیں سخت مصائب میں گرفتار ہیں اور عیسائی اور دیگر غیر مسلم اقوام کے دستِ تظلّم سے جاں بلب ہو رہی ہیں۔ کئی ایک تو بالکلیہ کالعدم ہو گئیں۔ باقی ماندہ اپنے اندرونی تنازع و مناقشوں سے ختم ہونے کو ہیں یا طاقت ور حریص اقوام کی قیادت میں پڑ کر ختم ہو رہی ہیں۔

دورِ حاضر کے مسلم اقوام کی خصوصیات میں خواہ کچھ بھی اختلافات ہوں مندرجہ ذیل خصوصیات ان سبھوں میں عام اور مشترک پائی جاتی ہیں۔ اپنی حقیقی حالت سے لاعلمی، مذہب سے بے اعتنائی، تعلیم کا فقدان، ذی اثر طبقات کا اتحادِ عمل سے انحراف، مالی حالت کی انتہائی پستی، صنعت و حرفت سے بالکلیہ ناواقفیت، تاوقتیکہ یہ تمام عیوب مسلمانوں سے دور نہ ہوں ان کا دنیا میں امن کے ساتھ باعزت زندگی بسر کرنا ناممکن ہو چلا ہے۔ ان تمام برائیوں کی اصل وجہ اللہ تعالیٰ کے احکام سے دیدہ و دانستہ نافرمانی ہے جو قرآن پاک میں بہ وضاحت بیان ہوئے ہیں اور جن کی احادیثِ نبوی سے توضیح ہوئی ہے۔ سب سے پہلی بڑی بلا جو مسلمانوں پر نازل ہوئی خلیفہ دوم حضرت عمر فاروقؓ کا قتل ہے

جو دشمنانِ دین کی ایک گہری سازش کا نتیجہ تھی۔ اس کے بعد حضرات عثمانؓ و علیؓ کا وحشیانہ قتل پھر آنحضرتؐ کے بے گناہ نواسوں حضرات حسنؓ حسینؓ کا بے رحمانہ قتل ہے۔ ان بہیمانہ مظالم کی وجہ سے مسلمانوں کی حکومت کو ناقابل تلافی نقصان پہنچے۔

جس وقت مسلمان عربوں نے فلسطین شام اور مصر کو فتح کیا ان ممالک کے عیسائی باشندوں نے ان کے ساتھ وفاشعارانہ برتاؤ کیا۔ کامل اطاعت کے بعد ان سے بغاوت نہیں کی لیکن افسوس کہ مفتوح ایران باوجود دینِ اسلام قبول کرنے کے عربوں کے ساتھ برسرِ عناد ہی رہا۔ خلافت کا مسئلہ ابتداً سیاسی شکل میں پیدا ہوا آگے چل کر مذہبی صورت اختیار کرلی جس کی وجہ سے مسلمانوں کا خون پانی کی طرح بہا اب بھی یہ اختلاف باقی ہے۔ سنی شیعہ کا جھگڑا حقیقی خلافت کے ختم ہوجانے اور ترکی سلطانوں کی نام نہاد خلافت کے مٹ جانے پر بھی رفع نہ ہوسکا۔

اگر اس المناک اختلاف کے اسباب وحالات پر خلوص وصداقت کو پیشِ نظر رکھ کر اسلامی وحدت واتفاق کی خاطر حسنِ اخلاق ومصالحت کے طریقہ سے عمل کیا جائے تو کیا عجب کہ مسلمانوں کی اس عالم گیر پستی کے دور میں فرقہ واریت کا یہ تشدد بتدریج رفع ہوجائے اہلِ سنت والجماعت کے عقائد میں اتنے اختلافات نہیں ہیں جتنے اہل التشیع کے فرقوں میں پائے جاتے ہیں۔ اگر خلوص سے کام لیا جائے تو بہت ممکن ہے کہ یہ سب اختلافات حرفِ غلط کی طرح مٹ جائیں۔ خوجوں کے سرگروہ ہز ہائنس آغا خاں نے بھی اخبارات میں کبھی اس قسم کے خیالات ظاہر کئے ہیں۔

عیسائی مذہب کے رومن کیتھولک فرقوں میں اعتقادی اختلافات زمانہ دراز سے بکثرت چلے آرہے ہیں۔ مختلف دوروں میں متعدد پاپایانِ روم نے ان کو رفع کرنے کی کوشش کی لیکن افسوس کہ بجائے اختلافات دور ہونے کے مجالس شوریٰ کے انعقاد کے بعد ایک نیا عقیدہ ہی رونما ہوا۔ اسلامی مجالس کے لیڈروں کو چاہیئے کہ اپنے مشوروں میں یہ خرابی پیدا نہ ہونے دیں۔

غور سے دیکھنے سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غیر مذاہب کے مستشرقین کی نظر اسلام کی سب سے اہم تعلیم (خدا کی وحدت اور بنی نوع انسان کی اخوت) سے اکثر اوجھل ہی رہی ہے

ہمیں چاہئے کہ دنیا کو بتائیں کہ اسلام نے دین کے ساتھ دنیا میں معقولیت کی زندگی بسر کرنے کے کیسے اچھے اور آسان طریقے بتائے۔ تمام بنی نوعِ انسان کی مادی ترقی، حسنِ نیت اور جود و سخا کے اعمال کے ذریعہ دوستوں کے ساتھ دوستی اور دشمنوں کے ساتھ انصاف بلکہ رعایت کے بھی کیسے مفید سبق سکھائے۔

ہم یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ دورِ حاضر کے نام نہاد اعلیٰ تہذیب کے علم بردار اقوام جو اپنے آپ کو عدل و انصاف کے حامی اور جمہوری اصول کے ناشر بتلاتے ہیں اب تک دنیا کے سامنے کوئی طریقہ زندگی پیش نہ کر سکے جس میں امنِ عامہ اور ساتھ ہی انفرادی آزادی کا ایسا تیقّن ہو سکے جیسا آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین کے عہد میں ہوا تھا۔ اگر آمریت کی مذمت کی جاتی ہے تو کیا اقلیتوں پر اکثریت کے مظالم نہیں دیکھے جا رہے ہیں۔ اپنے آپ کو اعلیٰ قسم کا انسان تصور کرنے دوسروں کو ذلیل بنا کر اقتصادی ذرائع سے بلکہ بعض اوقات بزورِ شمشیر و جوہری بمب نیست و نابود نہیں کیا جا رہا ہے؟

تاریخ شاہد ہے کہ نہ صرف زمانہ قدیم میں بلکہ نسبتاً جدید ادوار میں بھی طاقتور قوموں نے زیادہ مہلک آلاتِ حرب اور منظم طریقوں سے غریب و بیکس کم ترقی یافتہ انسانوں کو یا تو صفحہ ہستی سے میٹ دیا یا ان کے ملکوں پر قبضہ کر کے ان کو غلاموں سے بدتر بنا رکھا۔ اور با ایں ہمہ ظلم و تشدّد عوام کے فلاح و بہبود کے لئے عوام کی حکومت کے قواعد کے اعلان شائع کئے۔ ایسے واقعات اسلام کی تاریخ میں کبھی پیش نہیں آئے۔ اسلام کے بزورِ شمشیر پھیلائے جانے کے جھوٹے قصے اب ختم ہوتے آ رہے ہیں غیر مذاہب کے بعض جدید روشن خیال صداقت پسند مؤرخ اب معترف ہیں کہ اسلام اس کی سچائی، انصاف اور انسانی ہمدردی ہی کی وجہ سے دنیا کے قدیم و جدید باشندوں میں پھیلا اور پھیلتا جا رہا ہے اگرچہ مسلمانوں کا موجودہ افلاس ان کو تبلیغِ مذہب کے کاموں میں خاطر خواہ کامیابی حاصل کرنے سے روک رہا ہے۔ ان امور کی آرنولڈ کی "دعوت اسلام" میں بخوبی توضیح کی گئی ہے۔ وہ مانتا ہے کہ اسلام نے سابق مسلمانوں کی پاک زندگی سچائی اور رواداری ہی کی وجہ سے سمجھ دار غیر مسلم لوگوں کے

دلوں پر اثر کیا اور وہ خود بطیبِ خاطر برکات اسلام سے استفادہ کرنے کی خاطر مسلمان ہوئے۔

زمانۂ قریب میں اسلام کی اشاعت ہندوستان اور دیگر مشرق بعید کے ممالک میں بعض اولیائے کرام اور صوفی منش پارساؤں کے اثر سے ہوئی۔ انیسویں اور بیسویں صدی عیسوی میں اسلام یورپ و امریکہ کے تعلیم یافتہ صداقت پسند خوش حال لوگوں (مردوں اور عورتوں دونوں) میں سرایت کرتا جارہا ہے۔ اس کارِ خیر کو ترقی دینے کے لئے ضرورت ہے کہ مختلف ممالک میں اعلیٰ تعلیم یافتہ، پُرخلوص متدین، ریاضت کیش مبلغوں کے مراکز قائم کئے جائیں اور کم استطاعت نومسلموں کی مذہبی تعلیم کے ساتھ معاشی تعلیم کا بھی انتظام کیا جائے جیسا کہ اکثر عیسائی ادارے کرتے آرہے ہیں۔ حالیہ تہذیب کی کوششیں صرف مادی ترقی تک محدود ہیں، زندگی کے روحانی پہلو کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے باوجود اس عقیدے کے کہ "زندگی کا اصل مقصد حصولِ راحت و آسائش ہے" حقیقی امن و راحت سے دور ہٹتے جارہے ہیں۔ اگرچہ قوائے فطرت پر آئے دن روز افزوں دسترس حاصل کیا جارہا ہے اور علم و حکمت کو ترقی ہورہی ہے۔

دورِ حاضر کے متعدد غیر مسلم عالموں نے بھی اسلام کی حقیقی خوبیوں اور اس کے دور رس فوائد کی سچے دل سے داد دی ہے اگرچہ چند ایک نے ان میں سے ہمارے پیغمبر خدا حضرت محمد صلعم سے اپنی ناقص معلومات یا اندھے سیاسی تعصب کی وجہ سے بعض اوقات گستاخی اور بے ادبی بھی کی ہے۔

دشمنانِ اسلام کے اس افتراہی کی وجہ سے کہ مسلمانوں نے اسلام بزور شمشیر پھیلایا قرون وسطیٰ کے مسلمانوں کو بارہا کفار سے سخت نقصانات اٹھانے پڑے۔ لاکھوں بے گناہ مسلم زن و مرد اور بچے بچیاں وحشی تاتاریوں اور سنگ دل صلیبی جنگجویوں کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ لیکن ان بلاؤں کے باوجود مسلمان اپنے ایمان کی استقامت اور مستقل مزاجی کی بدولت پھر سے اپنا کھویا ہوا ملک اور اعلیٰ اقتدار حاصل کرتے رہے۔ عربوں کے بعد جواں ہمت نو مسلم اقوام مثل کُرد ترک و ترکمان نے مسلمانوں کی سابقہ عظمت کو برقرار رکھا۔ صلیبی خونخوار فلسطین کو مسلمانوں سے چھین لینا چاہتے تھے۔ دو سو برس کی مسلسل کوششوں کے بعد بھی وہ بالکلیہ ناکامیاب رہے،

زمانہ حال میں یہودی لوگ صلیبیوں کی طرح مسلمانوں سے برسرِ پرخاش ہیں۔ گو فوجی نقطۂ نظر سے ان کی کوئی وقعت نہیں ہے لیکن ان کی صدیوں کی دولت اور دُوَلِ اعظم کا ان کے ساتھ کھلا یا پوشیدہ مربیانہ سلوک ان کو مسلمانوں کے خلاف کامیاب کرا رہا ہے۔

بدقسمتی سے اب مسلمانوں میں پہلے کی طرح کوئی بہادر اور اولوالعزم نوجوان قومیں نہیں ہیں۔ عثمانی ترک دُوَلِ یورپ کی متفقہ و مسلسل مخالفت سے اس قابل نہ رہے کہ کسی دوسری مسلم قوم کی مدد کر سکیں، علاوہ ازیں موجودہ دور میں ان کی ذہنیت خود ایسی بدل گئی ہے کہ انہوں نے مذہب کو پس پردہ ڈال رکھا ہے اور اگر اخباری اطلاعیں صحیح ہیں تو ان کے "روشن خیال" افراد دین اسلام کے مارٹن لوتھر (Martin Luther) جیسے رفارمر (Reformer) کا انتظار کر رہے ہیں۔ چین اور انڈونیشیا کے مسلمانوں کو سنبھلنے کے لئے ہنوز بڑی کٹھن منزلیں طے کرنی ہیں۔ پاکستان اگر اپنے آپ کو اپنی اندرونی غداریوں سے بچا لے تو یہ خود ایک بڑی کامیابی ہوگی۔ روس کے بدنصیب مسلمان بولشیوک (Bolshevism) بے دینی کے پنجوں میں ایسے گرفتار ہیں کہ اسلامی طریقۂ زندگی ان کے لئے تقریباً ناممکن بنا دیا گیا ہے۔ دوسرے مسلمانوں کی وہ کیا خاک مدد کر سکیں گے۔

زمانۂ حال کی سائنٹیفک تحقیقات کو کامیاب طریقہ پر جاری رکھنے کے لئے بڑی کثیر رقموں کی ضرورت ہے اس لئے سائنس والوں کو سرمایہ داروں کا دست نگر رہنا پڑتا ہے۔ کیا اچھا ہوتا کہ جس طرح طب کے طالب علموں کو اپنا فن سیکھنے سے پہلے بقراطی قسم کھانی پڑتی ہے کہ "کبھی علم کا ناجائز استعمال نہیں کریں گے"، اعلیٰ سائنس سیکھنے والوں کو بھی اس کے مماثل قسم کھانے پر مجبور کیا جاتا تاکہ جدید آلاتِ سائنس سے بے گناہ امن پسند انسان لاکھوں کی تعداد میں ایک وقت موت کے گھاٹ نہ اتار دیئے جائیں۔

لیکن تاوقتیکہ انسانوں کے دل میں اللہ تعالیٰ کا خوف نہ ہو اور وہ ایک دوسرے کو اپنا بھائی نہ سمجھیں سائنس کا بُرے کاموں میں استعمال نہ کیا جانا ناممکن ہی نظر آتا ہے۔

اشتراکیت دولت چھپٹنے کی فکر میں لگی ہے سرمایہ داری دولت کے گھمنڈ میں مست و مخمور ہے دونوں ایک دوسرے سے جنگ کر کے امن عالم کو ختم کرنے کی دھن میں لگے ہوئے ہیں۔ اس کشمکش

میں کیا عجب کہ ایک تیسری عالمگیر جنگ چھڑ جائے جس میں بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ مہلک ترین آلاتِ حرب یعنے جوہری بم (جس کے انبار امریکہ و روس کے پاس جمع ہیں) دل کھول کر استعمال کئے جائیں گے جس کی وجہ سے اندیشہ ہے کہ بنی نوعِ انسان ہمیشہ کے لیے دنیا سے اُٹھ جائے۔ کہا جاتا ہے کہ سیاسوں کا ایک طبقہ ایسا بھی ہے جو انسان کی تیز رفتار تولید اور غذائی پیداوار کی قلت سے ڈر کر ایسی بلاؤں کو بُرا نہیں سمجھتا کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کیا جدید سائنس سے دنیا کی غذائی صورتِ حال کو درست نہیں کیا جا سکتا؟ ان تمام بیماریوں کا واحد علاج خوفِ خدا اور انسانی ہمدردی ہے، اسلام حق تعالیٰ کا برگزیدہ دین ہے رحم و کرم کا حامی اور مانعِ شر و فساد۔ پس تمام دنیا کے مسلمانوں کو چاہئے کہ حقیقی مسلمان بن جائیں۔ اور آنحضرت صلعم اور خلفائے راشدین کے مبارک عہد کے مسلمانوں کی طرح زندگی اختیار کریں تمام اندرونی جھگڑوں سے پاک ہو جائیں اعلیٰ تعلیم کے ساتھ صنعت و حرفت کے مالک بن کر اپنے اسلاف کی طرح آگے قدم بڑھائیں ہماری آنکھوں کے سامنے صدیوں کے پست افتادہ و مصیبت زدہ اقوام اپنے عزم و استقلال سے حیرت انگیز ترقی کر رہی ہیں پس کیا وجہ کہ مسلمان ایسا نہ کریں؟

اسلام نہ اشتراکیت کا طرفدار ہے نہ سرمایہ داری کا۔ زکوٰۃ کی رقم اگر پابندی سے بیت المال میں جمع کی جائے اور مستحق کم استطاعت لوگوں کے فلاح و بہبود کے لئے (جیسا کہ احکام شرع کے مطابق چاہیئے) خرچ کی جائے تو مسلمانوں کو پیسوں کی قلت کبھی محسوس نہ ہوگی۔ چودھویں صدی عیسوی تک بھی بے شمار مسلمان ادارے زکوٰۃ کی مجتمعہ رقوم سے فائدہ اُٹھاتے رہے۔ مثال کے طور پر تحفۃ النظار کے چند واقعات کی یاد تازہ کرائی جاتی ہے ابن بطوطہ شمال مغربی افریقہ سے جیب خالی نکل کر مشرق میں قنجنفو (چین کا اس وقت کا مرکزی شہر) پہنچا اور وہاں اسلامی اداروں میں ذی عزت مہمان کی حیثیت سے ٹھیرا۔ وہاں کے ایک مرفہ الحال نوجوان تاجر قوام الدین البشری سے ملاقات کی اس نے ابن بطوطہ کو اپنے بھائی ابو محمد البشری سے سجلماسہ (جنوب کوہ اطلس مغربی افریقہ) میں ملنے کے لئے کہا۔ یہ بلند ہمت سیاح چین سے واپس ہوتے ہوئے سجلماسہ پہنچا اور ابو محمد البشری کو اس کے بھائی کا پیغام پہنچایا۔ اس کو ایک روشن

خیال عالم پایا۔ یہ سب انتظامات مسلم ادارے زکوٰۃ ہی کے پیسوں سے کر سکتے تھے۔ کیا اس زمانہ میں دخانی اور ہوائی جہاز ریل اور ریڈیو کے دور میں مسلمان اپنے دور افتادہ بھائیوں کے ساتھ ربط و اتحاد قایم نہیں کر سکتے؟

جو مردہ قومیں از سرِ نو زندہ ہو رہی ہیں پہلے اپنی حالت سے بخوبی واقف ہو کر اپنے تعلیمی و معاشی نقائص عزم و استقلال سے دور کر رہی ہیں۔ اس کی سب سے نمایاں مثال یہودیوں کی ہے۔ ہمارے پارسی اور ہندو بھائی بھی ایسی ہی کوششوں سے آگے بڑھ رہے ہیں۔ باہمی ہمدردی اعلیٰ تربیت اور سچا اتحادِ عمل ہی انھیں کامیاب بنا رہا ہے۔ روئے زمین کے مسلمانوں کو چاہئے متحد ہو کر تکسیبِ کمال کے ذریعہ ایک دوسرے کے ساتھ اچھے روابط قایم کریں۔ عربی، فارسی اور اردو زبان میں مہارت حاصل کریں۔ انگریزی، فرانسیسی اور جرمن زبانوں سے واقف ہو جائیں، حج کے موقعوں سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ اسلامی دنیا کے معاشی مسائل پر غور کریں۔ علمی و اقتصادی کانفرنسوں میں شریک ہو کر ایک دوسرے کا ہاتھ بٹانے کی کوشش کریں ماہرانِ سائنس اور سرمایہ داروں کے اشتراکِ عمل سے نہ صرف اپنے آپ کو بلکہ تمام دنیا کے باشندوں کو امن و محبت کی زندگی بسر کرنا سکھائیں۔

حالاتِ حاضرہ

وقت کا ایک اہم مسئلہ

از

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد ایڈیٹر جدوجہد)

گذشتہ دو ماہ سے دنیا میں جو واقعات پیش آتے رہے ہیں اگرچہ ان میں سے اہلِ مراقش کی جدوجہدِ آزادی، اہلِ ٹیونس کی قومی تحریک کی ایک بڑی حد تک کامیابی، نہر سویز کے مسئلہ پر مصر اور برطانیہ کے حالیہ معاہدہ کا ردِ عمل اور مستقبل میں مصر اور امریکہ کے تعلقات کی نوعیت ہند چینی میں خاتمۂ جنگ، فرانس کی جانب سے "یوروپین ڈیفنس کمیونٹی" میں شرکت سے انکار "سیاٹو" کا قیام، ہندوستان میں انڈونیشیا کے وزیر اعظم، ڈاکٹر علی ستروامی جوجو کی آمد اور "قاہرہ سے منیلا تک علاقۂ امن کو وسعت دینے کے لئے" ایشیا اور افریقہ کے ممالک کی ایک کانفرنس، منعقد کرنے کی تجویز اور پنڈت نہرو کا عزمِ سفرِ چین ایسے واقعات ہیں جنہیں بین اقوامی زاویۂ نظر سے اہم قرار دیا جاسکتا ہے لیکن ان واقعات کے ساتھ ساتھ خود ہمارے وطن ہندوستان میں بھی کچھ ایسے واقعات رونما ہوئے ہیں جو ملک کی ترقی اور تعمیر کے ہر خواہش مند کے لئے عموماً اور ہندوستانی مسلمانوں کے لئے خصوصاً دعوتِ فکر و نظر کی حیثیت رکھتے ہیں اور اسی لئے ہمیں بین اقوامی معاملات و مسائل کی بجائے ملک کے ان مسائل پر غور کرنا چاہیے جو براہِ راست ہماری زندگی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں۔

یہ امر محتاجِ بیان نہیں کہ اگست کے صرف ستائیس دنوں میں یو۔پی اور حیدرآباد ایسی دو ریاستوں میں تیرہ فسادات برپا ہوئے ہیں اور اگر ان فسادات کی تباہ کاری کی تفاصیل کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تو ستائیس دن کی مدت میں تیرہ فسادات کا برپا ہونا بجائے

خود ایک ایسا دل دوز اور روح فرسا واقعہ ہے جو دنیا کی ناقص ترین جمہوریت کے اربابِ بست و کشاد کے سروں کو بھی شرم اور ندامت سے جھکا دینے کے لئے کافی ہے اور جہاں تک جمہوریہ ہند کا تعلق ہے اس کے دامن پر تو یہ مسلسل فسادات ایک ایسے سیاہ داغ کی حیثیت رکھتے ہیں جنہیں آسانی کے ساتھ دھو ڈالنا ممکن نہیں ہو سکتا۔ ۱۹۴۷ء میں جو المناک واقعات پیش آئے تھے ان کی نوعیت کو کسی نہ کسی حد تک ہنگامی قرار دے کر انھیں نظر انداز کیا جا سکتا ہے لیکن حالیہ فسادات کے اسباب و علل پر سرسری نظر ڈالنے کے بعد ہی یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انھیں کسی وقتی تحریک یا مقامی حالات کا نتیجہ قرار دینا خود اپنی عقل و بصیرت کو فریب میں مبتلا کرنے کے مترادف ہو گا اور معاملہ کا یہی وہ پہلو ہے جس نے ان ہنگاموں کے مسئلہ کو زیادہ نازک اور زیادہ قابلِ توجہ بنا دیا ہے۔

ہمیں اس حقیقت کے اعتراف سے مسرت محسوس ہونی چاہئے کہ تقسیم ہند کے بعد بھی ہندوستان میں جو کروڑوں مسلمان آباد ہیں اگرچہ ان کے قیام اور تحفظ میں ہندوستان کے دستور اور اس ملک کی حکومت کی خیر سگالانہ حکمت عملی کو بھی دخل ضرور حاصل ہے لیکن اس معاملہ میں ہم اکثریت کے ان فراخ دل، غیر متعصب اور نیک نہاد عناصر کو بھی نظر انداز نہیں کر سکتے جو ہندوستان کو اپنی ہی طرح مسلمانوں کا وطن بھی سمجھتے اور اس ملک میں ان کے مساوی شہری حقوق کو تسلیم کرتے ہیں اور میرا پختہ عقیدہ یہ ہے کہ اگر اکثریت میں یہ حق پسند طبقہ موجود نہ ہوتا تو پھر اس ملک کا موجودہ دستور اور اس ملک کی موجودہ حکومت بھی مسلمانوں کو ہندوستان میں موجود اور مقیم رکھنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تھی' اس صورتِ حال کے پیشِ نظر قدرتی طور پر یہ نتیجہ برآمد ہوتا ہے کہ ـــــ جمہوری ممالک کے کسی مسئلہ کو بھی محض حکومتیں حل نہیں کر سکتیں بلکہ یہ مسائل حکومت اور عوام کے اشتراکِ عمل ہی سے حل ہو سکتے ہیں اور ہندوستانی قوم میں ابھی ایسے افراد اور عناصر موجود ہیں جو ان مسائل کو حل کرانے میں نہ صرف مسلمانوں کی امداد ہی کرتے رہے ہیں . . . .

. . . . بلکہ مستقبل میں بھی ان کی ہر ممکن امداد اور اعانت کرنے

پر آمادہ ہیں۔۔۔۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ جمہوریت کا بنیادی تقاضہ یہ بھی ہے کہ جس طبقہ یا فرقہ کو اپنے حقوق غیر محفوظ نظر آئیں پہلے وہ خود ان کے تحفظ پر آمادہ اور کمربستہ ہو کیوں کہ مغرب کی ناقص جمہوریت ایسے معاملات میں بذاتِ خود اصلاحِ حالات کی کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتی۔

ان سطور میں جہاں میں گذشتہ ہنگاموں کی تباہ کاریوں کے اعداد و شمار پیش کرنا نہیں چاہتا وہیں ان کے اسباب و علل پر بحث کرنا بھی بے کار سمجھتا ہوں لیکن ان باتوں کو نظرانداز کر دینے کے باوجود یہ شرمناک حقیقت اپنی جگہ قایم رہتی ہے کہ ہندوستان میں برابر فسادات ہوتے رہتے ہیں اور اگست میں برپا ہونے والے فسادات کے پیش نظر یہ شبہ بھی ہونے لگا ہے کہ اگر حکومت ان ہنگاموں کو نظرانداز نہیں بھی کرنا چاہتی تب بھی وہ ان کا سدباب کرنے سے قاصر ضرور ہے اور اس شبہ کے ساتھ ساتھ یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ آج جب کہ ہندیونین کی عنانِ قیادت پنڈت جواہر لال ایسے کشادہ دل اور روشن دماغ رہنما کے ہاتھوں میں ہے اور ملک کی وزارتِ عظمیٰ اور کانگریس کی صدارت ایسے عظیم مناصب پر بھی وہ خود ہی فائز ہیں اگر ملک کا وہ بنیادی مسئلہ بھی طے نہیں ہو سکتا جسے طے کرنے کے لئے ملک کی تقسیم کی غیر دانشمندانہ تجویز کو قبول کیا گیا تھا تو پھر مسلمانوں اور اکثریت کے ان عناصر کو جو اس ملک میں رہنے والے مسلمانوں کو آبرومندانہ اور بےخوف زندگی بسر کرتے ہوئے دیکھنا چاہتے ہیں دیانت داری اور سنجیدگی کے ساتھ اس بات پر غور کرنا پڑے گا کہ اس نیک مقصد کے حصول کے لئے انھیں کیا کرنا چاہیئے اور اس راہ میں پہلا قدم ان مسلمانوں ہی کو اٹھانا چاہیئے گا جن کا دامن تعصب اور تنگ نظری کے داغوں سے پاک رہا ہے اور جو ہر حال میں ہندوستان کو اپنا وطن سمجھتے رہے ہیں۔

اس بات کو اچھی طرح ذہن نشین کر لینا چاہئے کہ سوال صرف فسادات سے نجات حاصل کرنے ہی کا نہیں بلکہ مستقبل میں آبرومندانہ زندگی بسر کرنے کا ہے۔ کیوں کہ گذشتہ سات سال کے حالات نے اس بات کو واضح کر دیا ہے کہ اس ملک کا شہری اور دستورِ ہند کی رو سے مساوی، شہری، اقتصادی، معاشرتی اور سیاسی حقوق کا مستحق ہونے کے باوجود ہندوستانی مسلمان پر

آبرو مندانہ زندگی بسر کرنے کی راہیں مسدود ہی ہوتی چلی جارہی ہیں اور اگر اس نے خود ان راہوں کو کشادہ کرنے کی کوشش نہ کی اور اپنے اہلِ وطن کے بالغ نظر عناصر کو اس کام میں اپنے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کرنے کی دعوت نہ دی تو رفتہ رفتہ اس پر زندگی کے تمام دروازے بند ہو جائیں گے۔ پھر یہاں اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کر دینا چاہئے کہ قوموں کے مسائل جذبات کے تحت اور جذباتی ماحول میں حل نہیں ہوا کرتے اور انھیں حل کرنے کے لئے صبر، استقلال اور تدبّر و اعتدالِ ذہن درکار ہوتا ہے اور اگرچہ اس بات سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ترقی یافتہ ترین عوام بھی حالات کو جذبات کی نظر سے دیکھنے سے محفوظ نہیں رہتے لیکن یہ حقیقت بھی اپنی جگہ تسلیم شدہ ہے کہ اگر کسی نازک موقع پر ان کے دیانت دار رہنما بروقت کوئی قدم اٹھالیں اور عوام پر اپنے اقدام اور ان کے زاویہ نظر کے حُسن و قُبح کے فرق کو واضح کرنے کی کوشش کریں تو عوام کا زاویہ نگاہ تبدیل ہو جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں یوں سمجھنا چاہئے کہ عوام میں موقع پرست، غیر ذمہ دار اور غرضمند افراد کی مقبولیت اور کامیابی کا راز یہ ہے کہ ان کے حقیقی رہنما بظاہر بروقت کوئی قدم نہیں اٹھاتے اور خواہ ان کی یہ خاموشی، دور اندیشی، بہی خواہی اور خیر سگالی ہی پر مبنی کیوں نہ ہو لیکن عوام اسے ان کی بے حسی، عافیت کوشی، خود غرضی، بے عملی اور قوم یا فرقہ کے ساتھ بے تعلقی پر محمول کرتے ہیں اور غرض مند عناصر ان کے ان شکوک کو یقین کی صورت میں بدل دینے کی کوشش کرتے رہتے ہیں، اس طرح ایک ایسی صورت حالات پیدا ہو جاتی ہے جس میں حقیقی مسئلہ کا حل ہونا تو درکنار اس میں مزید پیچیدگیاں پیدا ہوتی چلی جاتی ہیں اور عوام ہر نئی پیچیدگی اور ناکامی کی ذمہ داری اپنے حقیقی اور مخلص رہنماؤں پر عاید کرتے جاتے ہیں۔

بہر حال موجودہ حالات اس بات کے متقاضی ہیں کہ مسلمانوں کے مخلص رہنما، تقسیم ہند کے بعد پہلی مرتبہ جمع ہو کر مسلمانوں کے تمام مسائل پر غور کریں اپنے ذہن و فکر کی تمام تر صلاحیتوں کو اس بات کے سمجھنے اور سمجھانے پر مرکوز کر دیں کہ ملک کی سیاست، حکومت، اقتصادیات اور معاشرے کے ساتھ مسلمانوں کا کیا تعلق رہنا چاہئے؟ ان پر ملک کی جانب سے کیا فرائض عائد ہوتے ہیں اور ان فرائض کی ادائیگی کے لئے خود ملک میں ان کی حیثیت کیا ہونی چاہئے۔ پھر اسی اجتماع میں اس معاملہ پر بھی ایک مختتم رائے قائم کرلی جانی چاہئے کہ موجودہ حالات میں مستقبل کو تابناک اور محفوظ بنانے کے لئے ہندوستانی مسلمانوں کو اپنی

کن کن خصوصیات اور روایات کو ترک اور فراموش کر دینا چاہئے اور کن کن خصوصیات اور روایات کے تحفظ اور بقا کے لئے جدوجہد کرنا اور اس ملک کے غیر مسلم عناصر کو اپنے ساتھ تعاون اور اشتراکِ عمل کی دعوت دینا چاہئے۔ بہرحال اس اجتماع میں جو مسائل زیر بحث آ سکتے ہیں یا جن مسائل کو زیر بحث آنا چاہئے یہاں ان کی تشریح اور تفصیل کی ضرورت محسوس نہیں ہوتی اور یہ کام اسی حال میں مفید اور مناسب ثابت ہو سکتا ہے جب کسی ایسے اجتماع کے انعقاد کا فیصلہ کر لیا جائے۔

حالیہ فسادات کے پیشِ نظر بعض افراد اور حلقوں کی جانب سے اس خیال کا اظہار بھی کیا گیا ہے کہ پارلیمنٹ اور ریاستی مجالس قانون ساز کے مسلم اراکین کو بطور احتجاج ان اداروں کی رکنیت سے مستعفی ہو جانا چاہئے۔ اس تجویز میں عوام کے لئے جو کشش موجود ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ لیکن اس تجویز کی دلکشی کے باوجود عوام بھی اس بات سے انکار نہیں کر سکتے کہ احتجاج کا مرحلہ اس وقت پیش آتا ہے جب تفہیم و تفہیم کی راہیں بند ہو جاتی ہیں اور قومی مسائل کو حل کرنے کے لئے اس قسم کا کوئی قدم اٹھانے سے پہلے حصولِ مقصد تک جدوجہد کو جاری رکھنے کے لئے کسی لائحہ عمل کا پیشِ نظر ہونا ضروری ہوتا ہے محض احتجاج سے قومی مسائل کو حل نہیں کیا جا سکتا اور بحالت موجودہ یہ تجویز نہ صرف ناقابلِ عمل ہی نہیں بلکہ اس سے کوئی خاطر خواہ نتیجہ بھی نہیں نکل سکتا پھر چونکہ ہم ماضی میں عنوانات کی اسی طرح کی دل فریبیوں سے بہت کچھ ٹھوکریں کھا چکے ہیں اس لئے اب ہمیں زیادہ سے زیادہ محتاط اور ہوشمند رہنے کی ضرورت ہے۔

بہرحال ملک کے موجودہ حالات کے پیشِ نظر اور خود ملک کی فلاح و بہبود کے لئے مسلمانوں کے مسائل کو حل کرنے کی غرض سے جلد از جلد کوئی موثر قدم اٹھانے کی ضرورت ہے لیکن یہ قدم جذبات کے ماتحت نہیں اٹھایا جانا چاہئے اور اگر اسے مسلمانوں کے ایک ایسے اجتماع کی صورت میں اٹھایا جائے جسے آئندہ چل کر اس ملک کے جمہوریت پسند غیر مسلم عناصر کی حمایت، تائید اور اعانت بھی حاصل ہو سکے تو یہ امر ہماری جدوجہد کی کامیابی کا ضامن ثابت ہوگا [ان سطور کے لکھے جانے کے بعد، میری نظر سے ہندیونین کے وزیر داخلہ ڈاکٹر کاٹجو کا وہ مقالہ گذرا جو موصوف نے اس ملک میں مسلمانوں اور ہندوؤں کے تعلقات کو مستقل طور پر خوشگوار بنانے کے لئے قلمبند فرمایا ہے اور چونکہ برہان کی اس اشاعت میں اس مقالہ کا تجزیہ ممکن نہیں ہو سکتا اس لئے اسی قدر لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اس مقالہ کی اشاعت کے بعد مسلمانوں کے ایک اجتماع کے

[illegible]

ادبیات

غزل

از
(جناب روشن صدیقی)

جبیں پہ نورِ مسرت ہے، آنکھ پُرنم ہے
فروغِ عشق کا عالم، عجیب عالم ہے
ہزار پردہ حائل ہے، اک تحیّرِ شوق
جمالِ یار تجھے یہ نقاب کیا کم ہے
جہانِ لالہ و گل بھی نہیں دیارِ قیام
ہنوز گرمِ سفر کاروانِ شبنم ہے
مآلِ تلخیٔ عشرت سے بے خبر ہے حیات
ابھی تو شکوۂ آغازِ تلخیٔ غم ہے
خفا ہیں سب، ترے مستوں کی بے نیازی سے
کہ ان کو فرصتِ ترک و طلب ذرا کم ہے
سکوتِ ناز ہے ہم رنگِ نالۂ خاموش
اُدھر بھی ہے وہی عالم اِدھر جو عالم ہے
یہی ہے وقت روشن نذر کر متاعِ سکوں
خوشا! وہ زلفِ پریشاں کچھ اور برہم ہے

جبل الطارق

از

(جناب آثم مظفر نگری)

(۱)

اے جوابِ طورِ سینا اے حریفِ آسماں
طارقِ اعظم کے عزمِ نوجواں کی داستاں

تیرا ہر نظارہ ہے آئینہ دارِ زندگی
رقص کرتی ہیں ترے دامن میں موجیں بحر کی

باعثِ صد افتخارِ عالمِ کونین ہے
تیرے قدموں میں گہر زا مجمع البحرین ہے

آبنائے ہے ترے پہلو میں یوں جلوہ کناں
چرخِ نیلی فام پر جس طرح موجِ کہکشاں

یہ تلاطم خیزیاں ظلمات[1] و بحرِ روم کی
ہیں جہادِ زندگی میں درسِ آموزِ خودی

نعرۂ تکبیر کی تقدیس کا حامل ہے تو
اک حجازی قافلے کا رہبرِ منزل ہے تو

آشنا ہے کاروانِ منزلِ توحید کا
وادیوں میں ہے تری گونجی ہوئی بانگِ درا

منتشر یہ ابر کے ٹکڑے ہیں دامن میں ترے
یا ہیں مشغولِ تفرّج کچھ حجازی قافلے

دیدۂ حق بیں میں ہے تو مخزنِ اسرارِ شوق
تیرے ہر پتھر کا سینہ ہے امانت دارِ شوق

(۲)

یاد آیا ہے کہ تو تھا حاملِ رازِ خودی
فاتحِ اسپین نے بخشی تھی تجھ کو زندگی

طارق و موسیٰ[2] کے قدموں سے ہوا تو سرفراز
یاد تو ہوں گے تجھے وہ رسم و آئینِ حجاز

جن سے اہلِ غرب نے درسِ جہانبانی لیا
جن سے روشن مشرقی کا شانۂ حکمت ہوا

پھر دکھا دے تو مجھے وہ صبح و شامِ زندگی
وادیاں تھیں جب کہ تیری شاد کامِ زندگی

دے مجھے ہر لمحہ پیغامِ حیاتِ جاوداں
پھر سنوں تیری بلندی سے میں آوازِ اذاں

گو بظاہر آج تیری انجمن خاموش ہے
تیرے ہر ذرّے میں لیکن انقلابی جوش ہے

لا مرے ویرانے میں شمعِ جمالستانِ طور
تو بہارِ زندگی ہے جس کے شعلوں کا ظہور

---

[1] بحرِ اوقیانوس [2] موسیٰ بن نصیر طارق انھیں کے غلام تھے۔

ہو جواب چرخ نیلی فام پھر یہ خاکتود — طارق و موسیٰ کا ہو چوٹی پہ تیری پھر ورود
مصدر تبلیغ حق بن جائے ہر وادی تری — بربریت[1] ہو مبدّل پھر بشانِ دلبری

(۳)

عالمِ ہستی ہے صبح و شام رہینِ انقلاب — مضطرب ذرّوں کے سینوں میں ہیں لاکھوں آفتاب
ارتقائے بزمِ ہستی کا ہے ضامن ہر زوال — ہیں یہاں کتنے چمن پروردۂ دشت و جبال
صبح بن جاتی ہے خود زلفِ شبِ غم کا نکھار — شعلۂ برقِ تپاں دیتا ہے پیغامِ بہار
رہزنِ ہر راہِ منزل خضرِ منزل ہے یہاں — موجِ طوفاں خالقِ دامانِ ساحل ہے یہاں
قطرۂ دریا سے دریا ہو رہے ہیں موجزن — شامِ ہر گلشن سے ہے تخلیقِ ہر صبحِ چمن
تو بھی کر اپنی خموشی کو تکلّم آشنا — دے شہیدِ جستجو کو رازِ ہستی کا پتا
منتظر ہے گوشِ مسلم پھر اسی آواز کا — کاروانِ زندگی کو دے جو پیغامِ درا

"دل مرا ہنگامۂ حاضر سے بے پروا ہے آج
گوش آوازِ سرودِ رفتہ کا جویا ہے آج"

غزل

از

(جناب شارق میرٹھی ایم - اے)

مذاقِ دید سے تزئینِ محفل ہوتی جاتی ہے — نظر جس شے پہ پڑتی ہے مرادِ دل ہوتی جاتی ہے
جگر میں ٹیس، دل میں ہوک، لب پر آہ، نم آنکھیں — کہانی یاد کر لینے کے قابل ہوتی جاتی ہے
سمجھتا ہوں مآلِ عشق لیکن اس کو کیا کیجے — کہ اس کی ہر نظر منجملۂ دل ہوتی جاتی ہے
جنونِ شوق نے جس جس قرینے سے سجائی تھی — اسی ترتیب سے برخاست محفل ہوتی جاتی ہے
جو آتا ہے مجھی کو دیکھتا ہے ان کی محفل میں — جو محفل ان کی تھی اب میری محفل ہوتی جاتی ہے
یہ کیسا ذوقِ نظارہ، یہ کیسی دید و مجبوری — مری ہستی ہی خود میرے مقابل ہوتی جاتی ہے
یہ مانا جلوۂ ہستی فنا آمیز ہے شارق! — مگر پہلے سے کچھ رنگین محفل ہوتی جاتی ہے

[1] قوم بربری کو طارق نے دائرۂ اسلام میں داخل کیا تھا اور پھر فتح اسپین میں اس قوم نے حق کی مدد کی تھی

تبصرے

کلاسکی ادب از ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی ریڈر شعبۂ اردو دہلی یونیورسٹی تقطیع خورد ضخامت ۲۵۲ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت سیر پتہ:- آزاد کتاب گھر کلاں محل - دہلی

خواجہ احمد فاروقی اردو زبان کے ان چند ادیبوں میں سے ہیں جو پڑھتے زیادہ ہیں اور لکھتے کم ہیں جن کا ذوقِ تحقیق بلند اور سنجیدہ ہے اور ساتھ ہی تنقید کے میدان میں ان کا قدم احتیاط اور میانہ روی کے ساتھ اٹھتا ہے جس میں نہ عصبیت ہوتی ہے اور نہ کسی قسم کی ذہنی پیش خیالی کا کوئی اثر ہوتا ہے۔ پھر جو کچھ لکھتے ہیں علم وادب کی روایتی سنجیدگی اور متانت کے ساتھ شگفتہ واثر انداز اور شیریں زبان میں لکھتے ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب موصوف کے پندرہ مختلف مضامین کا مجموعہ ہے۔ اس کتاب کے تین مقالے میر تقی میر پر ہیں، دو غالب پر، باقی مقالات مومن۔ مرزا شوق کی مثنویاں۔ مفتی صدر الدین آزردہ کے غیر مطبوعہ خطوط۔ ریاض فانی۔ حسرت اور اصغر پر ہیں۔ ان کے علاوہ ایک مقالہ "فن اور روایت" اور دوسرا مقالہ "جنگ آزادی میں اردو کا حصہ" کے عنوانات پر ہے۔ ان مضامین میں تاریخی مباحث پر لائق مصنف نے جو محققانہ اور بصیرت افروز گفتگو کی ہے وہ اردو ادب کے ہر طالب علم کے لئے ایک متاعِ گراں مایہ ہے لیکن ہمارے نزدیک ان مضامین کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ ان میں فاضل مقالہ نگار نے قدیم اردو ادب کا جائزہ تحقیق وتنقید کے مروجہ ومقبول عام اصول کی روشنی میں اس خوبی اور عمدگی کے ساتھ لیا ہے جس سے سائنٹفک طریقہ پر اردو کلاسکی ادب کی عظمت۔ اس کی وسعت وپہنائی اور رموزِ حیات نفسیاتِ انسانی کی صحیح ودل کش ترجمانی کی صلاحیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ اس طرح گویا یہ مقالات بحیثیت مجموعی ترقی پسند ادب کے حامیوں اور مخالفوں دونوں کے لئے ایک دعوتِ فکر پیش کرتے ہیں۔ خواجہ صاحب

نے مومن کے تغزل اور ان کی شاعرانہ خصوصیات و اخلاق کی نسبت جو خیالات ظاہر کئے ہیں ان سے اختلاف ممکن ہے لیکن بہر حال انھوں نے جو رائے قائم کی ہے وہ کافی غور و فکر اور مطالعہ کے بعد کی ہے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اس لئے قابل قدر ہے امید ہے کہ ارباب ذوق اور خصوصاً اردو ادب کے اساتذہ اور طلبا اس کی قدر کریں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے ۔

وجیہ الدین وجدی | از جناب محمد بن عمر صاحب ایم ۔ اے لکچرار جامعہ عثمانیہ حیدر آباد تقطیع خورد، ضخامت ۲۰۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت دو روپیہ پتہ :۔ کتاب خانہ عابد روڈ حیدر آباد دکن ۔

وجدی ولی اور سراج اور نگ آبادی کا ہم عصر اور قدیم دکھنی زبان کا ممتاز و بلند پایہ شاعر ہے لیکن اس کا ذکر نہ تو عام تذکروں میں پایا جاتا ہے اور نہ اس کا کلام متعارف ہے لائق مؤلف جو انگریزی زبان کے لکچرر ہونے کے باوجود اردو کے بھی ایم ۔ اے ہیں اور اردو زبان و ادب کا شگفتہ ذوق رکھتے ہیں لائق مبارک باد ہیں کہ انھوں نے وجدی کو اردو ادب میں متعارف کرنے کی غرض سے بڑی محنت اور تحقیق کے بعد زیر تبصرہ کتاب مرتب کی ۔ اس میں وجدی کے حالات و سوانح، اس کے ہم عصر شاعروں کا تذکرہ، اس عہد کے سماجی اور سیاسی حالات بیان کرنے کے بعد شاعر کے کلام ۔ تصنیفات اور اس کی خصوصیات شاعری پر شگفتہ زبان میں بصیرت افروز تبصرہ کیا گیا ہے، لائق مصنف نے اگرچہ تھوڑے بہت وجدی کے اشعار بھی بعض خاص خاص مواقع پر نقل کئے ہیں لیکن کتاب کو زیادہ ضخیم بننے سے بچانے اور عام قارئین کی سہولت کی غرض سے اکثر جگہ انھوں نے اشعار کا مطلب اپنی زبان میں لکھ دیا ہے ۔ کتاب میں آخر کے دو باب "مثنوی اور وجدی" اور "وجدی کے کلام پر تبصرہ" مصنف کے وسیع مطالعہ اور سنجیدہ فکر کی دلیل ہیں، جن میں انھوں نے مغربی مصنفین سے بھی استفادہ کیا ہے بقول ڈاکٹر سید محی الدین زور کے جنھوں نے اس کتاب کا تعارف لکھا ہے ۔ موجودہ ناہموار ماحول اور غیر ساز گار فضا میں اردو زبان میں اس پایہ کی علمی و ادبی کتاب تصنیف کرنا اردو کے مستقبل کے لئے فال نیک ہے ۔ امید ہے کہ ارباب ذوق اس کی

قدر کریں گے اور اس کی اشاعت میں حصہ لے کر مصنف اور پبلیشر کے خلوص کی داد دیں گے۔

ضرورت حدیث از مولانا قاضی محمد زاہد الحسینی تقطیع خورد ضخامت ۴۴ صفحات، کتابت و طباعت معمولی قیمت ۶؎ پتہ:- دار الاشاعت والتبلیغ شمس آباد ضلع اٹک پاکستان

پاکستان میں آج کل فتنۂ انکارِ حدیث کا بہت زور شور ہے حدیث کی تشریعی حیثیت پر گفتگو کو اگر صرف ایک علمی اور فنی بحث تک محدود رکھا جاتا تو شاید علمی اعتبار سے یہ بحث ایک فتنہ نہ بنتی لیکن جو لوگ اس فتنہ کی پشت پناہی کر رہے ہیں ان کا مقصد تو یہ ہے کہ سرے سے دین کو ہی مسخ کر دیا جائے اور اسلام کو کانٹ چھانٹ کر کے ایک ایسا جامہ بنا دیا جائے جو ہر ایک قد و قامت پر موزوں ہو جائے، خوشی کی بات ہے کہ پاکستان کے صحیح الخیال ارباب قلم علما نے اس فتنہ کی ہلاکت انگیزیوں کا احساس کر لیا ہے اور اب ادھر سے بھی حدیث کی ضرورت و اہمیت اور اس سے متعلقہ مباحث پر کتابوں، رسالوں اور مضامین و مقالات کا سلسلہ برابر جاری ہے۔ چنانچہ یہ کتاب بھی اسی سلسلہ کی ایک کڑی ہے، اس میں فاضل مصنف نے قرآن مجید کی آیات سے حدیث کی حجیت پر استدلال کرنے کے بعد تاریخی طور پر یہ ثابت کیا ہے کہ احادیث کی کتابت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے آپ کے زمانہ میں ہی شروع ہو گئی تھی پھر بتایا ہے کہ ان احادیث کی حفاظت کس طرح کی گئی، اُن کا صحت و سُقم معلوم کرنے کے لئے کیا کچھ کیا گیا اور یہ کوششیں کس طرح کامیاب ہوئیں، چنانچہ اُن اصولِ روایت و درایت کی روشنی میں بلاخوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ کون سی روایت صحیح ہے اور اس بنا پر اس پر عمل واجب ہے اور کون سی روایت صحیح نہیں ہے، اس کے بعد منکرین حدیث کی طرف سے محدثین پر اور بعض احادیث پر جو اعتراضات کئے جاتے ہیں ان کے مدلل جواب دیئے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب معلومات افزا بھی ہے اور سبق آموز بھی!

تمرین الصرف از جناب مولوی محمد معین اللہ صاحب ندوی تقطیع خورد ضخامت ۱۱۹ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ، پتہ:- دار العلوم ندوۃ العلماء لکھنؤ۔

دار العلوم ندوۃ العلماء کی طرف سے عربی زبان کی تعلیم و تحصیل کو سہل بنانے کی غرض سے

چھوٹے چھوٹے رسالوں کا جو مفید سلسلہ جاری ہے یہ کتاب اس کی ہی ایک کڑی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ بچوں کی ابتدائی تعلیم صرف و نحو ان کی مادری زبان میں ہونی چاہیے اور پھر قواعد کو ذہن نشین کرانے کی غرض سے ان کی مشق و تمرین مختلف قسم کی مانوس و متداول مثالوں سے ہونی چاہیے، لائق مرتب نے انھیں دو اصولوں پر اس کتاب کو مرتب کیا ہے وہ چونکہ اس مضمون کے استاد ہونے کی حیثیت سے بچوں کی استعدادِ ذہنی اور ان کے لئے طریقِ تفہیم کا خود ذاتی تجربہ رکھتے ہیں اس بنا پر اس کتاب کی زبان، ترتیب، مسائل، امثلہ اور مشقیں وغیرہا سب اس انداز کی ہیں کہ عربی زبان کے مبتدی طلبا اس سے زیادہ سے زیادہ فائدہ حاصل کر سکتے ہیں یہ کتاب اس لائق ہے کہ عربی کے مدارس و مکاتب ابتدائی درجوں میں صرف کی تعلیم کے لئے اس کو اپنے یہاں شریکِ نصاب کریں۔

ایک ایکٹ کے ڈرامے | از جناب محمد بن عمرام۔ اے تقطیع خورد ضخامت ۹۴ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۱۲ عہ بیتہ: کتاب خانہ عابد روڈ حیدرآباد دکن۔

اگرچہ ہندوستان میں ایک ایکٹ کے ڈرامے عام طور پر مقبول و مروج نہیں ہیں لیکن اس طرح کے ڈرامے ریڈیو اسٹیشن سے نشر کرنے اور کالجوں میں اسٹیج کرنے کے لئے بہت موزوں ہوتے ہیں چنانچہ یہ ڈرامے بھی اب سے دس بارہ سال پہلے انہیں دو غرضوں کے لئے لکھے گئے تھے ان ڈراموں کا اسلوب مزاحیہ ہے اور اس پیرایہ میں سماج کی بعض تلخ و ناگوار حقیقتوں کی پردہ دری کی گئی ہے۔ زبان واقعات کے ساتھ ہم آہنگی اور مطابقت رکھتی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مصنف کو اس فن کے ساتھ طبعی لگاؤ ہے اور ان میں نفسیاتِ انسانی کی تحلیل و تشریح کا بھی اچھا سلیقہ ہے۔

بُرھان

جلد ۳۳ شمارہ ۵

نومبر ۱۹۵۴ء مطابق ربیع الاوّل ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نظرات

تمام ملک میں بڑے رنج واندوہ کے ساتھ سُنا گیا کہ جناب رفیع احمد صاحب قدوائی نے اچانک ۲۴ر اکتوبر کی شام کو نئی دہلی میں وفات پائی۔ بڑے آدمی۔ عام آدمیوں بلکہ ہر ذی حیات کی طرح پیدا بھی ہوتے ہیں اور مرتے بھی ہیں اور ان کا ماتم بھی کیا جاتا ہے۔ لیکن قدوائی صاحب کا مرنا ملک کے ہر طبقہ اور ہر گروہ میں۔ مردوں اور عورتوں کو۔ بوڑھوں اور جوانوں کو ایسا محسوس ہوا کہ گویا ان کا کوئی قریبی اور بہت ہی عزیز رشتہ داران سے باتیں کرتے کرتے اچانک ان سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا ہے اور اب وہ پھر کبھی ان کو نہیں ملے گا سبب یہ ہے کہ مرحوم اپنے دل و دماغ کی غیر معمولی صلاحیتوں کی وجہ سے جتنے ایک بڑے انسان تھے اپنے حد درجہ خلوص، مسلسل خدمت اور بے لوث حبِ وطن کے باعث اتنے ہی ہر دلعزیز بھی تھے۔ وہ جس طرح جنگِ آزادی کے میدان کے بہادر سپاہی تھے، اسی طرح ایک بیدار مغز اور مدبّر حکمراں بھی تھے دونوں حالتوں میں ان کے ہر عمل کا محرک ان کا جذبۂ خدمت ملک و قوم تھا وہ جس طرح ایک بہادر سپاہی کی حیثیت سے اپنے ذاتی عیش و آرام کے خیال سے کوسوں دور رہے، اسی طرح وزارت پر فائز ہونے کے بعد وہ راحت و تن آسانی کے تصور سے نا آشنا و بیگانہ تھے ان کی زندگی سرتاسر عمل اور حرکت تھی بولتے کم تھے اور کام زیادہ کرتے تھے۔ صاف دماغی اور بے تعصبی کے ساتھ ہر مسئلہ پر غور کرتے تھے اور آخر جب کسی نتیجہ پر پہنچ جاتے تھے تو عمل کی اپنی پوری طاقتوں اور صلاحیتوں کے ساتھ اسے کر ڈالنے پر تل جاتے تھے۔ ملک کے سب سے پیچیدہ مسئلہ خوراک کو انھوں نے جس کامیابی کے ساتھ حل کر دیا وہ اس ملک کی تاریخ مابعد آزادی میں یادگار رہے گا۔ اس کارنامہ کو دیکھ کر سیاسیات و اقتصادیات کے ہر طالب علم کو محسوس کرنا چاہئے کہ کسی ملک کی بڑی سے بڑی گتھی کو سلجھانے کے لئے افلاطون و ارسطو کی عقل اتنی درکار نہیں جتنی کہ قدوائی کا خلوص، بے غرضی، دیانت جد و جہد اور حوصلہ مندی ہے۔

ایک انسان کا کیرکٹر اور اس کی اخلاقی عظمت حقیقۃً اس وقت ظاہر ہوتی ہے جب کہ وہ اپنے حریفوں اور دشمنوں کے ساتھ کوئی معاملہ کرتا ہے ورنہ دوست کے ساتھ لطف وکرم کا برتاؤ تو ہر شخص کرتا ہی ہے قدوائی صاحب کی سیرت وشخصیت کو جب اس معیار پر دیکھا جاتا ہے تو صاف نظر آتا ہے کہ وہ بے شبہ غیر معمولی حوصلہ وظرف کے انسان تھے۔ ان کی حیاتِ سیاسی کا ہر لمحہ جنگ وپیکار میں بسر ہوا۔ لیکن اقتدار حاصل ہونے کے بعد وہ اپنے کسی دشمن سے انتقام تو کیا لیتے اپنے اثر واقتدار سے وہ اس کو جو فائدہ پہنچا سکتے تھے انھوں نے اس میں کبھی کوئی دریغ نہیں کیا۔ ایسے ہی لوگ ہوتے ہیں جو اپنی زندگی میں اپنے چاروں طرف مخالفتوں اور نکتہ چینیوں کا ہجوم رکھتے ہیں۔ لیکن جوں ہی ان کی روح قفسِ عنصری سے آزاد ہوتی ہے ان کے بڑے سے بڑے دشمنوں کی بھی آنکھیں بے ساختہ نمناک واشک فشاں ہو جاتی ہیں۔ قدوائی مرحوم دراصل اسی قسم کے لوگوں میں سے تھے۔ ۱۹۴۷ء میں مہینوں تک ان کا مکان مسلمان پناہ گزینوں کا ایک اچھا خاصہ کیمپ بنا رہا جہاں ڈیڑھ سو دو سو آدمی روزانہ دونوں وقت ان کے دسترخوان پر ہوتے تھے اور علاوہ کھانے کے دوسری اشیاء ضروریہ بھی پاتے تھے ان میں خاصی تعداد ان لوگوں کی بھی ہوتی تھی جو چند روز پہلے تک مرحوم کے شدید ترین نکتہ چینوں اور سخت مخالفوں میں سے تھے لیکن کیا مجال کہ مرحوم کی روش یا ان کے طرزِ معاملہ سے کہیں کسی جگہ بھی موافق ومخالف، اور دوست دشمن کا فرق محسوس ہو سکے۔

اس میں شبہ نہیں کہ قدوائی صاحب کا واقعۂ مرگ ناگہانی ملک کے لئے ایک بڑا المناک اور ناقابلِ تلافی حادثہ ہے۔ لیکن اگر دنیا کا ہر حادثہ اس لئے ہوتا ہے کہ لوگ اس سے عبرت ونصیحت حاصل کریں تو اس حادثۂ غم فزا سے ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو عبرت پذیر ہونا چاہیے۔

ہندوؤں کو محسوس کرنا چاہیے کہ۔ وطن دوستی۔ قوم پروری۔ اور خدمتِ ملک کسی خاص فرقہ یا مذہب کا اجارہ نہیں ہے۔ اور نہ وہ کسی ایک گروہ یا جماعت کے ساتھ مخصوص ہے۔ بلکہ شرافت

اور نیکی کی طرح یہ صرف قدرت کا فیض ہے جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے اس سے محروم کردے
قدرت کی کرشمہ سازی دیکھئے۔ انھیں پانچ چھ برسوں میں اس نے کس طرح اس حقیقت کو عملاً
واضح اور نمایاں کر دیا ہے کہ ہندو اگر وطن دشمنی پر اُتر آئے تو وہ گوڈسے بن سکتا ہے اور اس کے
برخلاف اگر مسلمان وطن دوستی اور قوم پروری پر آمادہ ہو جائے تو وہ رفیع احمد قدوائی ہو سکتا ہے۔ اس
سے معلوم ہوا کہ وطن دوستی اور قوم پروری کا معیار "مذہب" ہر گز قرار نہیں دیا جا سکتا۔

اسی طرح جن مسلمانوں کو بعض اوقات فرقہ پرستی کے تکلیف دہ مظاہر دیکھ کر دل شکستگی
اور مایوسی ہوتی ہے۔ انھیں سمجھنا چاہیئے کہ دنیا میں قابلیت، عمل اور مخلصانہ خدمتِ انسانیت۔ یہ
تین ایسے اوصاف و کمالات ہیں کہ ہر مخالفت اور دشمنی۔ ہر تعصب اور تنگ نظری پر آخر غالب
اور فاتح ہو کر رہتے ہیں سونا اگر واقعی سونا ہے تو عقل کا اندھا کب تک اسے پیتل کہہ کر ٹھکرا سکتا ہے
دنیا میں صرف اخلاقی طاقت ہی ایک ایسا حربہ ہے کہ جو دشمن تلوار سے فتح نہیں ہو سکتے ان کی گردنیں
بھی اس طاقت کے سامنے خم ہو جاتی ہیں۔ رفیع احمد قدوائی اللہ تعالیٰ ان کو مغفرت و بخشش کی
دولت و نعمت سے سرفراز فرمائے ان کی موت سے اگر ہندو اور مسلمان دونوں یہ سبق لے سکے
تو کہا جا سکے گا کہ ان کی موت بھی ملک و قوم کی مضبوط و پائدار تعمیر و ترقی میں بڑا کام کر گئی اور واقعہ
بھی یہی ہے کہ ایک بڑے انسان کی موت بھی اس کی زندگی کی طرح بے اثر و بے نتیجہ نہیں رہتی۔

عثمان رضؓ
صرف تاریخ کی روشنی میں

از

ڈاکٹر طہٰ حسین

مترجم

(جناب مولانا عبدالحمید صاحب نعمانی)

(۶)

اور پھر یہ تنہا سیاسی مشکلات ہی خلیفہ اور اس کے مشاورین و معاونین کی مشغولیت کا باعث نہ تھیں، انتظامی معاملات کی پیچیدگیاں بھی کچھ کم اور معمولی نہ تھیں، اس لئے کہ یہ ممالک جو مسلمانوں نے فتح کئے پہلے ہی سے اپنا ایک تمدن اور ایک تہذیب رکھتے تھے ان کا اپنا ایک مانوس نظم و آئین تھا جدا جدا ملک تھے اس لئے ان کے نظام بھی ایک دوسرے سے الگ تھے - ان تمام ممالک میں آئین کا اجراء ضروری تھا جس طرح فتح ہونے سے پہلے وہ زیرِ نظام تھے، اسلامی فتح تخریب و تباہی کی نہیں تعمیر و ترقی کی فتح تھی اور یہ ممکن نہ تھا کہ عرب یک بیک پختہ کار منتظم اور مشاق سیاست داں بن جائیں اور اتنے قوی بھی کہ مفتوحین کی شرارتوں سے خود کو محفوظ رکھ سکیں، اپنی جان اپنے مال و اسباب کی طرف سے بالکل مطمئن ہو کر مفتوحین سے اس قدر وصول کر سکیں جس سے ایک طرف قیام امن پر قادر ہوں دوسری طرف جنگ بھی جاری رکھ سکیں اور فتوحات کا دائرہ وسیع کرتے رہیں، ان حالات کے بیشِ نظر ان کے لئے اس کے سوا کوئی چارۂ کار نہ تھا کہ وہ ان دفاتر اور انتظامات کو باقی رکھتے جو فتح کے وقت ان کو ملے تھے، اور ان کی نہایت شدت کے ساتھ مسلسل نگرانی کرتے، ایسی نگرانی جو ان کو دھوکا کھانے یا دسیسہ کاریوں کا شکار ہو جانے

یا مخالفانہ ہجوم کے خطرات سے دور رکھتی اور ظاہر ہے کہ ان میں سے کوئی بات بھی معمولی نہیں

پھر عربی ممالک بجائے خود چند در چند مشکلات کا گہوارہ تھے خلیفہ کے لئے ضروری تھا کہ وہ ایک ایسی قوم پر حکومت کے لئے جو اطاعت اور اتباع کی عادی نہ تھی نہایت حکیمانہ مسلک اختیار کرے، اور قوم کے نوجوانوں اور طاقت رکھنے والے افراد کو زیر اثر کرے اور ان کو دور دراز مقامات پر بھیج دے جہاں سے وہ واپس آسکیں اور شاید نہ بھی آئیں، ہم عام فوجی تیاری اور بھرتی کے حالات سرسری طور پر پڑھتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں لیکن ہماری نظر اس تیاری اور بھرتی کی گہرائیوں اور اس کی مشکلات تک نہیں پہنچتی ہم اس کا بھی اندازہ نہیں لگاتے کہ جدید قوموں کے پاس اس سلسلے میں مقررہ اور مرتبہ دستور العمل ہیں جو کسی فوری تقاضے کی پیداوار نہیں بلکہ پوری قابلیت اور کمال مہارت سے بنائے گئے ہیں دقیق تجربہ اور طویل مشق پر اس کی ترتیب کی بنیاد ہے پھر کہاں وہ بدوی قوم جس کا بڑی بڑی لڑائیوں میں نہ کوئی مقررہ طریقہ نہ باقاعدہ فوجی بھرتی اور تیاری سے کبھی اس کا واسطہ، یہ تو اس کا پہلا اور صرف پہلا اقدام ہے جس کے پیچھے نہ کوئی تجربہ ہے نہ سابقہ آزمائش۔

یہ ان مشکلات کے چند پہلو ہیں جو حضرت عمرؓ کو پیش آئے اور اگر صدیق اکبرؓ کی زندگی نے وفا کیا ہوتا تو ان کو بھی پیش آتے اور حضرت عمرؓ کے بعد آنے والے خلفاء تو لازمی طور پر ان مشکلات سے دوچار ہونے ہی والے تھے پھر اس میں حیرت کی کیا بات ہے اگر حضرت عمرؓ اپنی خلافت کی وجہ سے سخت پریشانیوں اور مصیبتوں میں مبتلا ہوں؟ اور اس میں تعجب کا کیا مقام ہے کہ اگر وہ معاملات میں سخت، اپنے ارادوں میں اٹل، اور عظیم الشان تیاریوں میں منہمک ہوں، نہ خود آرام کریں اور نہ دوسروں کو آرام کرنے دیں اور کیوں یہ ان ہونی سمجھی جائے اگر حضرت عمرؓ اپنے ساتھیوں اور ہم عصروں میں ایسی شخصیت کی تلاش رکھتے ہوں جو ان مشکلات بلکہ اس سے بھی زیادہ الجھی ہوئی مشکل کا مقابلہ کر سکے اور وہ اپنی تلاش میں کامیاب نہ ہو سکے ہوں؟

سیاسی، جنگی اور انتظامی مشکلات پر ایک اور مشکل کا اضافہ ہے جس کا تعلق اس مذہبی ورثہ

سے جس کی حمایت اور حفاظت خلیفہ کا فرض ہے اور جس کے قیام میں وہی راہ اختیار کرنی ضروری ہے جو نبیؐ نے خدا کے حکم سے اختیار کی تھی اگر معاملہ صرف فتوحات کا اور انتظام اور سیاست کا ہوتا تو ان قوموں کی طرح جو کمزور سے قوی، وحشی سے متمدن اور غلام سے حاکم بن گئیں عرب بھی اپنا کام چلاتے جاتے، لیکن اسلام نے فتح کی جو حدیں مقرر کی ہیں اس میں مرکزی نقطہ یہ ہے کہ مفتوحین کے ساتھ وہ کامل انصاف برتا جائے جو ان کو فاتحین کی صف میں بٹھا دے اور فاتح اور مفتوح کا درجہ ایک کر دے، پس وہ فتح جس کی تصویر ہمارے سامنے اسلام نے اور اس کے رسولؐ نے اور صدیق اکبرؓ اور فاروق اعظمؓ نے پیش کی ہے تسلط اور خراج وصول کرنے کی نہیں بلکہ اصلاح اور ہدایت کی فتح ہے

اس کا مطلب یہ ہے کہ خلیفہ کے لئے سیاسی، جنگی اور انتظامی مہارت کے علاوہ ایک اور زبردست مہارت کی ضرورت ہے جو بہت زیادہ مشقت اور محنت کی طالب ہے جس کے ذریعے دین کی حمایت اور حفاظت کی جا سکے اور دین کو فاتحین کا آلۂ کار یا مفتوحین کی چال بازیوں کا شکار ہونے سے بچایا جا سکے، نیز جس کی موجودگی میں ان افراد کی نگرانی ہو سکے جن کے ذمے دین کا قیام ہے جن کو دین کے معاملے میں کسی ملامت کی پرواہ کبھی نہیں کرنی چاہیئے مبادا ان سے کوئی قصور اور بے اعتنائی ہو رہی ہو۔

پھر ان تمام مشکلات پر مستزاد مشکل مسئلہ جس کا حل کرنا اور جس کا سرا دین کے حقائق اور عوام کے مصالح سے ملا دینا حضرت عمرؓ کے لئے ضروری تھا وہ، یہ جدید قوت تھی جو نبیؐ کے ممتاز صحابہ اور فاتح سپہ سالاروں کی وجہ سے عربوں کو ملی یعنی ایک تو دین سے متعلقہ افراد کی قوت دوسری دنیا سے وابستہ حضرات کی قوت، تیسری دین و دنیا کے جامع اصحاب کی قوت، پس وہ صحابی جس نے اسلام کی طرف سبقت کی، دونوں ہجرتوں میں شریک رہا، تمام غزوات میں آنحضرتؐ کا ساتھ دیا اور اس کے بعد مدینہ میں مقیم ہو گیا وہ دین سے متعلق گروپ کا ایک فرد ہے، وہ قریشی یا عربی جو بعد میں اسلام لایا لیکن فتوحات کے دور میں مشکلات اور مصائب برداشت کئے اور فاتحین میں ممتاز رہا وہ دنیا سے وابستہ گروپ کا ایک فرد ہے اور وہ صحابی جس نے اسلام کی طرف

سبقت کی، اللہ اور اس کے رسولؐ کے لئے ہجرت کی غزوات میں آنحضرتؐ کے ساتھ رہا پھر فتوحات میں بھی ممتاز درجے پر رہا وہ دین و دنیا کے جامع گروپ کا فرد ہے، اب اگر خلیفہ چاہے کہ کسی کو جانشین مقرر کرے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ ان مختلف مصلحتوں کا لحاظ کرے اور ان پیچیدہ مشکلات میں سے ایک ایسا حل نکالے جو دین دنیا اور عوام کی مصلحتوں کے لئے قابل قبول ہو، ایسی حالت میں اگر حضرت عمرؓ نے کسی کو خلیفہ بنایا اور متردد رہے تو اس پر تعجب نہیں کرنا چاہئے البتہ تعجب اس وقت ہوتا جب وہ کسی کو نامزد کردیتے پھر بھی حضرت عمرؓ نے کوشش کی اور اپنے نازک اور خطرناک دنوں میں چاہا لیکن موت نے جلیل القدر صحابہ اور مسلمانوں کے ارباب فکر و نظر سے مزید مشورے اور تبادلۂ خیالات کی مہلت نہ دی۔

اس میں شک نہیں کہ شوریٰ کے لئے جو نظام ترتیب دیا گیا تھا اس میں خامی تھی اور بڑی خامی تھی، سب سے پہلی بات جو ہم کو متوجہ کرتی ہے وہ مجلس شوریٰ کے دائرے کی تنگی ہے، چنانچہ یہ صرف سات افراد پر مشتمل ہے اور ان میں بھی ایک فرد ایسا ہے جو شرکت مشورہ کے علاوہ کسی بات کا حقدار نہیں، یعنی عبداللہ ابن عمرؓ پوری مجلس میں وہی ایک ایسے مشیر تھے جن کے لئے غرض کا خانہ خالی تھا۔ ابھی یہ ارباب مشورہ جمع ہی ہوئے تھے کہ انھیں اندازہ ہوگیا کہ وہ ایک ایسی خطرناک پیچیدگی کی زد میں جو ان کی مجلس کا رخ غلط راہ کی طرف پھیردے گی چند مشیر اور سب کے سب خلافت کے امیدوار اب اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے آپ کو اس بات کے لئے آمادہ کریں جن پر آمادگی طبیعتوں کا معمول نہیں، اور یہ بھی اقتدار اور جاہ پسندی کی خاطر نہیں بلکہ اسلام اور مسلمانوں کی خیرخواہی کے خیال سے پس ان میں ہر امیدوار اخلاصانہ طور پر خیال کرتا ہے کہ وہ ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کی طاقت اور حق و انصاف کا لحاظ رکھنے کی اہلیت زیادہ سے زیادہ رکھتا ہے مجلس شوریٰ کے نگران کار حضرت طلحہؓ کے ذریعہ مسلمانوں کو حیرت زدہ بنا دینے والی یہ اطلاع ملی کہ خود مشیروں میں یکجہتی نہیں ہے اور مخالفانہ مقابلے کی صورت درپیش ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں

لقد کنت من ان تدافعوھا اخوف، — مجھے بڑا خوف تھا کہ مقابلے کی بجائے کہیں مخالفت کی نہ

منی من ان تنافسوھا ..... ٹھن جائے۔

ابو طلحہؓ پر خدا کی رحمت ہو اپنی طبیعت کی سادگی اور دل کی پاکیزگی سے حضرت عمرؓ کی طرح ایسا خیال کرتے تھے کہ خلافت ایک بار گراں ہے جس کے حصول کی طمع نہ کرنی چاہیے بلکہ اپنا دین اور دنیا سنبھالنے کی خاطر اس سے دور ہی رہنا مناسب ہے، لیکن مشیر اس خیال کے نہ تھے، ان کا نقطۂ نظر یہ تھا کہ خلافت ایک خدمت ہے جس کے حاصل کرنے کے لئے مقابلے کی سرگرمی ضروری ہے خواہ وہ کتنی ہی گراں بار ہو، اس لئے کہ اس کے ذریعہ ایک طرف خدا تک رسائی حاصل کی جاسکتی ہے اگر حسنِ ظن شریک حال ہو، دوسری طرف اس کے ذریعے انسانوں کی ہمدردی کی جاسکتی ہے اگر سچائی کے ساتھ اپنے خیالات کا اظہار کیا جائے، اور لوگوں کا فرض ہے کہ وہ مقابلہ کرنے والوں کے ساتھ حسن ظن رکھیں اور ان سے متعلق اظہار رائے میں صداقت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں،

ارکان شوریٰ میں سب سے پہلا فرد جس کو اصل مشکل اور اس کے حل کرنے کا تیزی کے ساتھ احساس پیدا ہوا حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے انھوں نے اپنے رفقاء کے سامنے یہ تجویز رکھی کہ ہم میں سے کوئی ایک امیدواری سے دست بردار ہو جائے اور انتخاب کا معاملہ ہم اسی کے حوالے کر دیں، اس تجویز پر سب خاموش ہو گئے، یا یوں کہئے کہ ان میں سے چار آدمی خاموش رہے حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت سعدؓ اور حضرت زبیرؓ۔ حضرت طلحہؓ نہ خاموش تھے نہ گویا یعنی وہ اس مجلس میں شریک نہ تھے حضرت عبدالرحمٰنؓ نے جب دیکھا کہ سب خاموش ہیں اور کسی ایک کو بھی دست برداری گوارا نہیں تو اس کے لئے وہ خود تیار ہو گئے، اور چاہا کہ انھیں باقی پانچ افراد میں سے کسی ایک کو مسلمان کا خالصاً لوجہ اللہ خیرخواہ تجویز کر دیں لیکن خود امیدواروں کے خدشات کے پیش نظر یہ بات آسان نہ تھی کہ وہ حضرت عبدالرحمٰن کی مختاری پر رضامند ہو جائیں، حضرت علیؓ کو خطرہ تھا کہ کہیں دامادی کے خیال سے عبدالرحمٰنؓ حضرت عثمانؓ کی طرف نہ جھک جائیں حضرت علیؓ کے علاوہ امیدواروں کو ڈر تھا کہ عبدالرحمٰنؓ سے سعدؓ کی رشتہ داری کہیں ان کی راہ میں حائل نہ ہو چنانچہ باہم قول وقرار ہوا اور طے پایا کہ عبدالرحمٰنؓ اپنی کسی رشتہ داری اور ذاتی خواہش سے متاثر نہ ہونگے اور جس کو وہ منتخب کر دیں قوم اسے تسلیم کرلیگی۔

اگر حضرت عمرؓ نے اس مجلس میں توسیع کر دی ہوتی اور عبد اللہ بن عمرؓ جیسے افراد کی تعداد بڑھا دیتے جو مجلس شوریٰ میں حاضر ہوتے اور مسائل و معاملات میں بحث و گفتگو کے سوا کسی اور بات کا حق نہ رکھتے تو غالباً مجلس شوریٰ شکوک و اختلافات سے بچی رہتی، اور میں تو خیال کرتا ہوں کہ مجلس شوریٰ سے متعلق حضرت عمرؓ کا تصور اگر امیدواروں کی ایک مجلس کا نہ ہوتا کہ جو بھی منتخب ہو جائے وہ خلیفہ ہے بلکہ مشاورین کی ایک ایسی جماعت کا ہوتا جس کے سامنے یہ چھ نام پیش کئے جاتے اور وہ ان میں سے کسی ایک کو پسند کر کے اس کو خلیفہ بنا دیتی حضرت عمرؓ ادھر متوجہ نہ ہو سکے اور نہ بعد میں مسلمانوں کو اس بات کا خیال آیا کہ انصار شوریٰ میں شریک کئے جانے کے مستحق ہیں خلافت کے امیدواروں کی پسندیدگی اور انتخاب میں رائے دینے کا انھیں بھی حق ہے ہم جانتے ہیں کہ جب تک مسلمان متفق ہیں امامت قریش کے لئے ہے لیکن اس اصول کا یہ مطلب ہم نہیں جانتے کہ امام کے انتخاب کا حق صرف قریش کو ہے، امام قریشیوں کا نہیں بلکہ تمام مسلمانوں کا امام ہوتا ہے پس تمام مسلمان اس کے انتخاب کے مالک ہیں ہاں ان پر یہ پابندی ضرور ہے کہ جو امام بھی وہ پسند کریں وہ قریشی ہو اس کے عہد کے اور بعد کے مسلمانوں کے دلوں میں یہ بات جم چکی تھی کہ انتخابِ امام اربابِ حل و عقد کا حق ہے، اور حضرت ابو بکرؓ اور حضرت عمرؓ کے زمانے میں ہم جانتے ہیں کہ ارباب حل و عقد کا دائرہ صرف قریش تک محدود نہ تھا خود صدیق اکبرؓ نے انصار سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ نحن الامراء وانتم الوزراء ہم امیر ہیں اور تم وزیر اس کے معنی یہ ہیں کہ حضرت ابو بکرؓ نے انصار کو ارباب حل و عقد میں شمار کیا ہے جہاں تک ہمیں معلوم ہے وزیر ہی توڑ جوڑ کیا کرتے ہیں پس لازم تھا کہ مجلسِ شوریٰ میں انصار شریک ہوں اور خلیفہ کے انتخاب میں حصہ لیں مزید براں مجلسِ شوریٰ میں قریش اور انصار کے علاوہ عرب سرداروں، میدان جہاد کے سپہ سالاروں اور اسلامی حکومت کے عمال اور حاکموں کی شرکت بھی ضروری تھی اس شکل میں اگر مجلسِ شوریٰ ترتیب پاتی تو مسلمان بہت سے مصائب اور مشکلات سے محفوظ رہتے،

شوریٰ کی اس طرح پر تنظیم میں ایک دوسری پیچیدگی جو ہمیں نظر آرہی ہے وہ یہ کہ مشیروں

کے اختیار کو موقت اور ہنگامی بنا دیا گیا حضرت عمرؓ نے تین دن کی مدت مقرر کی اور مسلمانوں نے اس تحدید کو منظور کرلیا اب اس کے سوا چارۂ کار نہ تھا کہ وہ اپنے ہی میں سے ایک کو منتخب کرتے اور اُسے خلیفہ بناتے، جو لوگ حاضر تھے وہ اس کے ہاتھ پر بیعت کرتے پھر دوسرے شہروں میں اس کی بیعت کے لئے خطوط لکھے جاتے یا زیادہ گہرے الفاظ میں یوں کہئے کہ خود خلیفہ اپنی بیعت کے لئے باہر کے لوگوں کو لکھتا اور مدینہ کے حاضرین کی بیعت سے حاصل ہونے والی خلافت کے نام سے باہر کے لوگوں پر حکومت کرتا، مطلب یہ ہے کہ اس نظام شوریٰ کے ماتحت تنہا مدینہ کے لوگوں کو یہ درجہ حاصل تھا کہ اگر وہ بیعت کرلیں تو دنیا کے تمام حصوں میں اس کی اتباع ضروری ہوجاتی ہے اس لئے کہ مدینہ مہاجر اور انصارِ صحابہ کا مستقر تھا تمام ارباب حل و عقد وہیں رہتے تھے۔ اور اس لئے بھی کہ خلیفہ کے انتخاب میں تاخیر سے مختلف قسم کے اضطراب و ہیجان کا امکان تھا تاہم یہ بات اپنی جگہ شک سے خالی ہے کہ صحابہ میں سے بعض اصحاب فکر و نظر اس وقت حضرت عمرؓ کے حکم یا اجازت سے مختلف شہروں یا محاذ جنگ پر تھے اور وہ اس کے اہل تھے کہ ان سے مشورہ لیا جاتا۔

لیکن تین دن کی مختصر مدت یعنے اقدام کے لئے عجلت، درحقیقت اصل خطرے کا دروازہ نہیں یہ تو مصلحت کا ایک تقاضا بھی ہوسکتا ہے اور حضرت عمرؓ نے یقیناً اس مصلحت کا صحیح اندازہ کرلیا تھا خطرے کی بات تو اس میں تھی کہ یہ مجلس وقتی اور ہنگامی تھی خلیفہ کا انتخاب ہوا اور یہ ٹوٹ گئی اگر اس مجلس کو کچھ اور وسعت دی جاتی اور پھر اسے ایک مستقل نظام کی حیثیت سے باقی بھی رکھا جاتا جو ایک طرف خلیفہ کے کاموں کی نگرانی کرتا اور دوسری طرف ضرورت کے مواقع پر خلفاء کے انتخاب کی کارروائی عمل میں لاتا تو یقیناً مسلمان پارلیمنٹری نظام کی طرف پہل کرنے والوں میں ہوتے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ اس کے مستحق بھی تھے، ناظرین نے حضرت عمرؓ کی سیرت میں اس بات کا اندازہ کرلیا ہوگا کہ وہ کس طرح اس نظام کے لئے تیزی اور سرگرمی کے ساتھ کوشاں تھے لیکن میں پھر اس بات کو دہراؤں گا کہ موت نے جلدی کی اور حضرت عمرؓ کو اس نظام پر غائر نگاہ ڈالنے سے پہلے ہی دنیا سے اٹھا لیا اگر زندگی نے وفا کی ہوتی تو امکان تھا کہ آپ اس کام کے لئے فرصت پاتے اور جو خاکہ ہم نے کھینچا ہے

اس کے مشابہ کسی نظام کی تکمیل فرما دیتے، پھر نہ کوئی کشمکش درمیان ہوتی اور باہمی آویزش کے وہ واقعات پیش آتے جو حضرت عثمانؓ کا مقابلہ کرنے والوں کے درمیان واقع ہوئے جس کا مرکزی نقطۂ حقیقت یہ سوال ہے کہ اگر مسلمان خلیفہ کی پالیسی کو غلط تصور کرتے ہوں تو کیا ان کو اجازت ہے کہ وہ اس کو معزول کر دیں یا یوں کہئے کہ رعایا اگر تنگ آ چکی ہو تو خود خلیفہ کا یہ فرض ہے کہ نہیں کہ وہ خلافت سے دست بردار ہو جائے۔

بہر حال اہل مشورہ نے معاملہ عبد الرحمنؓ کے سپرد کر دیا اور خود اپنے اپنے گھروں میں جا بیٹھے حضرت صہیب فاروق اعظم کی تعمیل ارشاد میں نماز پڑھاتے ابو طلحہؓ اور ان کے ساتھی عبد الرحمنؓ کے دروازے پر جمے رہے کہ تین دن گذریں اور وہ مسلمانوں کے لئے ایک امام پسند فرمائیں، کہا جاتا ہے کہ عبد الرحمنؓ نے اپنے اندازے اور استخارے پر قناعت نہیں کی انھوں نے اوروں سے بھی مشورہ لیا کچھ لوگوں کے پاس خود گئے بعضوں کو اپنے ہاں بلایا مردوں کے علاوہ ممتاز خواتین کو بھی شریک مشورہ کیا امہات المومنین اس سلسلے میں پیش پیش رہیں پھر جب تین دن کی یہ مقررہ مدت ختم ہونے کے قریب تھی تو آپ نے حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ دونوں کو بلوایا اور ہر ایک سے تنہائی میں گفتگو کی، چنانچہ حضرت علیؓ سے تخلیہ میں کہا اگر میں آپ کو خلیفہ منتخب نہ کر سکوں تو آپ کس کے حق میں اپنی رائے دیں گے حضرت علیؓ نے جواب دیا حضرت عثمانؓ کے حق میں پھر یہی سوال آپ نے حضرت عثمانؓ سے تنہائی میں کیا انھوں نے جواب میں حضرت علیؓ کا نام لیا، ہر چند کہ اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہے اس لئے کہ ایسا کوئی شاہد نہیں ہے کہ جو بتائے کہ عبد الرحمنؓ کی ان دونوں حضرات کے ساتھ کیا گفتگو ہوئی بہر حال عبد الرحمنؓ بن عوف نے ان سے تنہائی میں گفتگو کی اور اس کے بعد مسجد میں اجتماع کا اعلان عام ہو گیا، حاضرین سے مسجد بھر گئی عبد الرحمنؓ منبر نبوی پر چڑھ کر اس جگہ بیٹھے جہاں حضورؐ بیٹھا کرتے تھے، حضرت ابو بکرؓ نے اپنی نشست ایک زینہ نیچے کر لی تھی حضرت عمرؓ صدیق اکبرؓ کی نشست سے بھی ایک زینہ نیچے بیٹھا کرتے تھے، حضرت عثمانؓ جب خلیفہ ہوئے تو انھوں نے فرمایا کہ یہ سلسلہ تو بہت طویل ہو جائے گا اور پھر نبوی نشست ہی پر بیٹھ گئے۔

بہر حال عبدالرحمٰنؓ ممبر نبوی پر چڑھے اور رسول اللہؐ کے بیٹھنے کی جگہ پر بیٹھے سر پر وہ عمامہ تھا جو کسی سفر میں نبی کریمؐ نے باندھ دیا تھا ممبر پر کھڑے ہوئے اور دیر تک کھڑے رہے پھر دعا کی جس کی آواز لوگوں تک نہ پہنچی اس کے بعد حضرت علیؓ کو اپنے پاس بلایا اپنا ہاتھ بڑھا کر حضرت علیؓ کا ہاتھ پکڑ لیا اور کہا کیا آپ اللہ کی کتاب، رسول کی سنت اور شیخین کی اتباع پر مری بیعت لیں گے حضرت علیؓ نے جواب دیا نہیں میں اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق کوشش کروں گا، حضرت عبدالرحمٰنؓ نے ہاتھ چھوڑ دیا، اس کے بعد حضرت عثمانؓ کو بلایا اور ان کا ہاتھ پکڑ کر کہا کیا آپ اللہ کی کتاب رسول اللہ کی سنت اور شیخین کی اتباع پر مری بیعت لیں گے؟ حضرت عثمانؓ نے جواب دیا ہاں عبدالرحمٰن نے کہا خدایا تو گواہ ہے، خدایا تو گواہ ہے، خدایا تو گواہ ہے اس کے بعد لوگ بڑھے اور حضرت عثمانؓ کے ہاتھ پر بیعت کی۔

حضرت علیؓ نے بھی بلا پس و پیش بیعت کی، کہا جاتا ہے کہ ان کو تردد تھا اور جب عبدالرحمٰنؓ بن عوف نے ان سے کہا کہ علیؓ مواخذہ اپنے سر نہ لو۔ قرآنی ارشاد ہے جس نے عہد توڑ دیا ذمہ داری اس کے سر ہے اور جس نے اللہ سے کیا ہوا عہد پورا کیا خدا اسے اجر عظیم دے گا"۔ تب حضرت علیؓ آئے اور بیعت کی، لیکن میرا یقین ہے کہ حضرت علیؓ کو تردد نہ تھا اور وہ ہرگز اس کے محتاج نہ تھے کہ کوئی انھیں عہد وفا کی یاد دلاتا آپ کی پوری زندگی ہم کو بتاتی ہے کہ آپ کی ذات اس قسم کی یاد دہانی یا تنبیہ سے بالاتر تھی۔

مورخین کی صحیح روایت کی بنا پر اس دن کا سورج غروب نہیں ہوا تھا، وہ ذی حجہ ۲۳ھ کا آخری دن تھا اور حضرت عثمانؓ ۲۴ھ کی پہلی صبح کا مسلمانوں کے خلیفہ بن کر استقبال کر رہے تھے۔

تاریخی حقایق

از

(جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی دارالعلوم معینیہ سالم نگر)

"ادھر چند مہینے ہوئے، میں نے "تاریخ مشائخ چشت" پڑھی، اس سوا آٹھ سو صفحات کی ضخیم کتاب میں ساری باتیں ہی کام کی ہیں، مگر چند واقعات جو میرے قلب و دماغ پر اثر انداز ہوئے، ان پر نشان لگاتا گیا آج کی فرصت میں انہی میں سے کچھ واقعات حاضر خدمت ہیں" لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ (ظفیر صدیقی)

مفتاحی احباب کے اصرار سے اپنے اس ادارہ کی طرف نسبت کا اضافہ کیا جا رہا ہے جس کے "دامن تعلیم و تربیت" سے چار سال تک وابستہ رہا اور جس کے علوم و فنون کے باغ نے مری روح اور مرے دل و دماغ کو "حیات جاوداں" بخشی۔

شیخ نظام الدین اولیاء رحمۃ اللہ علیہ کسی تعارف کے محتاج نہیں، آپ نے ایک دفعہ فرمایا "مجھے خواب میں ایک کتاب دی گئی، جس میں لکھا ہوا تھا، کہ "جہاں تک ہو سکے دلوں کو راحت پہنچا" کیوں کہ مومن کا دل اسرار ربوبیت کا محل ہے ——— یہ بھی فرمایا " قیامت کے بازار میں کوئی اسباب اتنا مروج اور قیمتی نہ ہوگا، جتنا دلوں کو راحت پہنچانا"[1]

دلوں کو راحت پہنچانا ہمارے بزرگوں کی نظر میں کتنا اہم کام ہے، کیا اب یہ بات باقی رہی؟ اب تو اس دور میں کسی کو ستانا، اذیت دینا اور دل زخمی کرنا ہی عمدہ بات کہی جاتی ہے، وہ بات مزہ دار ہی نہیں، جس میں کچھ تیر و نشتر نہ ہوں،

ایک مرتبہ حضرت محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا

"جس قدر غم و اندوہ مجھے رہتا ہے کسی کو اس جہاں میں نہ ہوگا، اس واسطے کہ اتنی مخلوق مرے پاس آتی ہے

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۱۸۹

اور اپنے رنج و تکلیف بیان کرتی ہے، ان سب کا بوجھ مرے دل وجان پر پڑتا ہے، وہ عجب دل ہوگا جو مسلمان بھائی کا غم سنے اور اس پر اثر نہ ہو۔[1]

غریبوں اور مصیبت زدوں کی ایسی فکر اب کس کو ہوتی ہے؟ اپنا پیٹ بھر گیا سمجھے ساری دنیا آرام میں ہے، اب تو ہمارے زمانہ کی روش ہی بدلی ہوئی ہے، غریبوں کو کوئی نہیں پوچھتا، چند ہی لوگ نکلیں گے جو خلوص سے ان مصیبت زدوں کے لئے دعا بھی کرتے ہوں گے،

شیخ نظام الدین رحمۃ اللہ علیہ کا یقین تھا کہ برائی کا بدلہ اگر برائی سے دیا جاتے تو پھر یہ دنیا انسانی بستی باقی نہ رہے، کچھ اور ہو جائے، آپ فرمایا کرتے تھے

"اگر کوئی کانٹا رکھے اور تو بھی اس کے عوض کانٹا ہی رکھے، تو کانٹے ہی کانٹے ہو جائیں گے، ...

.. یہاں نیک و بد دونوں کے ساتھ نیک ہونا چاہئے"[2]

یہ تھا عمل ہمارے اسلاف کا، حدیث نبوی صلی اللہ علیہ وسلم "احسن الی من اساء الیک" پر اس دور میں یہ بات لوگوں کی سمجھ میں بھی نہ آئیگی، کہ برائی کا بدلہ نیکی سے دیا جائے، یہاں تو ردِ عمل کا دورہ پڑا ہوا ہے، اگر کوئی کسی کی انگلی کاٹنے کو صرف کہے، تو دوسرا موقع پاکر اس کے بدلہ میں اس کی گردن کاٹ ڈالے، ہندوپاک میں اقلیت کی خوں ریزی اور عصمت دری کے جو واقعات پیش آئے وہ اسی ردِ عمل کے نام پر،

اسی چیز کو محبوب الٰہی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک دوسرے موقع پر اس طرح فرمایا

"دو چیزیں ہیں ایک نفس، دوسرے قلب، جب کوئی نفس سے پیش آئے تو اس سے قلب سے پیش آنا چاہئے، یعنی نفس میں دشمنی، غوغا، اور فتنہ ہے، اور قلب میں سکوت رضا اور نرمی، پس جب کوئی نفس (دشمنی) سے پیش آئے تو اس سے قلب (نرمی) سے پیش آنا چاہئے، اس طرح نفس (دشمنی) مغلوب ہو جائے گا، لیکن اگر نفس کا جواب نفس سے دیا جائے، تو پھر دشمنی اور فتنہ کی کوئی حد نہیں رہے گی"[3]

کتنا دل نشین پیرایہ میں اس مسئلہ کو آپ نے سمجھانے کی سعی کی ہے، کاش ہم اس مسئلہ کو یقین

---

[1] تاریخ مشائخ چشت صـ۱۷۱ [2] ایضاً صـ۱۹۷ [3] ایضاً صـ۲۰۸

کے ساتھ سمجھ لیں تو پھر دنیا میں جو فتنہ و فساد برپا ہے، اور انسانی آبادی کو خاکستر بناتا چلا جاتا ہے، ختم ہو جائے، اور انسانیت کو سکون میسر آجائے،

ایک دفعہ آپ نے دوسرے کی عداوت کے ازالہ کی تدبیر بتاتے ہوئے فرمایا،

"اگر دو آدمیوں میں جھگڑا اور رنجش ہو، تو طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنا دل بالکل پاک و صاف کرلے، جب ایک شخص اپنا باطن عداوت سے پاک کرلے گا، تو دوسرے کی طرف سے بھی آزار کم ہو جائے گا"[1]

ضرورت ہے کہ یہ نصیحتیں ہمارے وزرار، علمار، صوفیار اور دوسرے طبقوں کے لوگ غور سے پڑھیں اور ان پر عمل کریں، آپ سے ایک دفعہ یہ شکایت کی گئی کہ برسر منبر کچھ لوگ آپ کو برا کہتے ہیں یہ سن کر آپ نے فرمایا۔

"جس نے مجھے برا اور ناسزا کہا ہے میں نے اسے معاف کر دیا، تمہیں بھی چاہیے کہ ان لوگوں کو معاف کردو"[2]

اب یہ اعلیٰ اخلاق ناپید ہوتا جارہا ہے، خدا کرے ہم ان کے فوائد کو سمجھیں

کچھ بدباطنوں نے خانقاہ میں آکر منہ پر آپ کو برا بھلا کہہ دیا سن کر خموشی اختیار فرمالی، اس سلسلہ میں ایک دن فرمایا

"لوگوں کے آپس کے معاملہ کی تین قسمیں ہیں پہلی قسم یہ ہے کہ ایک شخص سے دوسرے کو نہ فائدہ پہنچے اور نہ نقصان، ایسا شخص جماد کا حکم رکھتا ہے، دوسری قسم اس سے بہتر ہے اس میں وہ لوگ شامل ہیں جن سے لوگوں کو فائدہ پہنچتا ہے، نقصان نہیں پہنچتا، تیسری قسم یہ ہے کہ اس سے دوسروں کو ہمیشہ فائدہ پہنچتا ہے، اگر لوگ اسے مضرت پہنچاتے ہیں تو وہ اس کی پاداش و مکافات کا خیال نہیں کرتا، بلکہ تحمل کرتا ہے اور تکلیفوں کو سہتا ہے، اصل میں یہ کام صدیقوں کا ہے"[3]

ایک چوتھی قسم کا آپ نے ذکر ہی نہیں فرمایا جن سے صرف نقصان ہی نقصان پہنچتا ہے، یہ قسم ہمارے اسلاف کے خیال میں بھی نہیں آسکتی تھی اور غالباً یہی وجہ ہوئی کہ اسے ذکر نہیں فرمایا مگر ہمارے اس زمانہ میں ایسے لوگوں کی کمی نہیں، جو صرف ایذا رسانی کا ہی کام کرتے ہیں، نفع پہنچانا

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۵۱ [2] ایضاً [3] ایضاً ص۵۲

جانتے بھی نہیں۔

انسانوں سے محبوب الٰہیؒ کو بڑی ہمدردی تھی لکھا ہے۔

"گرمی کا موسم تھا، ایک دن حاضرین کی تعداد اتنی بڑھ گئی کہ سائے میں جگہ نہ رہی، لوگ دھوپ میں بیٹھنے لگے، حضرت محبوب الٰہیؒ کی طبیعت بے چین ہو گئی، فرمایا ——— ذرا پاس پاس ہو بیٹھو، تاکہ وہ بھی سائے میں بیٹھیں، کیونکہ دھوپ میں بیٹھے تو وہ ہیں اور جلتا میں ہوں"[1]

اب یہ درد اور بے چینی کہاں رہی؟ یہ بڑی قیمتی دولت تھی، جس سے اپنے اور غیر دونوں متاثر ہوئے بغیر نہیں رہتے تھے کاش اسے ہم آج پھر اپنا لیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ اکثر روزہ رکھا کرتے تھے، مگر سحری شاذ ونادر ہی آپ نے کبھی کھائی ہو، خادم سحری خواجہ عبدالرحیمؒ عرض کرتے۔

"مخدوم! آپ نے افطار کے وقت بہت ہی کم کھانا تناول فرمایا، اگر سحری کے وقت بھی تھوڑا سا کھانا تناول نہ فرمائیں گے تو ضعف بڑھ جائے گا، اور طاقت سلب ہو جائے گی، خواجہ عبدالرحیم کی یہ بات سن کر حضرت محبوب الٰہیؒ زار و قطار رونے لگتے، اور فرماتے ——— بہت سے مساکین اور درویش مسجدوں کے کونوں اور دکانوں کے گوشوں میں بھوکے اور فاقہ زدہ پڑے ہوتے ہیں، بھلا یہ کھانا میرے حلق میں کس طرح اتر سکتا ہے"[2]

آج جن لوگوں نے بھوکوں ننگوں اور مصیبت زدوں کے نام پر انگریزوں کو نکال کر حکومت سنبھالی، ان کا یہ حال ہے کہ وہ اپنی ذات پر ہزاروں روپے ماہانہ خرچ کرتے ہیں، مگر ایک بھوکے کا بھی فاقہ نہیں توڑتے، ایک ننگے کو بھی انھوں نے چھ سال کی حکومت میں اپنا ایک پیسہ نہیں دیا جو کچھ کیا اپنے لئے کیا، ان کو حضرت محبوب الٰہیؒ کے اس واقعہ سے سبق سیکھنا چاہئے، کہاں ہیں مختلف جماعتوں کے لیڈرانِ کرام پیغمبر اسلام کے اس فقیر بے نوا سے سبق حاصل کریں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ عبادت سے زیادہ اہمیت انسانی خدمت کو دیتے اور فرماتے نماز روزہ

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۱۵۲ [2] ایضاً ص۱۵۵

کوئی مشکل کام نہیں، مشکل یہ ہے "بنی نوع انسان میں شگفتگی پیدا کرنا، ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑنا، برائی سے بچانا اور بھلائی کی طرف بلانا"

حضرت شیخ رکن الدین ملتانیؒ فرمایا کرتے تھے

"جنابت دو قسم کی ہوتی ہے، ایک جنابت (ناپاکی) دل کی، دوسری جنابت بدن کی، بدن کی جنابت وہ ہے، جو عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے حاصل ہو، اور دل کی جنابت نالائقوں کی صحبت سے ہوتی ہے، بدن کی جنابت تو پانی سے پاک ہو جاتی ہے، لیکن دل کی جنابت آنسوؤں سے دھوئی جاتی ہے"[1]

دل کی گندگی اور اس کی پاکی کا مسئلہ خوب سمجھایا۔ واقعہ ہے بدکردار و بداخلاق کی صحبت انسان کے قلب کو آلائشوں سے بھر دیتی ہے، اگر کوئی اسے دور کرنا چاہتا ہے تو اس کے سوا کوئی صورت نہیں کہ رب العزت کے آگے روئے اور گڑگڑائے، کاش عام مسلمان اور علمار کرام اس مسئلہ کو سمجھتے اور عمل کرتے،

شیخ ہجویریؒ نے بیان فرمایا

"ایک علم کے مدعی نے ایک فقیر سے کہا کہ تو نے نیلگوں لباس کیوں پہنا ہے؟ اس نے جواب دیا پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم سے تین چیزیں باقی رہیں، ایک فقیری، دوسرے علم، تیسرے تلوار ——— تلوار بادشاہوں نے پائی، مگر انھوں نے اس کو موقع پر استعمال نہ کیا، علمار نے علم اختیار کیا۔ مگر صرف سیکھنا ہی پسند کیا (عمل بھول گئے ظفیر) اور فقیری فقیروں کے گروہ نے پسند کی، مگر اس کو امیری کا آلہ بنایا، ان تینوں گروہ کی مصیبت پر نیلگوں لباس پہنا ہے"[2]

آج کل کے امرار اور حکمراں طبقہ، علمار اور سجادہ نشین صوفیار، دل پر ہاتھ رکھ کر جواب دیں نیلگوں پوش فقیر نے جو بات کہی تھی صحیح ہے یا غلط؟ اگر صحیح ہے اور یقیناً صحیح ہے تو پھر ان کو سوچنا چاہئے کہ ایک دن مرنا ہے اور رب العزت کے سامنے حاضر ہونا ہے، اپنی اپنی صحیح راہ اختیار کریں اور غلط راستے سے توبہ کریں، اسی میں نجات ہے،

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۵۹ [2] ایضاً ص۶۵

ایک دفعہ ہارون رشید اپنے وزیر فضل کے ساتھ خواجہ فضیل بن عیاض کی خدمت میں حاضر ہوئے، خواجہ صاحب نے حاضری کی اجازت نہیں دی، خلیفہ کی حیثیت سے داخل ہونا پڑا، اس موقع سے خلیفہ ہارون رشید نے نصیحت کی درخواست کی، ان میں ایک نصیحت یہ تھی۔

"یہ ملک ترا گھر ہے، اور خلقت تری اولاد، ماں باپ کے ساتھ نرمی، بہن بھائیوں پر مہربانی، بچے بچیوں سے نیک سلوک کر، اگر کوئی مفلس بڑھیا رات کو بھوکی سو جائے گی، تو قیامت کے دن وہ بھی تری دامن گیر ہوگی، اور ترے ساتھ جھگڑے گی"[1]

یہ نصیحت اس لایق ہے، کہ آج کل کے صدر جمہوریہ، گورنر جنرل، وزرائے اعظم اور دوسرے ذمہ دار حکام اس کو بار بار پڑھیں اور اگر یہ درست ہے اور یقیناً درست ہے تو پھر عمل کرنا سیکھیں جو لوگ اسلامی حکومت کو سمجھنا چاہتے ہیں، ان ذروں پر نظر کریں۔

حق گوئی کی ایک مثال ملاحظہ فرمایئے، لکھا ہے

"حضرت سفیان ثوریؒ نے حج کے موقع پر منیٰ کے میدان میں خلیفہ منصور کو پکڑ لیا اور کہا، امیر المومنین! حضرت عمرؓ نے ایک حج میں جس کے تمام مصارف پر سولہ دینار خرچ ہوئے تھے فرمایا تھا "یہ معلوم ہوتا ہے کہ میں نے سارا بیت المال لے لیا" ——— آپ نے خدا اور امت محمدیہ کا بے شمار مال بغیر اجازت صرف کیا ہے، آپ اس کا کیا جواب دیں گے؟"[2]

اب اس زمانہ میں کسی وزیر، ولی عہد اور حکمراں سے حق بات کہنے کی کوئی جرأت ہی نہیں کرتا حالانکہ یہ اہل علم کا فریضہ ہے کہ وہ کسی سے منکر سرزد ہوتے ہوئے دیکھیں تو اس کو ٹوکیں اور اس کو راہ راست پر لانے کی سعی کریں، ہمارے زمانہ کے علماء اور صوفیاء چند افراد کو چھوڑ کر اگر خود نماز پڑھ لیتے ہیں اور دوسرے کام بے دلی ہی سے کر لیتے ہیں تو خدا پر بڑا احسان رکھتے ہیں، دوسروں کی اصلاح کی کوئی فکر نہیں کرتے، مگر سوچنا چاہئے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے "تم میں جو کوئی ناپسندیدہ بات دیکھے، اس کو قوت سے روکے، اتنی قدرت نہ ہو تو زبان

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۹۷ [2] ایضاً ص۱۰۷

سے روکے، اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو دل میں برا سمجھے اور یہ ادنیٰ ضعیف تر درجہ ہے"۔

امام غزالیؒ نے محمد بن ملک شاہ کو نصیحت کرتے ہوئے فرمایا ہے،

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت میں سب سے زیادہ عذاب جس کو دیا جائے گا وہ ظالم بادشاہ ہوں گے، حضرت عمرؓ فرمایا کرتے تھے، اگر ایک خارشی بکری کی خبر گیری مجھ سے رہ گئی تو قیامت میں مجھ سے مواخذہ ہوگا"[1]

اس کے بعد بادشاہ کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں

"اے بادشاہ! دیکھو حضرت عمرؓ کو باوجود کمال احتیاط، عدل و انصاف کے مواخذہ کا کتنا ڈر تھا، اور تیرا حال یہ ہے کہ تجھ کو اپنی رعایا کی کچھ پرواہ نہیں اور کچھ نہیں جانتا کہ تیرے ملک والوں کا کیا حال ہے"[2]

پھر اسی طرح کی آپ نے نصیحتیں فرمائی ہیں، ظلم و جور سے منع کیا ہے، اور پبلک پر رحم و کرم کرنے کی تاکید کی ہے،

شیخ محی الدین عبدالقادرؒ کے متعلق لکھا ہے کہ آپ مدرسہ میں تھے، اتنے میں

"خلیفہ مستنجد باللہ ابو المظفر یوسف، آپ کی خدمت میں آیا اور عرض کی کہ مجھے کچھ نصیحت فرمائیں اور دس تھیلیاں اشرفیوں کی خدمت میں پیش کیں، آپ نے فرمایا مجھے ان تھیلیوں کی ضرورت نہیں، خلیفہ نے اصرار کیا، تو آپ نے ایک تھیلی اپنے دائیں ہاتھ میں لے لی اور دوسری بائیں میں۔ اور دونوں کو دبا کر نچوڑا، تو ان سے خون بہنے لگا، پھر آپ نے فرمایا۔ ابو المظفر! کیا تو حیا نہیں کرتا کہ لوگوں کا خون لے کر میرے پاس آیا ہے"

گویا آپ کو بتانا تھا کہ یہ تھیلیاں ظلم و جور کا نتیجہ ہیں جو تم نے ستم ڈھا کر اور غریبوں کا خون بہا کر حاصل کیا ہے، یہ تمہاری جائز کمائی نہیں ہے۔ پبلک کا خون چوسنے سے ڈر اتنی بے حیائی پر نہ اترا، ضرورت ہے کہ آج بھی حق پرست علی الاعلان مظالم پر تنقید کریں اور حکمراں طبقہ کو ظلم و جور سے روکیں، پیٹھ پیچھے کہنا کافی نہیں ہے۔ منہ پر کہیں اور تلخ انداز میں کہیں۔

حضرت محبوب الٰہیؒ کے متعلق لکھا ہے کہ ایک زمانہ میں سخت عسرت اور تنگی کی زندگی

---

[1] و [2] تاریخ مشائخ چشت ص۱۱۰ [3] ایضاً ص۱۱۹

گزارہے تھے مگراس زمانہ میں بھی استغنا کا یہ عالم رہا کہ

"سلطان جلال الدین خلجی نے گاؤں بخش کرنے کی اجازت چاہی تو فرمادیا" مجھے اور مرے خدمت گاروں کو تمہارے گاؤں کی چنداں ضرورت نہیں، مرا دران کا خدا کارساز اور میرساماں ہے"[۱]

پھر کسی بڑے سے ڈرنے کا سوال کہاں سے پیدا ہوتا ہے، جو بادشاہ کی جاگیر کو ٹھکرادے بادشاہ خود محسوس کرسکتا ہے کہ وہ کس قلب و دماغ کا انسان ہے۔

حضرت چراغ دہلویؒ اپنے پرآشوب زمانہ میں ایک مضبوط چٹان کی طرح اپنی جگہ قایم رہے اور ہرآن غریبوں اور آنے جانے والوں کی ضرورتیں پوری کرتے رہے، ایک دن خود فرماتے لگے۔

"اب مجھ کو فرصت مشغولی اور خلوت کی نہیں ہے دن بھر مخلوق کے ساتھ رہنا چاہیئے، بلکہ قیلولہ بھی میسر نہیں ہوتا، بارہا قیلولہ کرنا چاہتا ہوں، جگا دیتے ہیں کہ فلاں آیا ہے اٹھئے"[۲]

ہمارے زمانہ کے پیر اس واقعہ کو پڑھیں، جو اپنے دروازہ پر پہرہ دار رکھتے ہیں اور مخصوص وقت کے سوا کسی غریب سے نہیں ملتے، باقی مالدار۔ بڑے آدمی سے تو سب ہی ملتے ہیں، یہ پیر اور پیرزادے بھی ملے تو کیا بات ہوئی؟

اورنگ زیب عالمگیرؒ کے بعدان کی اولاد نے جس طرح فضول خرچی کی، اور جس قدر بیہودہ زندگی گذاری، خدا کی پناہ، جہاں دارا شاہ کے متعلق بیان ہے کہ یا اپنی محبوبہ پر سالانہ دو کروڑ روپیہ خرچ کرتا تھا، اسی طرح فرخ سیر نے گھوڑوں پر بے انتہا روپیہ خرچ کیا، اس کا نتیجہ کیا ہوا۔ مورخ کے قلم سے سنئے، سرسید احمد خاں لکھتے ہیں۔

"اکبر شاہ اگرچہ تخت نشین ہوئے مگر اخراجات کی تنگی کا وہی عالم تھا، جو شاہ عالم کے وقت میں تھا شاہ عالم ہی کے وقت میں اخراجات کی نہایت تنگی تھی، تمام کارخانے ابتر ہوگئے تھے۔ شاہزادے جو قلعے کے نو محلے میں رہتے تھے ماہواری روپیہ نہیں ملتا تھا۔ اور چھتوں پر چڑھ کر چلاتے تھے کہ "بھوکے مرتے ہیں، بھوکے مرتے ہیں"[۳]

موجودہ زمانے کے وزراء وغیرہ اس واقعہ کو عبرت و بصیرت کی نگاہ سے پڑھیں، جو غریبوں کا

---

[۱] تاریخ مشائخ چشت ص۱۹۲ [۲] ایضاً ص۱۹۳ [۳] ایضاً ص۲۳۵

حق غصب کرتے ہیں اور آج بڑی شاندار زندگی کے مالک بنے ہوئے ہیں، قدرت کا قانون ان کو بھی معاف نہ کرے گا، دیر سویر ایک دن آئے گا کہ ان کی اولاد بھی بھوک بھوک چلائے گی، مگر کوئی نہ سنے گا

حضرت شاہ کلیم اللہ دہلویؒ اپنے مریدین کو ترغیب دیتے کہ تبلیغ کرو، اور مخلوق کے ساتھ نیکی سے پیش آؤ، فرماتے ہیں۔

"اپنے جان و مال کو اسی کام میں صرف کرو ــــــــ دینی اور دنیاوی منفعت دنیا کو پہنچاؤ اپنا عیش و آرام اور راحت انسانوں پر فدا کردو"[1]

یہ کسی سیاسی لیڈر کا بیان نہیں، ایک درویش عالم کا فرمان ہے غور کیا جائے مخلوق کی خدمت اور ان کی اصلاح کی ہمارے یہاں کتنی وقعت تھی، نادانی سے لوگوں نے سمجھا ہے کہ علماء کو اس سے کوئی واسطہ ہی نہیں۔

شاہ نظام الدینؒ کے متعلق فخر الطالبین میں مذکور ہے

"ان کے پاس اشرفی، روپیہ، پیسے علیحدہ علیحدہ کاغذ میں بندھے ہوئے رکھے رہتے تھے، جو محتاج آتا اس میں سے دیتے تھے، فقیر کو ایک پیسہ سے زیادہ نہ دیتے تھے اور لوگوں کو اشرفیاں تک دیتے تھے، فرمایا کرتے تھے کہ شریف کے لئے بڑی مشکل ہے، وہ شرم کے مارے بھیک بھی نہیں مانگ سکتا اور فاقہ کرتا ہے ان لوگوں کا کیا ہے یہ تو در در پھر کر خوب جمع کر لیتے ہیں"[2]

اس زمانہ میں کسی پیر اور پیرزادہ کا خیرات کرنا، اور محتاجوں کی امداد کرنا عنقا ہے، یہ تو خود گداگر بنے در، در مارے پھرتے ہیں۔ جس حلقہ میں نذرانے نہیں ملتے، اس حلقہ میں جانا ہی بند کر دیتے ہیں، اور جب حال یہ ہو تو ان سے تبلیغ اور اصلاح امت کی توقع سراسر دھوکہ ہے آج کل کے پیر اور پیرزادے دل کا استغنا کھو چکے ہیں، ایک بھکاری اور ان میں کوئی زیادہ فرق نہیں، اگر فرق ہے تو یہ کہ یہ ذرا مہذب اور شائستہ ہیں جو جونک کی طرح مریدین کا خون چوس لیتے ہیں اور ان کو خبر تک نہیں ہوتی،

---

[1] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۳۹۶ [2] ایضاً صفحہ ۵۵۸

شاہ نظام الدین اورنگ آبادیؒ کے اخلاق کے متعلق لکھا ہے کہ بہت بلند تھا، لوگوں کی دلداری اپنا فرض سمجھتے تھے، اور ہر آنے والے کو ایک نظر سے دیکھتے تھے، چنانچہ مذکور ہے۔

"ہر شخص کے لئے یہ کھڑے ہو جاتے تھے، اور اس کی تعظیم کرتے تھے، حد یہ ہے کہ چار سال کے بچہ کے لئے بھی وہی مبارک وضع رکھتے تھے جو ستر سالہ بوڑھے یا اکابر و فضلا کے لئے"[1]

اللہ تعالیٰ ان حضرات کی قبر کو نور سے بھر دے، یہ مساوات و عدل کی اپنے عمل سے تعلیم دے گئے اور ہر حق والے کو اس کا حق دیا۔ اب یہ چیز نایید ہے اب خاندانی خانقاہوں میں اگر کوئی غریب پہنچ جائے تو وہ صبح سے شام تک بیٹھا رہ جائے مگر ملاقات تک نصیب نہ ہوگی اور اگر کوئی وکیل، بیرسٹر اور حاکم وقت آجائے تو فوراً حجرہ کے کواڑ کھل جائیں اور پیرزادے کھڑے استقبال کے لئے نظر آئیں، اب غریبوں، دیہاتیوں اور اپنے سے چھوٹوں کے ساتھ وہ شفقت و محبت کہاں؟ جو ہمارے اسلاف میں تھی یہ تو اپنے چھوٹوں کو حقیر نظر سے دیکھنے کے عادی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے ان کی نمائشی زندگی کی قلعی بہت جلد کھل جاتی ہے، اور عوام میں ان کا وقار باقی نہیں رہتا، دولت کے سہارے اس کے برقرار رکھنے کی سعی کی جاتی ہے،

شیخ اورنگ آبادیؒ کا حال یہ تھا کہ بادشاہ دعوت دیتا مگر آپ ٹھکرا دیتے، نواب مدعو کرتا، مگر آپ تشریف نہ لے جاتے ——— آہ اب یہ خودداری کہاں باقی رہی؟ اب تو حرص و آز نے دنیا کا کتا بنا دیا۔ پیرزادوں کو جب پائیں گے تو کسی با اثر اور رئیس کے گھر پر انا للہ و انا الیہ راجعون

حضرت شاہ فخر الدین صاحب دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بڑے پایہ کے عالم اور بزرگ گذرے ہیں، ان کے اخلاق کے متعلق لکھا ہے کہ "ہر چھوٹے بڑے سے انتہائی خندہ پیشانی سے ملتے تھے، کسی کو مصیبت میں گرفتار دیکھتے تو تڑپ اُٹھتے، اور اس وقت تک اطمینان کی سانس نہ لیتے جب تک اس کی حسب استطاعت امداد نہ کر دیتے، ان کا ایک واقعہ بڑا عبرت انگیز اور سبق آموز ہے، لکھا ہے

"ایک مرتبہ حج کے ارادے سے نکلے، جب جہاز میں سوار ہونے لگے، ایک بڑھیا نے بڑھ کر سوال کیا،

[1] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۴۹۴

اور عرض کیا مجھے لڑکی کی شادی کرنی ہے اور مرا حال یہ ہے کہ فاقہ کرتی ہوں، کس طرح یہ کام انجام دوں، شاہ صاحب نے یہ سنتے ہی جہاز سے اپنا سامان اتار لیا اور جو کچھ زاد راہ تھا، اس بڑھیا کے حوالہ کردیا، اور خود وطن واپس آگئے۔[1]"

اسے کہتے ہیں انسانوں سے سچّی ہمدردی، اور مخلوق خدا پر شفقت و محبّت، ہے کوئی پیر اور پیرزادہ؟ جو اس ایثار کے لئے اپنے آپ کو تیار پاتا ہو؟ اب ان لوگوں کے دل سخت ہوگئے، دل بھیڑیا جیسا اور زبان شیریں، اوپر سے زرق برق، اور باطن سے کثیف اور گندہ، ظاہر سے باطن کو کوئی واسطہ نہیں، مری باتوں کا یقین نہ ہو تو ایک خفیہ کمیٹی کے ذریعہ ان کی پرائیوٹ زندگی کی رپورٹ تیار کروائی جائے ———— یہ مطلب ہرگز نہیں کہ سب کے سب ایسے ہی ہیں، یہ سمجھنا غلط ہوگا، کچھ خدا کے بندے ضرور ہیں مگر بہت کم، بلکہ برائے نام گنے چنے۔

انہی شاہ فخرالدین صاحب رح کے متعلق لکھا ہے

"مصیبت میں ہر شخص کی دست گیری کے لئے تیار رہتے، لوگوں کی خوشی اور غم میں شرکت فرماتے، اگر کسی غریب کے یہاں کوئی تقریب یا غمی ہوتی تو کئی کئی بار تشریف لے جاتے، اور اپنے مرید و معتقدین کو ہدایت فرماتے کہ وہ وہاں ضرور جائیں کہ اس کی دلدہی ہو۔[2]"

اسی سلسلہ کا ایک واقعہ ہے کہ ان کا خاکروب کئی دن نہ آیا بہت متفکر ہوئے پوچھنے پر معلوم ہوا بیمار ہے فوراً دیکھنے تشریف لے گئے، محبت سے حالات پوچھے اور ایک حکیم صاحب کو اس کے علاج کے لئے متعین فرمادیا اور علاج کے لئے روپیہ دے کر فرمایا

"میاں پیر محمد! تم جو دو روز نہیں آئے، اور فقیر سے اس زمانے میں پرسش احوال میں تاخیر ہوئی، معاف فرمادو۔[3]"

ایمان داری سے یہ بتایا جائے، اب یہ اخلاق و اعمال اس دور کے پیر اور پیرزادوں میں باقی رہا؟ اب بھی کوئی پیرزادہ کسی غریب کی مصیبت میں حالت دریافت کرنے اس کے گھر جائے گا؟ اپنا خیال تو یہ ہے کہ یہ بات آج کل غیر ممکن ہے، ہاں کوئی وکیل صاحب کوئی نواب صاحب یا کوئی وزیر صاحب بیمار پڑیں تو بلاشبہ تشریف لے جائیں گے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۳۸۴ [2] ایضاً ص ۱۷۱ [3] ایضاً ص ۴۸۹

غریبوں کو جس طرح دنیادار ظالم حکام اور وزراء حقیر سمجھتے ہیں ہمارے پیر اور پیرزادوں کا حال بھی اس سے کچھ زیادہ بہتر نہیں جن لوگوں کو پیر کی مجلس میں بیٹھنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ مری باتوں کی تائید کریں گے:

شاہ فخر الدینؒ نے ملک میں ابتری پھیلتے ہوئے دیکھا تو نہ رہا گیا، ایک دن بادشاہ سے صاف صاف کہا

"سلطان وقت جب تک بذات خود امور سلطنت کی طرف متوجہ نہ ہوگا اور محنت و مشقت اختیار نہ کرے گا حالات کبھی ٹھیک نہ ہو سکیں گے"[1]

اور پھر انھوں نے بادشاہ کو بے پروائی کے نتائج سے آگاہ کیا، کہ ملک کا کیا حشر ہوگا، ہمارے اسلاف تبلیغ اور اصلاح کا حق ادا کر گئے کہیں سے کوئی ایسی کمزوری اختیار نہ کی جو قوم و ملک کے لئے مضر ہو شاہ صاحبؒ نے بادشاہ اور امراء وقت سے کوئی جاگیر قبول نہ کی، بلکہ ان کو ڈانٹ بتلاتے رہے لکھا ہے۔

"ہر چند حضرت ظل سبحانی اور ان کے امراء نے جو آپ کے مرید و معتقد تھے دیہات قبول کرنے کی درخواست کی لیکن قبول نہ کی، بلکہ فرمایا کہ اگر یہ چاہتے ہیں کہ ہم اسی شہر میں رہیں تو اس طرح کی بات پھر زبان پر نہ آئے"[2]

بتایا جائے یہ عزت نفس اب ہمارے زمانہ کے پیر اور پیرزادوں میں ہے؟ پھر جو کچھ ہمارے پہلے زمانہ کے بزرگوں کو حاصل تھے، ان کو کیوں کر نصیب ہوں گے، اب خدا پر بھروسہ نہ کسی پیر پیرزادہ کو رہا اور نہ کسی درویش کو۔ اب تو قناعت کا مسئلہ خانقاہوں میں فراموش کر دیا گیا۔ رات دن ھَلْ مِنْ مَّزِیْد کا نعرہ ہے، مریدوں کو لوٹنے کے لئے رات دن دورے کئے جاتے ہیں۔ چوں کہ ناجائز پیسوں سے خانقاہیوں کا گوشت پوست تیار ہوتا ہے۔ اس لئے آج جتنی برائی مسلمانوں کے ان "صنم خانوں" میں ہے، شاید ہی کہیں ہو اور دین کے احکام سے جو جرح ان کی عورتوں اور بچوں کو ہے، کسی معمولی مسلمان کو بھی نہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو سمجھنے کی توفیق عطا فرمائیں۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۵۹۴ [2] ایضاً ص۵۰۰

لکھا ہے کہ ایک دفعہ سلطان المشائخؒ کے عرس کے موقع پر مولانا شاہ فخرالدین صاحبؒ کے ایک دو مرید اور صوفی یار محمد طوائفوں کا ناچ دیکھنے لگے، آپ نے کسی طرح دیکھ لیا تو بہت خفا ہوئے اور

"اپنے دست مبارک کی انگلیاں ان کے گریبانوں میں ڈال کر ان کو کھینچا اور فرمایا ہمارے بزرگوں نے بڑا خونِ جگر پی کر قوالوں کے سماع کو درجہ اباحت تک پہنچایا ہے اور تم ہو کہ عورتوں کا رقص دیکھتے ہو اور ان کا گانا سنتے ہو"[1]

اب تو ہمارے زمانہ کے کچھ پیروں نے سماع اور قوالی کو واجب قرار دے لیا ہے جب تک عرس میں قوالی نہ ہو، مرنے والے کی روح خوش ہی نہیں ہو سکتی، اور اب بھی کچھ پیروں کے مریدین قوالی سنتے سنتے عورتوں کے گانے ناچ کو بھی معیوب نہیں سمجھتے، بلکہ وہ کہتے ہیں یہاں بھی خدا کی یاد قلب کو گرما دیا کرتی ہے۔ ع چو کفر از کعبہ برخیزد، کجا ماند مسلمانی!

خواجہ محمد عاقلؒ جو سلسلہ چشتیہ کے ایک بزرگ ہیں ان کا نظام الاوقات ملاحظہ فرمائیں:

"مغرب کی نماز باجماعت ادا کرنے کے بعد وہ شغل و ذکر میں مصروف ہو جاتے تھے، پھر کھانا کھا کر عشاء کی نماز باجماعت پڑھتے، اس کے بعد مریدوں کی تعلیم و تربیت میں مشغول ہو جاتے تھے آدھی رات تک یہ سلسلہ جاری رہتا تھا، تہجد کی نماز پڑھ کر ذکر جہر کرتے تھے، قرآن پاک کی تلاوت فرماتے تھے۔ طلبہ کو درس شام کے وقت دیتے تھے، ڈیڑھ پہر دن باقی ہوتا تھا کہ ان کا حلقہ درس شروع ہو جاتا تھا"[2]

اندازہ لگایا جائے کہ ہمارے بزرگانِ دین اپنے اوقات کو کتنے اچھے کاموں میں صرف کرتے تھے اور کتنی محنت کرتے تھے۔ اب یہ چیزیں عنقا ہوتی جا رہی ہیں، ضرورت ہے پھر انہی پرانے طریقوں کو دہرایا جائے۔

حضرت شاہ محمد سلیمان تونسویؒ بھی سلسلہ چشتیہ کے ایک نامی گرامی بزرگ گزرے ہیں ان کی زندگی دین کی اشاعت اور سنت نبوی کی ترویج میں گزری۔ احکام دین کے عاشق تھے، ان کا عقیدہ تھا کہ مسلمانوں کے سارے مصائب اور درد دکھ کی وجہ دین سے دوری ہے، فرماتے تھے:

مسلمانوں نے اچھے اعمال چھوڑ دیے ہیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے کافروں کو ان پر مسلط کر دیا ہے"[3]

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۵۱۱ [2] ایضاً ص ۵۸۸ [3] ایضاً ص ۶۰۹

کتنی اچھی اور صحیح بات فرماتے تھے، اب یہ احساس کہاں رہا، اب ہر ایک دوسرے کو الزام لگاتا ہے اور سیاسی وجہیں پیش کر کے اپنے مریدوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ حالانکہ صحیح وجہ وہی ہے جو شاہ صاحب فرمایا کرتے تھے۔

شاہ سلیمان تونسویؒ فرمایا کرتے تھے:

"حضرت بایزید بسطامیؒ کی سی انکساری پیدا کرنی چاہیے۔ ایک مرتبہ بارش کی کمی ہوئی، نماز استسقاء کے باوجود بارانِ رحمت نازل نہیں ہوئی تو لوگوں نے کہا کہ بُرے لوگوں کی شامتِ اعمال سے یہ ہوا ہے۔ حضرت بایزید بسطامیؒ نے جب یہ سُنا تو فوراً شہر سے نکل کھڑے ہوئے کہ سب سے بُرا تو میں ہی ہوں"[1]

اب یہ انکساری ہمارے پیر اور پیرزادوں میں باقی رہی؟ اب وہ اپنی خانقاہ میں بیٹھ کر دوسروں کی غیبت کرتے رہتے ہیں، اور سارا قصور دوسروں کے سر ڈالتے ہیں، اپنے کو پاک دامن اور منزہ عن الخطا سمجھتے ہیں، حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ خود یہ جتنے بڑے ہوتے ہیں کہ الاماں الحفیظ، کاش یہ اپنے اعمال واخلاق کا جائزہ لیتے۔

حضرت شاہ صاحبؒ نے یہ بات بڑی درست فرمائی:

"توحید کا پھول اس زمین میں نہیں اُگتا جہاں شرک، حسد، اور ریا کے کانٹے موجود ہوں"[2]

انصاف سے بتایا جائے آج کون پیرزادہ ہے جو ان عیوب سے پاک ہے، ریا اور حسد ان کی گھٹی میں ہے، دوسروں کی عزت وشہرت ان کو ایک آنکھ نہیں بھاتی، دکھاوے کے لیے نہ معلوم کتنی ناجائز باتیں کر گزرتے ہیں۔ یہ نہیں سوچتے کہ کل ہمیں بھی مرنا ہے، اور اللہ تعالیٰ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

(باقی)

---

[1] تاریخ مشائخ چشت۔ ص ۶۳۲ [2] ایضاً

رشید یاسمی کا فلسفۂ اخلاق

از

(جناب لکشمی نرائن وشسشٹ تابش ایم۔ اے)

فلسفہ، فارسی ادب کی امتیازی خصوصیت ہے۔ یوں تو فلسفہ کا سکہ پورے ایشیا میں چلتا ہے اور چلتا رہا ہے مگر فارسی ادب میں جو فلسفیانہ نکات ملتے ہیں انھیں بین الاقوامی طور پر تسلیم کیا گیا ہے اگر رومیؔ، حافظؔ اور سعدیؔ زندگی میں قنوطی رجحانات کے علم بردار ہیں تو مشہور زمانہ عمر خیامؔ رجائیت کا پرچم بلند کئے ہوئے ہے فارسی ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ اس نے زندگی سے جس قدر قریب ہونے کا ثبوت دیا ہے وہ دوسری زبانوں میں بمشکل سے ملتا ہے۔

ایرانی ماحول کتنا حسین ہے اس کا اندازہ ان اثرات سے لگایا جاسکتا ہے جو اردو ادب میں فارسی ادب کے ذریعے پڑے ہیں اور ماحول کی یہ عکاسی ایرانی ادب کی بڑی خصوصیت ہے۔ وہی لہلہاتے سبزہ زار، صاف شفاف چشمے، وسیع سرسبز و شاداب خطے اور دریاؤں کے کنارے پھل دار درخت وغیرہ ایران کی ارضیات کے ہی نہیں بلکہ ادبیات کے بھی اہم اجزا ہیں۔ ان ہی حسین اور وقیع روایات کا سرمایہ عہد حاضر کے مشہور شاعر رشید یاسمی کو ملا ہے۔ ان کی شاعری ان تمام خصوصیات کی آئینہ دار ہے جو عہد قدیم کے فارسی ادب میں ملتی ہیں مگر اس سونے پر سہاگہ کا کام ان کی اس دلچسپ فطرت نے کیا ہے جس کی مثال دور جدید میں ایران میں مل سکے گی۔

علمی طور پر وہ فارسی ادبیات عالیہ کے دلدادہ ہیں لیکن انہوں نے دیگر زبانوں کے ادب سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ ایک طرف ان کی شاعری پر فرانسیسی ادب کا

اثر غالب ہے، دوسری طرف وہ بنگالی سے بھی متاثر نظر آتے ہیں اور پھر انہوں نے بین الاقوامی زبان انگریزی کے گلزارِ ادب سے بھی خوشہ چینی کی ہے اور ان کی تمام ادبی خوبیوں کا کھلے دل سے اعتراف کیا ہے جو ان کی حقیقت پسندی اور فراخ دلی پر دال ہے۔

ان کی شاعری میں رجائیت اور قنوطیت کا حسین امتزاج ملتا ہے، وہ عمر خیام کی طرح زندگی سے زیادہ سے زیادہ لطف اندوز ہونے کی تلقین کرتے ہیں لیکن اس طرح عمل کو دل کی بجائے دماغ کے تابع پسند کرتے ہیں۔ وہ رسوائے عالم الشمائی قنوطیت کے قائل ضرور ہیں، مگر وہ رنج وغم کو زندگی کے سب سے بڑے اجزا نہیں سمجھتے۔ یہی اعتدال اور توازن ان کی شاعری کی امتیازی خوبیاں ہیں۔

ان کی شاعری کا عمل سے گہرا تعلق ہے وہ زندگی میں بے حرکتی نہیں وہ ایک انقلاب برپا کردینے والی حرکت کے قائل ہیں۔ وہ جمود کے نہیں، بلکہ اضطراب کے قائل ہیں ایسا اضطراب جو نئی زندگی کی طرف رہبری کرتا ہے ان کی ذاتی زندگی، اجتماعی زندگی اور آفاقی زندگی۔ لیکن مجھے اس مضمون میں ان کی اخلاقی شاعری سے بحث کرنی ہے۔ اوپر بیان کی ہوئی خوبیوں کے علاوہ ان کے یہاں ایسا رچا ہوا اخلاق بھی پایا جاتا ہے جس پر زندگی کی عمارت کھڑی ہے اور جو اس دنیا کے بسنے والوں کو بے حد عزیز ہے۔ اس کے علاوہ انہوں نے زندگی کی حقیقتوں کو بڑے دلکش اور سادہ انداز میں بیان کیا ہے۔

جب بچہ پیدا ہوتا ہے تو اس کا دل اور دماغ دنیا کی تمام آلائشوں سے پاک وصاف ہوتا ہے اور نہ ہی وہ ان باتوں سے بخوبی واقف ہوتا ہے لیکن رفتہ رفتہ جب وہ بڑھتا جاتا ہے، تو اسے کچھ سمجھ آنے لگتی ہے۔ اور آخر کار جب وہ جوان ہو جاتا ہے تو اسے کم وبیش دنیا کے نشیب و فراز، سرد و گرم، رنج و راحت اور دیگر متضاد چیزوں کا پتہ چلتا ہے۔ دنیا کی ان متضاد چیزوں کو سمجھنے کے لئے وقت درکار ہوتا ہے۔ اسی لئے ہر چیز کی حد متعین ہے وہ ان حدوں کو توڑ کر باہر نہیں نکل سکتی۔ زندگی کے ہر شعبہ میں اسی وقت کامیابی حاصل کی جا سکتی ہے

جب تکلیف اور پریشانی اٹھائی جائے۔ انگریزی کی مشہور کہاوت یہاں صادق آتی ہے "No pain . no gain ." بات یہ ہے کہ جو مصیبت برداشت نہیں کرسکتا وہ زندگی کے آرام و آسائش کی قدر و قیمت سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ مشکل پسندی کی خوبی انسان کو منزلِ بالا پر پہنچا دیتی ہے ؎

رنجہا آموزگارانِ دلند	ہر کمالے را نخستیں منزلند
کودک اول چونکہ دیدہ برکشود	آئینۂ ادراکِ او بے زنگ بود
ہمچو آبِ صافی اندر بر کہ	نہ دراو تشویشی و نہ حرکہ
پس بہر رنجے ز چیزے کرد یاد	تا چنیں شد در ہمہ کار اوستاد
درد و رنج و گرم و تیمار و حزن	غصہ و اندوہ و آسیب و محن
جملہ باشد نردبان آگہی	کی تو بے رنجی قدم بالا نہی
درد ہر چیزت بداں چیز است راہ	چیز خواہی بیشتر دردی بخواہ [رنجہا]

خیال ایک ایسی روشنی ہے جو انسان کو منزلِ مقصود پر پہنچانے میں مدد دیتی ہے اور اندھیرے کو اجالے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ خیال پیچیدہ مسائل کو بھی حل کرتا ہے۔ جسم کی آب و تاب اسی سے قائم ہے۔ دل کی آراستگی کا دار و مدار اسی پر ہے اور اگر ہم چاہتے ہیں کہ یہ صحیح و سالم رہے تو یہ ضروری ہے کہ ہم اسے گندے ماحول سے دور رکھیں۔ گندگی کا آنا خیال کی تباہی و بربادی کی نشانی ہے۔ جب تک خیال کا چراغ نیک نیتی سے جلتا ہے اور اس پر کسی برائی یا کمزوری کا پرتو نہیں پڑتا تو یہ اپنے نور سے دنیا کو بہشت بنا سکتا ہے جس بہشت میں ہر خاص و عام برابری، امن اور محبت کی زندگی بسر کر سکتے ہیں۔ اور اگر اس میں آلودگی آتی ہے تو اس کی تباہی کے آثار نمودار ہوتے جاتے ہیں اس لئے بہتر یہی ہے کہ اس کو ہر صورت میں ہوا و ہوس کے چکر سے بچایا جائے ؎

چراغیست اندیشہ درمغزِ مرد — کہ بنمایدش رہ بہر کار کرد
دہد روشنی رازِ تاریک را — نماید بدو راہِ باریک را
نہاں خانۂ جاں بدو روشن است — وزو دل چو آراستہ گلشن است
چو خواہی کہ بینش نہ گردد تباہ — زبادش ہمی داشت باید نگاہ

["شمع اندیشہ"]

سُستی انسان کی تمام باطنی اور ظاہری خصوصیات پر پانی پھیر دیتی ہے اور اسے کہیں کا نہیں چھوڑتی۔ اس لئے کاہلی کو ترک کردینا لازمی ہے جو تمام کامیابیوں اور ترقیوں کے حاصل کرنے میں سدِ راہ ثابت ہوتی ہے۔ چنانچہ جو خوشی کوشش ہی کے ذریعے حاصل کی جائے اصل میں وہی "سرمایۂ آدمی" ہے اپنی ذاتی کوشش ہی میں راحت کے لوازمات پوشیدہ ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی لابدی ہے کہ زندگی میں ایک پیشہ اختیار کرنا چاہیئے تاکہ جسم کو زیادہ پریشانیاں لاحق نہ ہوں ؎

اگر کاہلی بر تو یابند چیر — بفرسودن تو نیابند دیر
یکی پیشہ باید گزیدن کہ تن — زمانے نیاساید از تو ختن
زکوشش بجو شادی و خرمی — کہ این است سرمایۂ آدمی

دنیا ایک آئینہ کے مانند ہے اگر انسان اسے ہنستا ہوا دیکھتا ہے تو اسے یہ دنیا ہنستی ہوئی نظر آتی ہے (یعنی اسے چاروں طرف خوشی اور شادمانی ہی نظر آتی ہے اور اگر اسے رونی صورت بنا کر دیکھتا ہے تو اس میں دکھ اور تکلیف کے سوائے کچھ نہیں دکھائی دے گا جیسے رات کے وقت ایک مسافر کا گذر گھنے جنگل میں سے ہوتا ہے اور ڈر کی وجہ سے اسے جنگل کا ایک ایک درخت (جنگل کے) خونخوار جانور نظر آتے ہیں اگرچہ اصلیت میں ایسا نہیں ہے۔ اسی طرح سے آدمی جس نقطۂ نظر سے اس عالم رنگ و بو کو دیکھتا ہے یہ اس کو ویسی ہی نظر آتی ہے۔ اور سندھی کی ایک مشہور کہاوت ہے کہ "جیسی

"درشتی دیسی سرشتی" یعنی جس کی نظر جیسی ہوگی اس کو دنیا ویسی ہی دکھائی دے گی ؎

کہ خوب و زشت ما ہمہ در وے نشاں بود	سوئے جہاں بہ پاکی آئینہ ساں بود
در شادماں در آں نگری شادماں بود	اندوہگیں چو بنگری، اندوہگیں بود

اسی بات کو دوسری جگہ اس طرح فرمایا ہے۔

درو منعکس نقشِ افعالِ ما	جہاں چیست آئینہ حالِ ما
بخندد بما بر چو گل بیش باد	بروئے اندرش گر بخندیم شاد
نہ بینیم در وی بجز چشم تر	دگر پیش او مویہ کردیم سر
بجستند ایں شادمانی ز می	از ایں پیش مردانِ فرخندہ پی

صحت زندگی کی دولت ہے اگر صحت نہیں تو زندگی بے مزہ اور بے لطف ہے انسان، زندگی کی لطافتوں سے اسی وقت لطف اندوز ہو سکتا ہے جب وہ تندرست اور توانا ہو۔ اور تندرستی ورزش کرنے سے آتی ہے اس لئے زندگی کو بدمزگی سے بچانے کے لئے ورزش کرنا ضروری ہے۔ اگر انسان تندرست ہے تو اس کا ہر کام کرنے کو جی کرے گا اور اس کی تمناؤں میں جوش و خروش ہوگا نہیں تو پژمردگی اور افسردگی اس کے دل و دماغ پر طاری ہو جائے گی۔ تندرستی سے ہی انسان خوشی کا مجسمہ بنا رہتا ہے ورزش سے جسم میں نیا خونِ زندگی دوڑتا ہے ؎

ز شادی بجوئیم پایندگی	ہماں بہ کہ از چشمہ زندگی
دلِ خرّم و شادئ جاوداں	ز ورزش بخواہیم نیروئے جاں

["ورزش"]

یہ ایک مانی ہوئی حقیقت ہے کہ جب انسان ہنسی خوشی کی محفل میں جا کر شامل ہوگا اور اپنے آس پاس خندیدگی کا ماحول دیکھے گا تو چاہے وہ کتنا ہی غمگین کیوں نہ ہو کچھ دیر تک کے واسطے ایسے ماحول میں اس کے رنج و غم فراموش ہو جائیں گے اور وہ خوش و خرّم ہو جائے گا ؎

خندہ بیند لاجرم خنداں شود	گشتی گم کردہ رہ شاداں شود

["خندہ"] باقی

اعثم کوفی کی تاریخ فتوح

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

یہ کتاب سنہ ۲۰۴ھ میں یعنی اب سے بارہ سو ستر برس پہلے لکھی گئی۔ مصنف کا نام احمد بن اعثم کوفی ہے جن کی وفات ۲۲۷ ہجری میں بتائی گئی ہے، افسوس ہے کہ مصنّف کے حالات نہیں معلوم ہیں۔ یاقوت نے چند لفظوں میں مصنف اور کتاب کا تعارف اپنی ارشاد الاریب میں کیا ہے جس سے ایک بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اعثم مورخ (اخباری) اور شیعی تھے، دوسرے یہ کہ ان کی تاریخ کا دامن ہارون الرشید کی خلافت تک وسیع تھا، تیسرے یہ کہ انھوں نے اس کتاب کے ضمیمہ کے طور پر ایک دوسری تاریخ لکھی تھی جس میں مامون سے لے کر مقتدر باللہ تک کے حالات بیان ہوتے تھے،

. . . .

میرے پیشِ نظر جو تاریخ ہے وہ عربی اصل کا فارسی ترجمہ ہے اور حضرت ابو بکرؓ سے لے کر واقعہ کربلا یعنی سنہ ۶۱ھ تک کے حالات پر مشتمل ہے۔ رشید کی وفات سنہ ۱۹۳ھ میں ہوئی جس کا مطلب یہ ہوا کہ موجودہ کتاب اصل کتاب کا ایک چھوٹا سا حصہ ہے یہ نہیں معلوم کہ مترجم نے قصداً کتاب کے ایک جزء کا ترجمہ کیا یا یہ کہ ان کو جو عربی نسخہ ملا وہ خود واقعہ کربلا تک محدود تھا یاقوت کے اس قول سے کہ اعثم نے کتاب کا ایک ضمیمہ مرتب کیا تھا جو مقتدر باللہ کی خلافت تک پہنچتا تھا ایک مسئلہ پیدا ہو گیا ہے اور وہ اس طرح کہ اعثم کی وفات سنہ ۲۲۷ھ میں بتائی گئی ہے اور مقتدر سنہ ۳۲۱ھ میں وفات پاتے ہیں اب یا تو اعثم کی وفات سنہ ۲۲۷ھ کی جگہ سنہ ۳۲۷ھ میں مانی جائے یا اس ضمیمہ کو جعلی قرار دیا جائے سردست تو ہمارے پاس کوئی ایسی شہادت نہیں جس کی بنا پر ان دو شقوں میں سے کسی ایک کو بھی باور کیا جا سکے۔ اس لئے یہ مسئلہ اس وقت تک کے لئے ملتوی رہنا چاہئے جب تک اس

کے بارے میں قطعی معلومات فراہم نہ ہو جائیں۔

جیسا کہ میں نے ابھی کہا پیش نظر کتاب اعثم کوفی کی عربی تاریخ فتوح کا ترجمہ ہے جس کو ایران کے فاضل احمد بن محمد منوفی (مستوفی) ہروی نے ۶۹۶ھ کے لگ بھگ فارسی کا جامہ پہنایا۔ مقدمہ میں اپنے مربی کا جو خراسان کے کسی سلطان کے وزیر تھے ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں

"در شہور سنہ ست وتسعین وخمس مائۃ در مدرسہ معمورۂ تابباد (اس شہر کا نام جو غلط معلوم ہوتا ہے تشخص نہیں ہو سکا) عزم نمود و ایں دعا گوئے را دراں مقام طلب فرمود دراں بقعۂ مبارک کہ منبع افاضل عالم و معدن فضلائے بنی آدم است خدمت آں مخدوم یافتہ آمد روزے چند فی مقعدِ صدقٍ عند ملیکٍ مقتدر روزگار گذرانیدہ شد و ہر روزے بانعامے تازہ و احسانے ورائے اندازہ مخصوص می بود و باصنافِ الطاف والوانِ احسان آں حاتم زماں می آسود و از مجاورت و محاورت جماعتے فضلا و اکابر بر موائد عقل فوائد حاصل می آمد شبے از شبہا امام کمال الدین کہ مطوّق حمامات آشیانہ و مقدم سدرۂ آستانہ است، حکایتے از کتاب فتوح کہ خواجہ محمد بن علی اعثم[1] کوفی کہ در سنہ ۲۰۴ دو لیست و چہار تالیف کردہ است بر خواند و عقلہا دراں فصاحت و بلاغت خیرہ ماند ازاں غرائب و عجائب و تقلب حال و انقلاب احوال عالمیاں براں گشت (؟) بر لفظ گوہر بار آں بزرگوار رفت کہ ایں کتاب بانواع فوائد مشحون است و خواص ایں کتاب از حد تقریر بیروں و از انواعِ مروت و فتوت و سخاوت و شجاعت و علم و حکمت او تجربہ بسیار حاصل میگردد واما میبایستے کہ کسے ایں کتاب را از زبان عربی بپارسی آوردے تا عجمی چوں عربی دریافتے...... و خاطر ما در ہر طرف توجہ کردے نسبت بر احمد منوفی قرار می گیرد کہ ہوا خواہِ مخلص و خدمت گارے معتقد است و ہمیشہ ہمت بر فراغ خاطر ما متوجہ میدارد و ہیچ اشارت ما را ہمل نمی گذارد، و چوں اشارت بریں فرمود ایں ضعیف را از امتثال فرمان چارہ نبود با آنکہ حد صناعت و قلتِ بضاعتِ خویش معلوم بود..."[2]

یہ ترجمہ پہلی بار انگریزی حکومت کی سرپرستی میں ۱۸۸۶ء میں بمبئی سے چھپا جب کہ لارڈ ڈفرن ہندوستان کے وائسرائے تھے، مترجم نے بڑی لیاقت اور خوبی سے ترجمہ کیا ہے کتاب میں بڑی تقطیع

---

[1] کتاب میں مصنف کا نام محمد بن علی لکھا ہے جو غالباً کاتب کی غلطی ہے، صحیح نام احمد بن اعثم ہے [2] فتوح ص۲

کے دو سو تہتر ۲۷۳ صفحات ہیں اور ہر صفحہ میں پینتیس ۳۵ سطریں ہیں، طباعت اچھی ہے غلطیاں کم ہیں مگر اسمائے اشخاص و امکنہ کثرت سے مسخ کر دئے گئے ہیں۔

کتاب کے نام سے ظاہر ہوتا ہے کہ اس میں فتوحات کا ذکر تفصیل اور جامعیت سے ہوا ہوگا مگر ایسا نہیں ہے یہ ذکر زیادہ تر اختصار کے ساتھ ہے گو کہ اس اختصار کے ضمن میں ایسے اشارے اور جزئیات زیرِ قلم آگئے ہیں جو فتوحات کو سمجھنے میں کافی مدد دیتے ہیں، جو معرکے مشہور ہوئے ہیں یا جن سے دشمن کی قوت کا کامل استیصال ہوا وہ البتہ مصنف نے خاصی تفصیل سے پیش کئے ہیں اور ان میں متعدد ایسے ہیں جن کو مشہور تاریخوں میں تشنہ چھوڑ گیا ہے مثلاً نہاوند، تستر، یرموک یہ تاریخی حصہ گو کم سہی مگر بحیثیت مجموعی بہت سی نئی اور قیمتی معلومات سے پُر ہے اور تاریخ کے تقابلی مطالعہ کے لئے نہایت کار آمد ہے۔

کتاب کا سب سے بڑا حصہ خود مسلمانوں کے باہمی معاملات سے تعلق رکھتا ہے اور اس میں ان حوادث اور وقائع کا مرقع پیش کیا گیا ہے جو قوت و اقتدار کے ولولہ، اور قرآن و سیرت کی کبھی یک طرفہ، کبھی ادھوری اور کبھی سطحی تاویل و تعبیر سے رونما ہوئے تھے۔

یاقوت نے لکھا ہے کہ مصنف شیعی مسلک کا تھا اور محدثوں کی نظر میں اس کا پایہ ضعیف تھا، محدثین حضرات کی یہ رائے درخور اعتنا نہیں، کیوں کہ انھوں نے ایک خاص نظریہ کے گروہ کو چھوڑ کر سارے مسلمانوں کے اقوال کو مردود ٹھہرا دیا تھا اور خود دنیائے حدیث میں ہی ایک شہر کے محدث دوسرے شہر کے محدثوں اور حدیثوں کو ساقط الاعتبار قرار دینے تھے، مدینہ، کوفہ بصرہ، صنعاء، دمشق اور فسطاط کے محدث اپنے اپنے مقامی شیوخ سے لی ہوئی حدیثوں کا کلمہ پڑھتے تھے اور باہر کی حدیثوں کو ضعیف یا موضوع سمجھتے تھے، وہ کسی جائز علمی موقف سے اعتراض نہیں کرتے تھے بلکہ اپنے موقف کی مذعومہ حقانیت سے، اس لئے ابن اسحاق، ابو عُبَیدہ مَعمَر واقدی، اور سینکڑوں دوسرے علماء اور مصنفوں کی طرح اعثم بھی ان کی میزان میں ہلکے ہوں تو نہ کسی تعجب کا موقع ہے اور نہ اس سے ان کے کام پر کوئی دھبہ آتا ہے، رہی یہ بات کہ وہ شیعی تھے تو ایسا ہوگا

لیکن خوشی اور حیرت کی بات ہے کہ انھوں نے حضرت ابو بکرؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ کی خلافت کے ذکر میں کوئی ایسی بات نہیں لکھی جس سے ظاہر ہو کہ ان کا قلم تعصب کے زہر سے آلود ہے بلکہ انھوں نے بہت سا مواد ایسا پیش کیا ہے جس سے ان حضرات کی خوبیاں ظاہر ہوتی ہیں، ان کی سیرت کا نقشہ زیادہ واضح اور خوشنما ہو جاتا ہے اور ان کے بارے میں جو الجھنیں اور شکوک دیگر تواریخ سے پیدا ہوتے ہیں وہ کسی حد تک دور ہو جاتے ہیں، ہاں حضرت علیؓ اور حسینؓ کی خلافت کے ذکر میں ایسے امور ضرور بیان ہوئے ہیں جن کو عصبیت سے تو کسی طرح نہیں البتہ جوشِ عقیدت سے تعبیر کیا جا سکتا ہے، یعنی حضرت علیؓ کے مافوق العادت تصرفات، حضرت حسینؓ کی بددعائیں اور ان کی تاثیر، دونوں کے بارے میں رسول اللہ کی ایسی حدیثوں کا ذکر جو شانِ نبوی سے بعید اور غیب دانی کے مستلزم ہیں، تو اس نوع کا ذکر ان کتابوں میں بھی ہے اور اعثم سے کہیں زیادہ جو غیر شیعی علمار نے لکھی ہیں۔

کتاب کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں راویوں کا نام لئے بغیر حالات بیان کئے گئے ہیں اور یہ ایک تعجب خیز بات ہے، کیوں کہ اس عہد بعید میں جب یہ کتاب لکھی گئی بغیر اسناد کے لکھنے کا نہ تو رواج تھا اور نہ بلا اسناد بات مستند سمجھی جاتی تھی، ممکن ہے اس بنا پر محدثوں نے اعثم کو ضعیف قرار دیا ہو، دوسری خصوصیت یہ ہے کہ ساری کتاب میں صرف ایک روایت پیش کی گئی ہے اور کسی واقعہ کے بارے میں دو روائتیں نہیں نقل کی گئی ہیں جیسا کہ طبری ابن ہشام، بلاذری، واقدی، یا مبرد کا طریقہ ہے۔ میزانِ تحقیق میں کتاب کی معلومات کس درجہ کی ہیں؟ اس سوال کا جواب میری حقیر رائے میں یہ ہے کہ متعدد مستند تاریخی کتب کے ساتھ اس کا تقابلی مطالعہ کرنے پر معلوم ہوتا ہے کہ کتاب کی معلومات بلند پایہ ہیں، ان معلومات کو چار حصوں میں رکھا جا سکتا ہے: پہلے حصہ میں وہ معلومات ہیں جو دیگر تواریخ سے کلی مطابقت رکھتی ہیں، دوسرے وہ معلومات جو دیگر تواریخ کے ابہام و اجمال کی توضیح و تفسیر کی حیثیت رکھتی ہیں، تیسرے وہ جو دیگر تواریخ کی معلومات سے زیادہ ہیں مگر تاریخی سیاق و سباق سے ہم آہنگ ہو جاتی ہیں، چوتھے وہ جو دیگر تواریخ کی معلومات

سے بالکل مختلف ہیں ان کی تعداد بہت کم ہے اور ان کی صحت و عدم صحت کا فیصلہ اس وقت تک کرنا مشکل ہے جب تک سارے غیر مطبوعہ تاریخی ذخائر ہمارے سامنے نہیں آجاتے: کتاب کا نقص یہ ہے کہ واقعات کی تاریخیں نہیں دی گئی ہیں مگر شاذ و نادر بلکہ ہر عہد میں جو اہم واقعات ہوئے ہیں ان کو سنہ اور تاریخ سے مقید کئے بغیر پیش کر دیا گیا ہے جس سے واقعات کی ترتیب کو سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔

کتاب کا تحلیلی جائزہ

کتاب دو سو بہتر صفحوں پر اس طرح پھیلی ہوئی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ کی خلافت بائیس صفحوں میں ہے، حضرت عمرؓ کی اٹھاون صفحوں میں، حضرت عثمانؓ کی پچپن صفحوں میں، حضرت علیؓ کی بانوے صفحوں میں، حضرت حسنؓ کا ذکر پانچ صفحوں میں ہے، حضرت معاویہ کا سترہ صفحوں میں، ڈھائی صفحے یزید کی خلافت اور مدینہ کے تین حریف امیدواران خلافت (حضرات ابن الزبیر، حسین، عبدالرحمن بن ابی بکر) کے ساتھ اس کی مہم بیعت کے بارے میں ہیں، قریب چوبیس صفحے یزید کے مقابلہ میں حضرت حسینؓ کے موقف اور حادثہ کربلا پر مشتمل ہیں۔

حضرت ابوبکرؓ کی خلافت

۱۔ کتاب کی ابتدا حضرت ابوبکرؓ کی بیعت سے ہوئی ہے اس سلسلہ میں مصنف نے تصریح کی ہے کہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہ کی وفات کے ڈھائی ماہ بعد بیعت کی۔

۲۔ مرتد قبائل کے خلاف مہموں کے ضمن میں مصنف نے قبائل حضر موت اور کندہ کی بغاوت جس کی قیادت اشعث بن قیس کے ہاتھ میں تھی) کا جو ذکر کیا ہے وہ فتوح البلدان کے بیان سے زیادہ مفصل مرتب اور پر از معلومات ہے۔

۳۔ شام کی مہم کی ابتدا، اس کی تیاری، لشکر کی فراہمی، افسروں کے تعین، افسروں کی حضرت

ابو بکرؓ سے اور ان کی افسروں سے گفتگو، خط وکتابت کا مصنف نے نہایت مربوط اور واضح ذکر کیا ہے۔

۴۔ مصنف نے لکھا ہے کہ مسلمانوں اور رومیوں کے پہلے بڑے مقابلہ سے پہلے مسلمانوں کا ایک وفد روم کے بادشاہ ہرقل سے ملا اور اس پر اسلام پیش کیا ہرقل نے ان کی بڑی آؤبھگت کی اور ایک صندوق منگوایا۔ جس میں بہت سے خانے تھے اور ہر خانہ میں حضرت آدم سے لے کر رسول اللہ تک مختلف انبیاء کی تصویریں ریشم پر رسم کی ہوئی رکھی تھیں، وہ ساری تصویریں اس نے وفد کو دکھائیں، آخر میں جب رسول اللہ صلعم کی تصویر دکھائی گئی تو وفد کے رکن رونے لگے اور بولے: یہ ہو بہو رسول اللہ صلعم کی شبیہ ہے گویا ہم ان کو زندہ دیکھ رہے ہیں ہرقل نے کہا میں اسلام کی حقانیت کا معترف ہوں، اگر میرا دل حکومت کی شان وشوکت سے ہٹ سکتا یا میری قوم میری پیروی کرتی تو میں ضرور مسلمان ہو جاتا۔[1]

۵۔ شامی سرحد کی چھوٹی چھوٹی بستیوں پر قابض ہونے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ رومی قیصر ہرقل نے جبلہ بن ایہم غسانی کی سرکردگی میں چالیس ہزار فوج بھیجی ہے جو دمشق کے باہر مقیم ہے عرب لیڈروں نے ایک کانفرنس کی اور طے کیا کہ لڑنے سے پہلے اسلام پیش کیا جائے چنانچہ ایک وفد جبلہ کے پاس بھیجا گیا، اعثم نے جبلہ اور اس کے دربار کے تکلفات، اس کے عربی افسروں کی سج دھج، اور عرب وفد کے ساتھ اس کی گفتگو کا تفصیلی ذکر کیا ہے، جبلہ اسلام کی طرف مائل تھا اور اس نے یہ کہہ کر وفد کو رخصت کیا کہ قیصر کے پاس جا کر اسلام پیش کریں اگر اس نے قبول کر لیا تو وہ خود بھی مسلمان ہو جائے گا۔[2]

۶۔ مصنف نے حضرت ابو بکرؓ کے دفن سے متعلق ایک واقعہ بیان کیا ہے جو نہایت مستبعد بلکہ محال نظر آتا ہے بستر موت پر انھوں نے حضرت عائشہؓ سے کہا کہ میرا جنازہ رسول اللہ کی قبر پر لے جا کر دفن کی اجازت مانگنا اگر مل جائے تو ان کے پہلو میں دفن کرنا ورنہ مسلمانوں کے

---

[1] فتوح ص۲۲ [2] فتوح ص۲۱

قبرستان میں۔ چنانچہ ان کا جنازہ آنحضرت کے مقبرہ کے باہر لاکر رکھا گیا اور لوگ اجازت کا انتظار کرنے لگے، تھوڑی دیر میں مقبرہ کا قفل کھلا اور دروازہ از خود کھل گیا۔ (فتوح ص۲۵)

خلافت حضرت عمرؓ

۱۔ حضرت عمرؓ کی خلافت کی فتوحات میں، عراق، ایران، شام اور جزیرہ کی فتح کا ذکر تفصیلی ہے اور مصر کی فتح کا نہایت مجمل۔ ان فتوحات کی تفصیلات طبری وغیرہ کی تفصیلات سے بعض جگہ کم، بعض جگہ بہت زیادہ مختلف ہیں۔ عراق و ایران کی فتوح میں طبری نے جن سپہ سالاروں کا ذکر کیا ہے اعثم نے بہت جگہ ان سے مختلف سپہ سالاروں کا ذکر کیا ہے اور چھوٹے فوجی افسروں کے ناموں میں بھی دونوں کے ہاں اکثر بہت اختلاف پایا جاتا ہے۔ طبری کے ہاں عراق و ایران کی فتوح کے واقعات اور ان کی ترتیب و تفصیل بالعموم مضطرب، ادھوری اور پڑھنے والے کی الجھن کا باعث ہوتی ہے اور یہ اضطراب، ابہام و اجمال طبری پر ہی موقوف نہیں بلکہ فتوح کی سب سے مکمل اور مستند تاریخ فتوح البلدان میں بھی موجود ہے۔ بڑی بڑی فتوح مثلاً نہاوند، تستر اور رَی کو ناکافی اور مبہم انداز میں پیش کیا گیا ہے جس سے قاری کو جنگ و فتح کے سیاق و سباق، لڑنے والوں کی تیاری، ان کے اسلحہ، جنگی چالوں، طریق جنگ، صلح کی نوعیت اور اسی قبیل کی دوسری اہم باتوں کا علم نہیں ہوتا، اعثم کے ہاں ان سب امور کا مجمل خاکہ ہے۔ ایران کی تین چار لڑائیوں کا ذکر انھوں نے خاص طور پر جامعیت سے کیا ہے جس کو پڑھ کر ایک طرف اس وقت کے فارسی فنِ جنگ، فارسی اسلحہ، فارسی قلعہ بندی، فارسیوں کی پرشکوہ مگر مائل بہ زوال تمدنی حالت اور دوسری طرف عربوں کے ڈسپلن، ان کے ناقابل تسخیر عزم اور جوشِ مذہب اور فرضِ منصبی کے شدید احساس کی ایک خوب واضح نہیں تو کم از کم ایسی تصویر ضرور کھنچ جاتی ہے جس پر تصویر کا اطلاق ہو سکتا ہے، جس کے نوک و پلک، رنگ و روپ، خد و خال گو دھندلے ہوتے ہیں مگر ان سے تصویر کا تشخص کیا جا سکتا ہے، اس کو سمجھا جا سکتا ہے اور دوسری تصویروں سے اس کا مقابلہ کیا

جاسکتا ہے، عراق کی فتوح میں طبری وغیرہ ایک واقعہ کو دو دو تین تین راویوں کے حوالہ سے پیش کرتے ہیں جو لبسا اوقات جزئیات میں اور کبھی اہم امور میں ایک دوسرے سے مختلف ہوتا ہے، سب سے نمایاں اختلاف سپہ سالاروں یا دوسرے فوجی افسروں کے ناموں اور فتوحات کے تقدم وتاخر اور سنہ کے بارے میں نظر آتا ہے اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ راویوں کی ساری دلچسپی فوجی افسروں یا جنگ کے نتیجہ یا دشمن کے مقتولین کی تعداد سے ہے، رہے واقعاتِ جنگ اور اس کی نہایت ضروری جزئیات وکیفیات تو ان کی طرف یہ راوی کم ہی دھیان دیتے ہیں۔

۲۔ مصنف نے شام کی اکثر فتوح کا ذکر کیا ہے اور جنگ یرموک جو سب سے بڑی جنگ تھی اور جس میں بقول مصنف تینتالیس ہزار عربوں اور قریب چار لاکھ رومیوں نے شرکت کی، تفصیل سے دی ہے، مصنف، دیگر تاریخوں کی طرح اسلامی جوش، جنگ میں عربوں کی بہادری، افسروں کے سرفروشانہ جذبۂ شہادت، لڑائی کی شدت، فریقین کی فوجی تعداد اور جنگ میں ان کے جانی نقصانات اور مال غنیمت کی مقدار ہی کا ذکر نہیں کرتا بلکہ وہ خاص توجہ جنگ کے سیاق وسباق کی طرف دیتا ہے، وہ اُس خط وکتابت کا ذکر کرتا ہے جو دشمن کی کثرت کو دیکھ کر عرب سپہ سالار خلیفۂ وقت سے کرتا ہے، وہ یہ بتاتا ہے کہ خلیفہ نے اپنے مشیروں سے کیا مشورہ کیا اور کس طرح سپہ سالار کی مدد کی، پھر جنگ ہونے سے پہلے وہ ان سفارتوں کا ذکر کرتا ہے جو طرفین کے درمیان جنگ سے بچنے کے لئے منعقد ہوتی ہیں، عرب وفد رومی سپہ سالار کے پاس جاتے ہیں اور اسلام یا جزیہ پیش کرتے ہیں، رومی سپہ سالار کی جوابی پیشکش کا ذکر ہوتا ہے، پھر جب فوجیں مقابل ہوتی ہیں تو دونوں کی تعداد بتائی جاتی ہے مسلمان فوجوں پر اپنی قلت کی وجہ سے کبھی کبھی جو ہراس طاری ہوتا ہے اور پھر اس ہراس کو دور کرنے کے لئے فوجی افسر جو ولولہ انگیز تقریریں کرتے ہیں، ان کا تذکرہ ہوتا ہے، جنگ کے اتار چڑھاؤ اور انفرادی شجاعت، رومی اور عربی افواج کی جنگی چالوں، رومی افسروں کے اسلحہ اور سج دھج کا بیان ہوتا ہے، یہی نہیں بلکہ یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ عرب افسر دشمن کی تیاری اور نقل وحرکت معلوم کرنے کے لئے شام کے شہروں میں جاسوس بھیجتے ہیں، کبھی کبھی ان کی

رسد کو محاذِ جنگ سے باز رکھنے کے لئے اطراف واکناف میں رسالے روانہ کئے جاتے ہیں جو رسد کو محاذ سے دور آلیتے ہیں اور تتر بتر کر دیتے ہیں، جنگ میں عرب عورتیں جو پارٹ ادا کرتی ہیں۔ اس کی جھلکیاں بھی نظر آتی ہیں، ہمیں بعض اوقات عرب افسروں کے باہمی تعلقات اور سیرت کا علم بھی کرایا جاتا ہے مثلاً جب خالد بن ولید عراق سے سپہ سالار ہو کر آتے ہیں تو شامی افواج کے سپہ سالار ابو عُبَیدہ کو اس سے دلی خوشی ہوتی ہے اور کچھ دوسرے افسروں کو افسوس ہوتا ہے، ہم کو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عرب افسر انتہائی تعاون، رواداری، اور اخلاص سے کام کرتے ہیں اور ان کا مقصدِ وحید اسلام کا بول بالا اور فتح پانا ہوتا ہے، نیز یہ کہ وہ صلح کی ہر پیشکش کو قومی یا فوجی مصالح کے علی الرغم قبول کر لیتے ہیں اور حتی الامکان جنگ و قتل سے گریز کرتے ہیں، ایسے اشارے بھی ملتے ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عام طور پر شام کے لوگ عربوں کی سیرت اور حکومت کو رومی حکومت پر ترجیح دیتے تھے اور ان کے پاسِ عہد اور وفاداری کی قدر کرتے تھے۔ شام کی مہموں اور بالخصوص یرموک کے حالات فتوح الشام ازدی مصری (محمد بن عبداللہ متوفی دوسری صدی ہجری) سے گہری مطابقت رکھتے ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اعثم نے اس نفیس کتاب سے اقتباس کیا ہے۔

۳۔ کتاب میں حضرت عمرؓ کے بہت سے وہ خطوط موجود ہیں جو انھوں نے فوجی افسروں کو لکھے اور دیگر تواریخ میں نہیں ہیں۔

۴۔ حضرت دانیال کی کہانی جن کی قبر سُوس (ایران) فتح ہونے کے بعد مسلمانوں کو معلوم ہوئی مصنّف نے تفصیل سے بیان کی ہے، فتوح البلدان میں دانیال سے متعلق جو باتیں لکھی ہیں وہ نہایت ادھوری اور اعثم کے بیان سے مختلف ہیں، اسی طرح ہرمزان بن نوشیروان عادل اور صوبہ اہواز کے حاکم کی تستر کی جنگ میں شکست کے بعد حضرت عمرؓ سے ملاقات کا قصہ دوسری تواریخ سے زیادہ پر از معلومات ہے۔ مصنف نے لکھا ہے کہ ہرمزان مع متعلقین جب مسلمان ہوا تو حضرت عمرؓ کو بڑی خوشی ہوئی اور یہ کہ وہ اس کی بہت عزت کرتے تھے اور اس کو اپنے پاس بٹھا کر میٹھی باتیں کیا کرتے تھے، انھوں نے اس کو مدینہ میں ایک مکان بھی دلوا دیا تھا۔[1]

---

[1] فتوح صـ ۶۲-۶۸

۵۔ حضرت عمرؓ اہل ایلیا کی درخواست پر صلحنامہ لکھنے جب بیت المقدس پہنچے تو سپہ سالارِ فوج مع تمام افسروں کے ان کا استقبال کرنے شہر سے باہر گئے، مصنف نے اس موقع پر ان کی اور ابو عبیدہ بن جراح کی حیرت انگیز ملاقات کا ذکر ان الفاظ میں کیا ہے:

"ابو عبیدہ از اسپ فرود آمدہ رسم تحیت بجا آورد، عمرؓ چوں ابو عبیدہؓ را دید کہ پیادہ شد، خود نیز پیادہ شد و یکدیگر را در بر گرفتند و عذر ہا خواستند، عمرؓ دست ابو عبیدہ را بگرفت و بوسہ داد، ابو عبیدہ دست خود را بر پائے او نہاد و امیر المومنین عمرؓ سر خود بر پائے او انداخت و خواست کہ پائے او را بوسہ دہد، ابو عبیدہ وا پس جست و گفت ویحک یا امیر المومنین خدائے را چنیں مکن و ما را بزہ مند مساز، امیر المومنین ہمچناں سر فرو کردہ اشک می ریخت و عذر می خواست، پس دست بگردن یک دیگر کردند و از حال یک دیگر"[1]

۶۔ مصنف نے لکھا ہے کہ وفات سے کچھ دن پہلے حضرت عمرؓ خلافت سے بیزار ہو گئے تھے، اس کا سبب بتایا ہے اور ان کے قتل، اپنے بعد خلیفہ کے تقرر، اور حضرات علیؓ، عثمانؓ، زبیرؓ، طلحہؓ، سعد اور ابن عوف کی اہلیتِ خلافت کے بارے میں ان کی رائے سے متعلق ایسی قیمتی تفصیلات بیان کی ہیں جن میں سے کچھ تو دوسری تاریخوں میں موجود ہی نہیں اور کچھ ناکافی موجود ہیں[2]

حضرت عثمانؓ کی خلافت

۱۔ حضرت عثمانؓ کے خلاف صحابہ اور غیر صحابہ کی طرف سے جو تحریک اٹھی اس کی روئداد کافی تفصیل کے ساتھ (۹۵ صفحے سے ۱۰۵ تک) دی گئی ہے، متعدد واقعات ایسے بیان ہوئے ہیں جو طبری، شرح نہج البلاغۃ، طبقات ابن سعد اور مروج الذہب میں نہیں ہیں اور ایسی تصریحات کی تعداد بھی کم نہیں جو طبری وغیرہ کے بیانات کی تکمیل و توضیح کرتے ہیں، حضرت عثمانؓ پر حملہ، ان کے قتل کی کیفیت اور جو لوگ اس میں اور ان کے گھر کی لوٹ میں شریک ہوئے نہایت بسط سے بیان کی گئی ہے۔

---

[1] فتوح صفحہ ۴۹ [2] فتوح صفحہ ۸۲-۸۰

۲۔ مصنف نے لکھا ہے کہ کابل حضرت عثمانؓ کے زمانہ میں فتح ہوا جب کہ ابن عامر پہلی بار بصرہ کے گورنر تھے (۲۹ھ تا ۳۵ھ) فتوح البلدان اور دیگر تواریخ کے مطابق کابل ۴۲ھ میں فتح ہوا جب کہ ابن عامر دوسری بار بصرہ کے گورنر تھے۔[۱]

۳۔ اعثم نے لکھا ہے کہ مرو کی صلح تین لاکھ درہم نقد پر ہوئی، فتوح البلدان نے یہ رقم بیس لاکھ اور بروایت اخری دس لاکھ درہم اور دو لاکھ جریب گیہوں اور جو لکھی ہے۔ قبرس کی فتح کی رقم اعثم کے مطابق ۱۲۰۰۰ دینار تھی، طبری کے مطابق سات ہزار دینار اور فتوح البلدان کے مطابق سات ہزار دو سو دینار، فتوح کے سلسلہ میں جو اختلاف مورخوں کے ہاں سب سے زیادہ رائج، نمایاں اور پریشان کن ہے وہ عرب اور غیر عرب افواج کے شمار اور دونوں کے ہلاک ہونے والوں کی تعداد اور صلح کی رقم کے بارے میں ہوتا ہے، اعثم نے بہت جگہ طبری، فتوح البلدان اور دیگر مورخوں سے تعداد کے تعین میں اختلاف کیا ہے۔

۴۔ مصنف نے جزیرہائے قبرس، رودس، صقلیہ، ارواد کی مہموں کی روداد بیان کی ہے اور لکھا ہے کہ ان سب جزیروں پر حضرت معاویہ نے عہد عثمانی میں فوج کشی کی اور سوائے صقلیہ کے سب کو باجگذار کر لیا مگر فتوح البلدان کا مصنف لکھتا ہے کہ قبرس کے علاوہ دوسرے مذکورہ بالا جزیروں کو معاویہ نے اپنے عہد خلافت میں فوجیں بھیج کر فتح کیا۔ بلاذری کی طرح طبری نے بھی عہد عثمانی کی فتوحات میں صرف قبرس کا ذکر کیا ہے۔ اعثم کی ان فتوح کا بیان بلاذری اور طبری ہر دو[۲] سے بحیثیت مجموعی زیادہ واضح، جامع اور دلچسپ ہے۔

خلافت حضرت علیؓ

۱۔ حضرت علیؓ کی بیعت کا ذکر کرتے ہوئے مصنف نے لکھا ہے کہ اول اول انھوں نے بیعت سے انکار کیا مگر جب باغی اور دوسرے لوگ مصر ہوئے تو وہ ان کے ساتھ طلحہ کے گھر گئے

---

[۱] فتوح صفحہ ۵، فتوح البلدان، مصر صفحہ ۳۰۴ [۲] فتوح صفحہ ۴۱، ۱۶۰، بلاذری صفحہ ۲۲۴، ۴۱۲، طبری، مصر، ۵/۱۱۹

اور ان کی بیعت کرنے پر آمادگی ظاہر کی طلحہؓ نے حضرت علیؓ کی منزلت کے سامنے خود کو خلافت کا اہل نہ سمجھا اور کہا میں آپ کی بیعت کے لئے بالکل تیار ہوں، وہاں سے حضرت علیؓ زبیرؓ کے پاس گئے اور ان کی بیعت کرنے پر آمادگی ظاہر کی، زبیرؓ نے بھی طلحہؓ کا رویہ اختیار کیا، اس کے بعد حضرت علیؓ نے خلافت قبول کرلی۔

۲۔ بانوے صفحے جو حضرت علیؓ کی خلافت کے بیان میں ہیں ان کا بیشتر حصہ جنگ جمل اور صفین سے متعلق ہے، جنگ جمل کا ذکر تیرہ صفحوں میں ہوا ہے اور اکسٹھ صفحوں پر صفین و تحکیم کی داستان پھیلی ہوئی ہے۔ اس میں قریب قریب وہ سب کچھ ہے جو شرح نہج البلاغۃ، طبری، الامامۃ والسیاسۃ، مروج الذہب اور الاخبار الطوال میں ہے اور بہت کافی مواد ایسا ہے جو ان کتابوں کے اجمال کی تفصیل کی حیثیت رکھتا ہے اور یہ حصہ بہت قیمتی ہے، اس کے علاوہ ایسے امور و حکایات بھی ضمناً بیان ہوئے ہیں جو مذکورہ کتب میں موجود نہیں ہیں، حضرت علیؓ و حضرت معاویہ کی خط و کتابت دونوں کی سفارتیں، دونوں کی جنگی تیاریاں، لڑائی کے معرکے، جنگ کے دوران میں دونوں کی صلح کی کوشش کرنے والوں کے جنگی میلانات، حضرت علیؓ کی غیر معمولی شجاعت اور جوش جہاد، عرب قبیلوں اور سرداروں کی پیاپے ہلاکت، حضرت معاویہؓ کے غیر معمولی اضمحلال اور فکر صلح اور صلح کے لئے ان کی حضرت علیؓ کے افسروں سے سازباز اور خط و کتابت، پھر تحکیم کا ہنگامہ، خوارج کا ظہور، جنگ نہروان، یہ اور دوسرے بہت سے جزئیات و حوادث جن کا احصار یہاں ممکن نہیں بڑی وضاحت سے پیش کئے گئے ہیں، اس جنگ کی تباہ کاری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ چوبیس گھنٹہ کے ایک مسلسل معرکہ میں طرفین کے ۳۶ ہزار مسلمان لقمۂ اجل ہو گئے [1]

۳۔ اعثم نے لکھا ہے کہ حضرت علیؓ نے خریت بن راشد، سردار بنو ناجیہ کو جنگ صفین سے پہلے اہواز شہر کا عامل مقرر کیا تھا، جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ انھوں نے خلافت کے معاملہ کو ثالث کے سپرد کر دیا ہے تو اس کو سخت غصہ آیا اور اس نے بغاوت کردی اس کی بغاوت

---

[1] فتوح صفحہ ۲۰۵

کو فرو کرنے کے لئے حضرت علیؓ نے کوفہ سے معقل نامی سردار کے ساتھ ایک فوج بھیجی جس نے اس کو اہواز میں شکست دی اور اس کے نوجیوں کو غلام بنالیا یہ فوجی کوفہ لائے جارہے تھے کہ ان کا گذر صوبہ اہواز کے گورنر مصقلہ بن ہبیرہ کے پاس سے ہوا، یہ روئے اور گڑگڑائے اور گورنر سے درخواست کی کہ ان کو چھڑائے، اس نے ترس کھایا اور زر مخلصی دینے کا وعدہ کرکے معقل سے ان کو رہا کرادیا، مگر زر مخلصی کی رقم وہ ادا نہ کرسکا اور جب تقاضا سخت ہوا تو بھاگ کر بصرہ اور وہاں سے کوفہ پہنچا حضرت علیؓ نے اس کو طلب کیا تو اس نے رقم کا جو تھا حصہ یعنی ایک لاکھ درہم ادا کردیا اور بقیہ جلد دینے کی رخصت لے کر گھر آگیا، مگر چوں کہ اس کے پاس روپیہ نہ تھا اور حضرت علیؓ کی گرفت سے سخت خائف تھا اس لئے رات کو کوفہ سے بھاگ گیا اور معاویہ سے جاملا۔ طبری نے اس بغاوت کا جو ذکر کیا ہے وہ اعثم کے بیان سے بہت مختلف ہے طبری کی روایت کے مطابق خریت جنگ صفین اور نہروان دونوں میں شریک ہوا اور اس نے بغاوت کوفہ میں کی اور وہاں سے دوسو سواروں کے ساتھ اہواز کی طرف بھاگا، اور جہاں جہاں گیا حضرت علیؓ کے خلاف پروپگنڈا کیا اور ایک بڑی تعداد لوگوں کی جن میں عیسائی اور ذمی بھی شامل تھے اپنے جھنڈے کے نیچے جمع کرلی معقل نے اس کا تعاقب کیا اور وہ ہر جگہ پسپا ہوتا ہوا فارس کے جنوبی صوبہ اردشیر خرہ پہنچ گیا، وہاں ایک زبردست معرکہ میں اس کو شکست فاش ہوئی، اس کی فوج بھاگ گئی اور اس کے کئی سو سپاہی جن میں ذمی اور عیسائی بھی تھے گرفتار ہوکر غلام بنالئے گئے، اردشیر خرہ کا گورنر مصقلہ تھا اس کے سامنے قیدی روئے اور پناہ طلب کی، اس نے ترس کھاکر دس لاکھ درہم پر ان کو خرید لیا اور آزاد کردیا، یہ رقم وہ نہیں ادا کرسکا اور بصرہ ہوتا ہوا کوفہ آیا اور جب وہ بھاگ کر حضرت معاویہؓ کے پاس چلا گیا تو حضرت علیؓ نے اس کا مکان گروادیا[1]

ہم عام طور پر مورخ لکھتے ہیں کہ صفین کے میدان میں جب طرفین قضیہ خلافت کو طے کرنے کے لئے ثالث مقرر کرنے پر رضامند ہوگئے اسی وقت حضرت علیؓ کی فوج کی ایک جماعت

---

[1] فتوح ص۲۲۳، طبری ۵/ ۷۰- ۷۵

میں جو عادۃً قرآن خواں، تہجد گذار اور روزہ دار تھے اس کے خلاف بددلی پیدا ہوئی اور وہ حضرت علیؓ کی رضامندی تحکیم پر قرآن فہمی کے زعم میں سخت برہم ہوئے حتیٰ کہ جب فوج کوفہ لوٹی تو راستہ بھر اس جماعت اور دوسرے لوگوں کے درمیان سب و شتم اور الزام کا سلسلہ جاری رہا اور یہ جماعت بارہ ہزار کی تعداد میں حضرت علیؓ سے باغی ہو کر کوفہ کے قریب ایک گاؤں میں جس کا نام حروراء تھا ٹھہر گئی اور باقی فوج کے ساتھ کوفہ میں داخل نہیں ہوئی، اعثم نے ان کی ابتدا کے بارے میں ذیل کا جو بیان دیا ہے وہ مروجہ بیان سے مختلف ہے:

"در اثناء آں کہ امیر المومنین علی مقام داشت بکوفہ و انتظار می برد تا میعادیکہ میان معاویہ نہادہ بود بگذرد، آں وقت با اہل شام بسر جنگ شود، طایفہ از عباد و نساک از خواص امیر المؤمنین علیؓ چہار ہزار سوار باہم متفق آمدہ از کوفہ بیروں رفتند و خلاف آنحضرت ظاہر کردند و می گفتند "حکم نیست مگر خدائے تبارک و تعالیٰ را، و آنکس را کہ در خدائے عاصی باشد طاعت نباید داشت" و فوج فوج مردم از سوار و پیادہ بدیشاں می پیوستند تا عدد آنہا بدوازدہ ہزار رسید و از ظاہر کوفہ کوچ کردہ بموضع حروراء فرود آمدند"[۱]

۵۔ مورخوں کے ہاں ایک قصہ مشہور ہے اور طبری نے بھی اس کو نقل کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ ابو الاسود دؤلی قاضی بصرہ کو حضرت ابن عباس (گورنر بصرہ) سے ایک معاملہ میں کد ہو گئی تھی، اس بنا پر انھوں نے حضرت علیؓ سے خفیہ طور پر ان کے اسراف و تنعم کی شکایت کی حضرت علیؓ نے ابن عباس سے بصرہ کی آمد و خرچ کا حساب مانگا حضرت ابن عباس کو حضرت علیؓ کے شکوک سے صدمہ ہوا اور انھوں نے گورنری سے استعفار دے دیا اور بصرہ کے خزانہ سے ایک بڑی رقم لے کر مکہ چلے گئے۔ اعثم نے لکھا ہے کہ ابن عباس نے جب استعفار دیا تو حضرت علیؓ نے ان کو منانے کے لئے حساب فہمی کا مطالبہ واپس لے لیا اور ابن عباس اپنے عہدہ پر قایم رہے۔[۲]

۶۔ حضرت علیؓ کے قتل کے موضوع پر مصنف نے جو انکشافات کئے ہیں وہ طبری میں موجود نہیں ہیں طبری نے لکھا ہے کہ ان کا قاتل ابن ملجم مصر سے کسی کام کے لئے کوفہ آیا ہوا تھا کوفہ کی ایک حسینہ قطام

---

[۱] فتوح ص۲۲۵ [۲] فتوح ص۲۲۲، ملاحظہ ہو طبری ۵/۸۱

نے اس کو فریفتہ کرلیا اور جب اس نے اس عورت سے شادی کی خواہش کی تو اس نے کہا کہ اگر تم میرے مہر میں تین ہزار درہم، ایک غلام اور لونڈی دو اور حضرت علیؓ کو قتل کردو تو میں تم سے شادی کروں گی، اس عورت کا باپ، بھائی اور چچا خارجی تھے اور حضرت علیؓ کے ہاتھوں جنگ نہروان میں مارے گئے تھے اور وہ ان کا انتقام لینا چاہتی تھی۔ ابن ملجم نے مجبوراً یہ شرطیں منظور کرلیں۔ طبری نے یہ بھی لکھا ہے کہ وہ عورت قتل علیؓ سے کچھ دن پہلے مسجد میں معتکف ہوگئی تھی اور جس صبح کو حضرت علیؓ پر حملہ ہوا اس نے ابن ملجم اور اس کے دو ساتھیوں کے جسم پر ریشم باندھا تھا تاکہ تلوار کا وار اثر نہ کرسکے اعثم نے اس عورت کے بارے میں جو باتیں لکھی ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ بدچلن تھی اور ابن ملجم کا اس سے بازاری تعلق تھا:

"ابن ملجم آں شب در خانۂ زنے قطام نام بود و خمر خوردہ بود، چوں قطام بانگ نماز امیر المومنین را بشنید اورا بیدار کرد و گفت بانگ نماز علی می شنوی، ما حاجت تو روا کردیم تو نیز برخیز و حاجت ما روا کن و خوش دل باز آ و لعشرت پرداز۔"[1]

اعثم کے بیان سے مزید یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محمد بن اشعث ابن ملجم کے ساتھ قتل کی سازش میں شریک تھے یا یہ کہ ان کو ابن ملجم کے ارادہ کا علم تھا۔ جس صبح کو قتل ہوا اس کی رات حضرت علیؓ نے جس طرح گذاری اس کا منفردانہ ذکر مصنف نے ان الفاظ میں کیا ہے:

"چوں شب چہار شنبہ نوزدہم رمضان امیر المومنین لسبرائے خویش از بہر نماز بپائے ایستاد دختر آں حضرت ام کلثوم دو قرصۂ نان جویں و کاسۂ از شیر در طبق نہادہ و آں طبق را با مقدارے از نمک پیش آنحضرت گذارد و امیر المومنین چوں از نماز فراغت جست و براں طبق نگہ کیست فرمود اے دختر من در یک طبق دو نان خورش حاضر می کنی مگر نمی دانی کہ براہ پسر عم خود رسول خدا میروم، مگر نمی دانی در حلال دنیا حساب ست و در حرام دنیا عذاب، سوگند بخدائے افطار نمی کنم تا ازیں دو خورش جز یکے را بجائے نگذاری؛ پس ام کلثوم شیر را برگرفت تا آں حضرت سہ لقمہ از نان جویں و نمک خورش ساخت و ابتدا بہ نماز کرد دراں شب فراواں از خانہ بیروں می شد و در آسمان می نگریست و سبحانہ باز می آمد و نماز می ایستاد، پس از تعقیب نماز اورا

[1] فتوح صفحہ ۳۲۲

خواب دررُبود ہم درزماں از خواب انگیختہ شد و گفت لاحول ولا قوۃ الا باللہ العلی العظیم خداوند مرا در لقائے خود برگرفت، اکنوں رسول خدا را در خواب دیدم و بحضرت او شکایت نمودم وازنا راستی وناہمواری ایشاں نالیدم، فرمود ایشاں را بدعائے بدیاد کن پس گفتم اے خدائے من بدہ مرا ازیں جماعت بہتر ازیں جماعت و بجائے من بشرے بے دستمگارے بر ایشاں بگمار ۔ ۔ ۔ ۔ ایں است آں شبے کہ رسول اللہ مرا وعدہ شہادت دادہ ۔ ۔ ۔ چوں بامداد نزدیک آمد امیر المؤمنین جامہ در پوشید و میاں بربست و آہنگ مسجد فرمود چوں بمیان سرائے آمد بطی چند کہ در میان سرائے بود بیرون عادت از پیش روئے امیر المومنین درآمدند و بال و پری افشاندند و بانگ می دادند، بعضے از خدام پیش شدند کہ ایشاں را برانند امیر المومنین فرمود دست باز دارید ایشاں صیحہ کنندگان اند کہ از پے نوحہ کنندگان دارند[1] ۔ ۔ ۔ ۔ ۔"

خلافت حضرت حسنؓ

ابن اعثم نے لکھا ہے کہ حضرت حسنؓ نے کتاب اللہ اور سنت نبوی پر بیعت لینے کے مروجہ طریقہ سے ہٹ کر اس بات پر بیعت لی کہ: "میں جس سے جنگ کروں اس سے تم جنگ کرو اور میں جس سے صلح کروں اس سے تم صلح کرو" اس کا مطلب یہ سمجھ میں آتا ہے کہ وہ ضرورت پڑنے پر خلافت سے دست بردار ہونے کے لئے تیار تھے، مصنف نے اس کے بعد تین خط نقل کئے ہیں، پہلا خط حضرت ابن عباسؓ نے بصرہ سے حضرت حسنؓ کے خلیفہ ہونے کے بعد لکھا اس خط میں حضرت علیؓ کی ناکامی کا سبب یہ بتایا گیا ہے کہ وہ خراج اور غنیمت کی تقسیم چھوٹے بڑے عرب وغیر عرب سب پر مساویانہ کرتے تھے اور خواص کو عوام پر اس معاملے میں کوئی ترجیح نہیں دیتے تھے، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قبائلی سردار اور خاندانی ومذہبی اکابر ان سے ناراض ہو گئے اور ان میں سے متعدد حضرت معاویہؓ سے جا ملے۔ خط میں حضرت حسنؓ کو دو[2] مشورے دئے گئے ہیں، ایک یہ کہ وہ اپنے والد ماجد کا طرز عمل چھوڑ کر مالی تقسیم میں فرق مراتب ملحوظ رکھیں اور قبائلی، خاندانی اور مذہبی اکابر کی وفاداری برقرار رکھنے کے لئے ہر قسم کی مالی رعایت روا رکھیں، دوسرے

---

[1] فتوح صفحہ ۲۲۶ - ۲۲۷

یہ کہ معاویہ سے جنگ کریں اور ہرگز ہرگز خاموش نہ بیٹھیں دوسرے دو خط حضرت حسینؓ اور معاویہؓ کے مراسلے ہیں۔ حضرت حسنؓ نے حضرت معاویہؓ کو خط بھیجا جس میں پہلے اس بے انصافی کا شکوہ کیا جو قریش نے خلافت کے معاملہ میں ان کے والد کے ساتھ کی، اس کے بعد تحریر کرتے ہیں:

"الحال در ہمہ عالم مرا برون تو ہیچ منازع نماندست و عجب دارم کہ ترا در دین سابقہ نیست و در اسلام اثرے محمود نداری چرا با ما در حق ما منازعت می کنی ..... و چوں امیر المؤمنین علیؓ در حین ارتحال امر خلافت بمن سپرد امروز خلافت و امامت ہم از وجہ اہلیت و ہم از طریق میراث حق من است، از خدا ترس اے معاویہؓ دوست از اعمال فاسدہ و اشغال باطل بدار و جانب امت سید المرسلین رعایت کن و دراں کوش کہ خونہا ر مسلماناں ریختہ نشود و کار ایشاں نظمی و نظامی گیرد"[1]

حضرت معاویہؓ نے جوابی خط میں بے انصافی کے الزام کی تردید میں دلیلیں پیش کیں اور پھر اپنے موقف کی ان الفاظ میں تصریح کی:

"اگر دانستمے کہ از من بدیں کار (خلافت) سزاوار تر و بہتر قیام توانی نمود با تو ہیچ مضایقت نکردمے و خلافت بر تو مقرر داشتمے، اما یقین میدانم کہ تو بدیں کار چنانکہ باید قیام نتوانی نمود، و دشمناں را کہ بر کنارہ اند (رومی دشمن کی طرف اشارہ) و چشم در خلافت دوختہ چنانکہ من توانم دفع کرد تو نتوانی کرد واگر ایں کار بتو تسلیم کنم مہمات مسلماناں معطل و مہمل ماند و خللہا بداں راہ یابد ..... "[2]

معلومات سے پُر اس خط و کتابت کا طبری نے کوئی ذکر نہیں کیا ہے۔ حضرت حسنؓ کی فوج کی بغاوت کا قصہ بھی دونوں کے ہاں مختلف ہے، طبری کے مطابق فوج میں یہ خبر مشتہر کر دی گئی کہ مقدمۃ الجیش رسالہ کو معاویہ نے شکست دے دی اور اس کا لیڈر قیس بن سعد بن عُبادہ مارا گیا اس خبر سے حضرت حسنؓ کی فوج پر ایسی ہیبت طاری ہوئی کہ وہ بھاگ نکلی اور حضرت حسنؓ کا خیمہ لوٹ لیا اعثم کے مطابق بغاوت کا سبب یہ تھا کہ حضرت حسنؓ نے مدائن میں جہاں وہ فوج کے ساتھ ٹھہرے ہوئے تھے ایک دن یہ تقریر کی:

---

[1] فتوح صفحہ ۲۲۹ [2] ایضاً

"اے مردمان شما با من بداں شرط بیعت کردہ اید کہ با ہر کس صلح کنم صلح کنید و با ہر کس جنگ کنم جنگ کنید، بخدا اے کہ قادر بر کمال است کہ مرا با ہیچکس بغضے وکینہ نیست واز شرق تا غرب عالم از ہیچ کس کراہتے وآزارے ندارم، وجمعیت والفت وامن وسلامت واصلاح ذات البین دوست دارم از پریشانی وتفرقہ؛ ودشمن می دارم دشمنی وعداوت را۔"

اس تقریر کو سن کر فوجیوں نے یہ نتیجہ نکالا کہ حضرت حسنؓ خلافت چھوڑنے اور حضرت معاویہؓ سے سمجھوتہ کرنے کا قصد رکھتے ہیں وہ سخت مشتعل ہوئے اور چاروں طرف سے ان پر ہجوم کر دیا، ان کے کپڑے پھاڑ ڈالے، ان کے نیچے سے قالین کھینچ لیا اور ان کا سارا سامان لوٹ لیا حضرت حسنؓ نہایت پریشاں حال گھوڑے پر سوار ہو کر نکل بھاگے، ایک شخص شہر کے کسی ویرانہ میں گھات لگا کر بیٹھ گیا اور حضرت حسنؓ جب ادھر سے گذرے تو چپکے سے نکل کر ان کی ران پر ایک وار کیا جس سے وہ بے ہوش ہو کر زمین پر گر پڑے۔[1]

۲۔ طبری وغیرہ کی طرح اعثم نے بھی یہ تسلیم کیا ہے کہ حضرت حسنؓ نے معاویہ سے جو صلح کی اس کی شرطوں میں سے ایک شرط یہ تھی کہ دارابجرد کا خراج ان کے نامزد کیا جائے اور کوفہ کے خزانہ سے دس لاکھ درہم ان کو دئے جائیں۔ اعثم نے ایک اور بات لکھی ہے جو طبری نے نہیں لکھی اور وہ یہ ہے کہ حضرت حسنؓ نے صلحنامہ میں ایک شرط یہ رکھی تھی کہ معاویہ کسی کو ولی عہد مقرر نہیں کریں گے اور مرنے سے پہلے خلافت کا مسئلہ شوریٰ کے ذریعے طے کریں گے۔[2]

حضرت معاویہؓ کی خلافت

۱۔ مصنف نے حضرت معاویہؓ کی خلافت کے حالات کوئی سترہ صفحوں میں بیان کئے ہیں، یہ ان کے اور حضرت حسنؓ کے تعلقات، ان کے گورنر زیاد بن ابیہ کے احوال وسیاست، خراسان کی فتوحات ان کی یزید کی خلافت کے لئے جدوجہد، ان کے مدینہ کے سفر اور اہل مدینہ کو بیعت کی دعوت وترغیب،

---

[1] فتوح صفحہ ۲۳   [2] فتوح صفحہ ۲۳

خلافت کے تین حریفوں (حضرت حسینؓ، ابن الزبیرؓ، عبدالرحمٰنؓ بن ابی بکرؓ) کو ہموار کرنے کی کوشش اور ناکامی، شام سے واپسی کے سفر میں لقوہ کی بیماری، بیماری کے حالات اور یزید کو بسیط وصیت پر مشتمل ہیں حضرت معاویہؓ کے وہ حالات جو ان کی اور حضرت علیؓ کی کشمکش سے متعلق ہیں حضرت علیؓ کی خلافت کے ذیل میں درج ہیں ان حالات کے ضمن میں مصنف نے کافی مواد ایسا پیش کیا ہے جو طبری، ابن الاثیر، اخبار الطوال، امامہ والسیاسۃ اور فتوح البلدان میں نہیں ہے اور جس سے حضرت معاویہ اور یزید کو زیادہ صحیح اور واضح طور پر سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے، یزید کی بیعت سے متعلقہ امور بسط کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور خراسان کی فتوحات کے سلسلہ میں جو ابہام و اجمال دوسری تاریخوں میں ہے ان کی خاصی تنقیح و توضیح بھی ہو گئی ہے۔ حضرت معاویہ کی وصیت کے چند اقتباس ملاحظہ ہوں:

"بدانکہ خلافت خدائے تعالیٰ در زمین کارے خورد نباشد وبداں قیام نتوانی نمود مگر بسہ چیز، دلے فراخ و دستے بخشندہ و خوئے نیکو و سہ چیز دیگر: علمے ظاہر و مشاہدہ زیبا و روئے کشادہ وبا ایں شش چیز دیگر باید صبر و دانائی و وقار و سکینہ و رزانت و مروت و جواں مردی و دلیری و سخن رعیت برغبت شنیدن وآنچہ گویند از مکروہ و محبوب از ایشاں تحمل کردن ... اے پسر از دنیا بحلال قانع باش و پیرامن حرام مگرد و تو درمیان رعیت قاعدۂ انصاف و مروت پدید آور، و من بر تو در کار خلافت از چہار کس می ترسم از قریش: از پسر ابوبکر عبدالرحمٰن و از پسر عمر عبداللہ و از پسر زبیر عبداللہ و از پسر علی حسینؓ، اما پسر ابوبکر مردے ست کہ ہمت او بر مباشرت زنان مقصور ست و در یاران و دوستداران خویش می نگرد، ہر چیز کہ یاران او کنند ہماں کار بدست گیرد و از دیدار زناں نشکیبد، دست از و بدار و ہر چہ او کند او را بداں گیر چہ حق پدر او در فضل و بزرگواری شنیدۂ و جانب او را رعایت کن، اما پسر عمر عبداللہ مردے سخت نیکیست از مردماں وحشتے دارد و بطاعت و عبادت باری تعالیٰ انس گرفتہ است و ترک دنیا گفتہ و بسیرت پدر می رود، در کم آزاری و عبادت و صلاح و زہادت، ہر گاہ او را بینی سلام من بدو رساں و او را مراعات کن و عطایائے وافر فرست، اما پسر زبیر عبداللہ از و بر تو بسیار ترسم زیرا کہ او مردے سخت محیل و مکار ست و رائے ضعیف داشتہ باشد و قولے باخلل کارہا از حد برد و او را صبر و ثبات مردان باشد گاہ ہیجاں

در روئے تو جہد کہ شیر گرسنہ گاہ چناں روباہ بازی پیش آورد کہ از تعجب نمائی، با او چناں زندگانی کن کہ او با تو کند مگر در دوستی رغبت نماید و با تو بیعت کند، آنگاہ او را نیکو و برقرار بگذار، اما حسین آہ آہ اے یزید چگویم در حق او زینہار او را زنجانی و بگذاری کہ ہر جا دل او خواہد رود و او را مرنجان و لاکن گاہ گاہ تہدیدے می کن، زینہار در روئے او شمشیر نکشی، چنداں کہ توانی با او حرمت دار و اگر کسے از اہل بیت او نیز دیگر تو آید مال بسیار بدو دہ و او را راضی و خوش دل باز گرداں و اے پسر چناں مباش کہ بحضرت ربانی رسی و خون حسین در گردن داشتہ باشی کہ ہلاک از تو بر آید، زینہار الف زینہار کہ حسین را زنجانی در ہیچ نوع اعتراض اذیت او نکنی، واللہ اے پسر دیدہ و شنیدہ کہ من ہر سخن کہ حسین در روئے من گفتے چگونہ تحمل کردمے[1]۔۔۔"

۳۔ اپنی قیمتی تفصیلات میں مصنف نے چند ایسی باتیں لکھی ہیں جو باہم متناقض نظر آتی ہیں، ایک طرف تو انھوں نے یہ لکھا ہے جیسا کہ ہم اوپر پڑھ آئے ہیں کہ حضرت حسن خلافت سے بالکل دستبردار ہوگئے تھے اور صلحنامہ میں انھوں نے یہ شرط رکھی تھی کہ معاویہ کی وفات سے پہلے خلافت کا معاملہ شوریٰ کے ذریعہ طے ہوگا، دوسری طرف وہ لکھتے ہیں کہ جب معاویہ نے خلافت یزید کی تحریک شروع کی تو حضرت حسن کو اس راہ میں حائل پایا اور ان کو ختم کرنے کے لئے انھوں نے مدینہ کے گورنر کو ایک زہر آلود رومال بھیجا اور لکھا کہ حضرت حسن کی بیوی جعدہ دختر محمد بن اشعث سے سازش کرے اور ان کو پچاس ہزار درہم انعام اور یزید سے شادی کی امید دلائے اور کہے کہ وہ بعد از مباشرت وجود حسن را بایں منڈیل پاک سازد، یہ بات باور کرنا مشکل ہے کہ وہ شخص جو حسن کو ایک گھناؤنی سازش سے ہلاک کراتا ہے بے اس کے بھائی حسین سے (جو خلافت کا سب سے بڑا دعوے دار تھا) حسن سلوک کے لئے یزید کو ان الفاظ میں تاکید کرے گا: "زینہار اے پسر چناں مباش کہ بحضرت ربانی رسی و خون حسین در گردن داشتہ باشی، زینہار و ہزار زینہار کہ حسین را زنجانی و بہیچ نوع اعتراض اذیت او نکنی کہ او فرزند رسول اللہ است[2]۔"

---

[1] نقوش ص ۲۰۲-۲۰۳ [2] ایضاً ص ۲۰۳

خلافت یزید

۱۔ مصنف نے یزید کی خلافت کا افتتاح مدینہ میں اس کی مہم بیعت سے کیا ہے (جس کا رخ حضرات حسین اور ابن الزبیر کی طرف تھا) اور اس کی کیفیت بڑی تفصیل سے بیان کی ہے اس تفصیل کا زیادہ حصہ حضرت حسین کے موقف، گورنر مدینہ اور مروان سے ان کی بات چیت، رسول اللہ کی قبر پر مناجات، ابن الحنفیہ کو وصیت، ابن عباس اور عبداللہ بن عمر کی پُراخلاص نصیحتوں اور مکہ روانگی سے متعلق ہے، دو صفحے اس مہم اور اس کے ردعمل پر ہیں اور چوبیس [۲۴] صفحے جنگِ کربلا، کی تمہید واقعہ اور خاتمہ کو متضمن ہیں، اس لمبے باب میں خود یزید یا اس کی حکومت کا ذکر شاید آٹے میں نمک سے بھی کم ہے۔

۲۔ مصنف نے لکھا ہے کہ گورنر مدینہ نے بیعت کے لئے جب حضرت حسین کو بلایا تو ان کی ابن الزبیر سے اس موضوع پر گفتگو ہوئی جس کے دوران میں انھوں نے کہا: میں یزید کی بیعت نہیں کروں گا کیوں کہ معاویہ نے میرے بھائی سے صلح نامہ میں عہد کیا تھا کہ اس کی وفات پر خلافت مجھے دی جائے گی[۱] یہ تصریح مصنف کی اسی متذکرہ بالا بیان سے ٹکراتی ہے جس کی رو سے صلحنامہ میں شرطیہ تھی کہ خلیفہ کا انتخاب بذریعہ شوریٰ ہی ہوگا۔

۳ مصنف نے یزید کے ایک منظوم خط کی طرف اشارہ کیا ہے جسے اس نے اہل مدینہ کے نام لکھا تھا اور جس میں حضرت حسین کی دل جوئی کے لئے الفت و محبت کی باتیں تھیں:

"دراثنا این حال از جانب یزید نامۂ رسید باہل مدینہ نامۂ منظوم شعری غایت نیکو ہر نوع سخن دراں شعر درج کردہ بود و ذکر حسین بن علیؑ بہ نیکوئی کردہ و خویشاوندی و قرابت خویش با او برشمردہ و شمۂ از مناقب و فضائل و شرف خاندان و محاسن اخلاق و مکارم اعراق حسین شرح دادہ، و التماس موافقت و فرونشاندن آتش جنگ و بہر دوستی و رضا آمدن و ایں معنی در شیوۂ اطناب پرداختہ"[۲]

---

[۱] فتوح ص۲۵۹ [۲] فتوح ص۲۶۲

۴۔ مصنف نے متعدد حدیثیں حضرت حسینؓ کی زبانی بیان کی ہیں جن میں رسول اللہ نے ان کی شہادت کی خبر دی تھی اور جن کو وہ اُن قریب ترین عزیزوں اور بہی خواہوں کے سامنے برہان قاطع کے طور پر پیش کرتے تھے جو انھیں کوفہ جانے سے روکتے تھے۔ یہ حدیثیں راویوں کی طبع زاد معلوم ہوتی ہیں (جن سے یہ ثابت کرنا مقصود ہے کہ واقعۂ کربلا، ایک شدنی امر تھا جس کی نشان دہی رسول اللہ کر چکے تھے)، کیونکہ اگر ان کو مان لیا جائے تو رسول اللہ کا غیب داں ہونا لازم آتا ہے جس کی نفی قرآن کے ان الفاظ میں ہو چکی ہے: وَلَوْ كُنْتُ أَعْلَمُ الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوءُ

۵۔ واقعات کربلا میں حضرت حسینؓ کی بددعاؤں کا بھی ذکر ہے جن کے زیرِ اثر کئی آدمی میدان جنگ میں نقصان اُٹھاتے ہیں؛ شہادت کے بعد ان کے ہتھیاروں اور لباس کو جس جس نے لوٹا اور استعمال کیا ان میں سے ہر ایک کسی نہ کسی مرض میں مبتلا ہوا۔ کوفہ کے محل میں گورنر عبید اللہ بن زیاد نے ان کا سر اٹھایا تو اس کا ہاتھ کانپا اور اس کی ران پر گر پڑا حضرت حسینؓ کے منہ سے ایک قطرۂ خون ٹپکا جو اس کے کپڑوں سے ہوتا ہوا ران تک پہنچا اور اس سے ران میں ایک ناسور ہو گیا جو کبھی اچھا نہ ہوا۔ یہ اور اس قسم کی روایتیں مصنف نے جوشِ عقیدت میں بیان کی ہیں۔ رہے کربلا کے واقعات وحوادث تو وہ مشہور تاریخی کتب کے بیان کردہ وقائع کے مطابق ہیں بلکہ یہ کہنا زیادہ صحیح ہوگا کہ اعثم نے اس باب میں بھی دیگر کتابوں سے زیادہ تفصیلات پیش کی ہیں اور جو امور دیگر تواریخ میں تشنہ یا مبہم رہ گئے ہیں ان کی تنقیح و توضیح کر دی ہے۔

حالات حاضرہ

ایران کی صورتِ حالات

(جناب اسرار احمد صاحب آزاد ایڈیٹر جدوجہد انبالہ)

مستعمرین مغرب، جمہوریت پسندی، امن خواہی اور مساواتِ اقوام کے بلند بانگ دعووں کے باوجود اصولِ جمہوریت امن اور مساوات کی بیخ کنی کے لئے جو کچھ کر رہے ہیں آج خصوصیت کے ساتھ اس کا اندازہ ان افسوس ناک واقعات و حالات سے بخوبی کیا جا سکتا ہے جو پاکستان سے لے کر شمالی افریقہ کے فرانسیسی مقبوضات تک رونما ہو رہے ہیں۔ پھر اسی قدر نہیں بلکہ اس طویل خطۂ ارض کا جو حصہ بھی مغربی مستعمرین کے زاویۂ نظر سے وقتی یا مستقل طور پر جس قدر زیادہ اہمیت رکھتا ہے ان کی معکوس توجہات اس حصہ پر اسی قدر زیادہ مرکوز رہتی ہیں۔

مثال کے طور پر ایران ہی کو لے لیجئے۔ یہ چھوٹا سا ملک نہ صرف عسکری نقطۂ نظر ہی سے غیر معمولی اہمیت رکھتا ہے بلکہ اس کے تیل کے چشموں نے اسے سرمایہ دارانِ مغرب کی حرص و آز کا آماجگاہ بنا رکھا ہے اور آج سے تین سال قبل ڈاکٹر مصدق کی حکومت نے ایرانی تیل کی پیداوار اور صنعت کو قومی ملکیت بنا کر قومی ترقی اور استحکام کی راہ پر جو مؤثر قدم اٹھایا تھا آج ڈاکٹر حسین فاطمی اور دوسرے قوم پروروں کی موت اور ہلاکت کی صورت میں اس کی پاداش بھگتنی پڑ رہی ہے۔

ایران کی موجودہ صورتِ حال یہ ہے کہ تین سال قبل ایرانی مجلس اور سینٹ نے ایرانی تیل کی پیداوار اور صنعت کو قومی ملکیت بنانے کا جو فیصلہ کیا تھا جنرل زاہدی کی حکومت نے عملاً اسے مسترد کر دیا ہے اور اگرچہ ایران کے تیل کی صنعت براہ راست اینگلو ایرانین آئل کمپنی کی زیرِ ملکیت منتقل نہیں ہوئی لیکن وہ امریکہ، برطانیہ، فرانس اور ہالینڈ کی آٹھ تجارتی کمپنیوں کے ایک بین اقوامی گروہ کے قبضہ میں ضرور چلی گئی ہے اور اس گروہ کے ساتھ آیندہ پچیس سال کے لئے ایرانی حکومت کا جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے تیل کو ایرانی قومی ملکیت بنانے کے فیصلہ کی ایک دفعہ کے برعکس تیل کو صاف اور

فروخت کرنے کی ذمہ داری دو غیر ملکی کمپنیوں پر عاید کی گئی ہے۔ اینگلو۔ایرانین آئل کمپنی کی طرف ۹۴ ملین پاؤنڈ کا جو قرضہ واجب الادا تھا اسے کالعدم قرار دے دیا گیا ہے اور تیل کی صنعت کو قومی ملکیت بنا دیے جانے کے بعد اینگلو ایرانین آئل کمپنی کو جو مفروضہ نقصان پہنچا ہے اس کے ازالہ کے طور پر حکومت ایران کو ۲۵ ملین پونڈ ادا کرنے کا پابند بنا دیا گیا ہے اور اس طرح ایرانی عوام کو جو گذشتہ چند سال کی مدت میں اپنے عزیز وطن کو مغربی ملوکیت پسندوں اور سرمایہ داروں کی گرفت سے نجات دلانے کی جد و جہد کرتے رہے ہیں اور اپنی اس جد و جہد میں ایک حد تک کامیاب بھی ہو چکے تھے ایک مرتبہ اقتصادی اعتبار سے مغربی مستعمرین کا غلام بنا دیا گیا ہے۔ پھر مذکورہ بالا آٹھ کمپنیوں کے مابین جو معاہدہ ہوا ہے اس کی رو سے اینگلو ایرانین آئل کمپنی ۴۰ فی صد کی مالک قرار پائی ہے۔ رائل ڈچ شیل (ہالینڈ) کا حصہ ۱۴ فی صد مقرر ہوا ہے۔ اور باقی چھ کمپنیاں ۴۶ فی صد میں شریک ہیں۔ اس طرح آج ایران کی یہ قومی صنعت برطانوی سرمایہ داروں کے ہی اجارہ داری میں نہیں رہی، بلکہ اس میں امریکہ، فرانس اور ہالینڈ کے سرمایہ دار بھی حصہ دار بن گئے ہیں۔

یہ امر محتاج بیان نہیں کہ موجودہ دور میں، اقوام و ممالک کی تمام تر سیاسی زندگی کا انحصار ان کے اقتصادی حالات پر ہے اور آج کسی ملک یا قوم کی اقتصادیات پر غیر ملکی سرمایہ داروں کا غلبہ اور اقتدار اس ملک یا قوم کی سیاسی محکومیت کا پیش خیمہ سمجھا جاتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں اس طرح کہا جا سکتا ہے کہ بین اقوامی سرمایہ داروں کے مذکورہ بالا گروہ کے ساتھ ایران کی حکومت نے جو معاہدہ کیا ہے اس کی بدولت اس ملک کی اقتصادیات پر غیر ملکی سرمایہ داروں کا غلبہ ہو گیا ہے جس کے نتیجہ میں ایک طرف تو ایران کی حکومت خود اپنی قومی تعمیر اور ترقی کی راہ پر اس لئے کوئی مؤثر قدم نہیں اٹھا سکتی کہ اس سے فریق ثانی کے مفاد کو نقصان پہنچنے کا اندیشہ ہوگا اور دوسری طرف مذکورہ بالا سرمایہ داروں کا گروہ اپنے مفاد کے تحفظ کے لئے ایران میں اپنی عسکری قوت کو مستحکم اور ملک کے نظم و نسق کو اپنی ضرورتوں کے مطابق بنانے کے لئے اس پر غلبہ پانے کی ہر ممکن کوشش بھی کریں گے۔ اور ظاہر ان تمام باتوں کا انجام ایرانی عوام کی محکومیت نہیں تو کم از کم

نیم محکومیت کی شکل میں برآمد ہوگا۔

آج مشرقِ قریب اور مشرقِ وسطیٰ کے مسلمان ممالک میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کا تذکرہ ایک طویل داستان کی حیثیت رکھتا ہے اور "برہان" کی محدود گنجائش میں اس طویل داستان کو بیک وقت بیان کر دینا ممکن نہیں ہو سکتا لیکن اس سلسلہ میں اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ دنیا کے دوسرے حصّوں میں آج ملوکیت اور سرمایہ داری کو جو شکست اور پسپائی نصیب ہوئی ہے اس نے ایک نیا امن اور مستقر تلاش اور قائم کرنے پر مجبور بنا دیا ہے اور چونکہ ان کی خوش نصیبی سے بیشتر مسلم ممالک ابھی تک پسماندہ ہیں اور اس پسماندگی کی بدولت، ان ممالک میں انھیں ایسے افراد بھی مل سکتے ہیں جنھیں آلۂ کار بنانا کچھ مشکل کام نہیں اس لئے اب ان مغربی سرمایہ داروں اور استعمار پسندوں کی تمام تر توجہات مسلم ممالک پر مرکوز ہے اور وہ ان ممالک کے باشندوں کو مذہب کے تحفظ، اقتصادی اور عسکری امداد، تجارتی ترقی اور قومی تعمیر کے سبز باغ دکھا کر ان ممالک کو نہ صرف اپنی عسکری قوت و طاقت کا مستقر ہی بنا لینا چاہتے ہیں بلکہ ان ممالک کی "معدنی دولت" اور "تجن شکتی" سے بھی پورا پورا فائدہ اٹھانے کے خواہشمند ہیں لیکن جہاں تک ان ممالک کے عوام کا تعلق ہے وہ مغربی مستعمرین کی ان فریب کاریوں سے بخوبی واقف ہو چکے ہیں اور اس طویل خطۂ ارض کے کروڑوں باشندے اپنی قومی آزادی کے لئے جو جد وجہد کر رہے ہیں، مغربی ملوکیت پسندوں کی طرف سے، ایران سے لے کر مراقش اور الجیریا تک اسے کچلنے کی کوشش بجائے خود اس جد وجہد کی ترقی اور کامیابی کا بیّن ثبوت ہیں۔

رہنمائے قرآن

اسلام اور پیغمبرِ اسلام صلعم کے پیغام کی صداقت کو سمجھنے کے لئے اپنے انداز کی یہ بالکل جدید کتاب ہے جو خاص طور پر غیر مسلم یورپین اور انگریزی تعلیم یافتہ اصحاب کے لئے لکھی گئی ہے۔ جدید ایڈیشن قیمت ایک روپیہ

ادبیات

غزل

از

(جناب الم مظفر نگری)

اسی ذرے میں ظرفِ آسماں باقی نہیں رہتا
جسے خورشید سے ربطِ نہاں باقی نہیں رہتا

سوائے دل کوئی جب رازداں باقی نہیں رہتا
من و تو کا حجابِ درمیاں باقی نہیں رہتا

تصرف چاہتا ہے جو چمن کے پتے پتے پر
اسے فکرِ حدودِ آشیاں باقی نہیں رہتا

پیامِ وصل بن جاتی ہے جب دل کی ہر اک دھڑکن
تو پھر لطفِ نویدِ ناگہاں باقی نہیں رہتا

خزاں میں بھی نظر رکھتے ہیں گلشن پر نظر والے
اگرچہ لطفِ سیرِ گلستاں باقی نہیں رہتا

مری پرواز کی وہ پہلی منزل ہے جہاں کوئی
نشانِ سرحدِ کون و مکاں باقی نہیں رہتا

سبک پرواز منزل سے سبک ہو کر گزرتے ہیں
گلوں پر شبنمِ ترکا نشاں باقی نہیں رہتا

فنا سے پیشتر ہی جو فنا فی الذات ہو جاتے
دو عالم میں بتاؤ وہ کہاں باقی نہیں رہتا

محبت اس گھڑی بھی رازداں اس کو سمجھتی ہے
جب اس کو اعتبارِ رازداں باقی نہیں رہتا

نہیں ہوتا گزر برقِ تپاں کا حسن گلستاں میں
وہاں پھولوں میں رنگِ جاوداں باقی نہیں رہتا

نیازِ عشق میں ذوقِ خودی ہوتا ہے جب پیدا
تو پھر فرقِ جبین و آستاں باقی نہیں رہتا

نظر ہوتی ہے حائل یا کہ جلوہ وقتِ نظارہ
کہوں کیوں کر حجابِ درمیاں باقی نہیں رہتا

الم اک بے حقیقت شے ہے دل والوں کی آنکھوں میں
وہ دل جس میں کہ عزمِ نوجواں باقی نہیں رہتا

حسن تغزل

از

(جناب راحت مولائی ایم۔ اے۔ ال۔ بی (علیگ))

اٹھ رہا ہے چمن میں تلاطم
لٹ نہ جائے کلی کا تبسم

محوِ گفتار ہیں ماہ و انجم
آؤ بچ کر گذر جائیں ہم تم

ان کے لب پر وہ رنگیں ترنم — جیسے بوندیں برستی ہوں رُم جھم
یوں محبت میں کھو جائیں ہم تم — جیسے نغمے فضاؤں میں ہوں گم
ان کے ہونٹوں پہ موج تبسم — میرے سینہ میں بہم تلاطم
ان کی ناز آفریں خامشی میں — کروٹیں لے رہا ہے تکلم
تیز ہونے لگی دل کی دھڑکن — آنکھوں آنکھوں میں کیا کہہ گئے تم
ان کی آنکھوں سے ڈھلکے ہیں آنسو — یا فلک سے گرے ماہ و انجم

کون گذرا یہ راحتؔ فلک سے
کس کو تکنے لگی چشم انجم

غزل

از

(جناب برج لال جگی رعناؔ)

وہ نظر جب پڑی کرن کی طرح — غنچۂ دل کھلا چمن کی طرح
اب تو آتی ہے دل میں یاد ان کی — ایک شرمائی سی دلہن کی طرح
کتنی مشکل ہے کتنی نازک ہے — زندگی فن ہے اک سخن کی طرح
عیشِ رفتہ کی یاد آتی ہے — ڈوبتے چاند کی کرن کی طرح
زندگی کا یہی تقاضا ہے — مل کے رہئے تو روح و تن کی طرح
پوچھئے ان سے حال غربت کا — ہیں وطن میں جو بے وطن کی طرح
باغباں کو عزیز ہوتے ہیں — خار و خس بھی گل و سمن کی طرح
غم میں ہوتی ہے چاندنی محسوس — ملگجی چادرِ کفن کی طرح
دیکھتے دیکھتے چمن کا رنگ — اُڑ گیا بوئے یاسمن کی طرح
آج تک یاد صحبتِ احباب — دل میں باقی ہے اک چبھن کی طرح
اللہ اللہ یہ فکر جلوہ طراز — میری خلوت ہے انجمن کی طرح
کچھ ٹھکانہ نہیں زمانے کا — ان حسینوں کے بانکپن کی طرح
روز افزوں ہے کیفِ حسنِ غزل — نشۂ بادۂ کہن کی طرح

غم سے لرزاں ہے ہر نفس رعناؔ
شعلۂ شمع انجمن کی طرح

رُباعیات

(جناب طالب جےپوری)

وہ سبزۂ بیگانہ جو لہراتا ہے
خاموش اشاروں سے یہ سمجھاتا ہے
نخوت سے مجھے روندنے والو ہر گام
اپنا بھی تمہیں حشر نظر آتا ہے

دنیا سے گذرنا ہے تو درّانہ گذر
پستی سے اُبھرنا ہے تو مردانہ اُبھر
جینا ہے تو مردوں کی طرح ٹھاٹ سے جی
مرنا ہے تو شیروں کی طرح شان سے مر

افلاس میں بھی بے سرو ساماں نہ رہا
میں بے سرو سامانی پہ نالاں نہ رہا
ہر تلخئ دوراں کو نوازا میں نے
مجھ سے ہی مگر خوش کبھی دوراں نہ رہا

انسان کا دنیا سے حذر مشکل ہے
ہر شئے سے کرے قطع نظر مشکل ہے
آساں ہے شراروں سے بچانا دامن
شبنم کا شراروں میں گذر مشکل ہے

پاکیزگئ دل کا فسانہ اچھا
باطن کی صفائی کا ترانہ اچھا
مے پی کہ نہیں آنا ہے پھر دنیا میں
تو خوش ہے تو پھر سارا زمانہ اچھا

آہِ دلِ سوزاں کو کروں کیا اے دوست
ضبطِ غمِ پنہاں کو کروں کیا اے دوست
دنیائے تصور تو سجاؤں تجھ سے
بے کیفئ دوراں کو کروں کیا اے دوست

تبصرے

چند نظمیں از پنڈت برجموہن دتاتریہ کیفی تقطیع خورد ضخامت ۶۹ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ایک روپیہ پتہ:- کتب خانہ انجمن ترقی اردو جامع مسجد دہلی

پنڈت کیفی جس طرح اردو زبان کے نامور محقق، مصنف اور انشا پرداز ہیں۔ اسی زبان کے شگفتہ بیان شاعر بھی ہیں اس مجموعہ میں موصوف کی چند نظمیں ان کے تازہ کلام سے منتخب کرکے جمع کی گئی ہیں یہ نظمیں قومی، ملکی اور سماجی و معاشرتی مسائل پر لکھی گئی ہیں جن سے شاعر کی محبتِ انسانی اور ہمدردی وغم گساری کے جذبات نمایاں ہیں پھر زبان وبیان کا کیا کہنا اس کے لئے کیفی صاحب کا نام سب سے بڑی ضمانت ہے۔ اس طرح یہ نظمیں ادبی شاہکار بھی ہیں اور سبق آموز وعبرت آفریں بھی! ان کا مطالعہ ہر ایک اردو داں کو کرنا چاہئے،

جناب رحمت قطبی صاحب جنہوں نے بڑی محنت اور اخلاص سے یہ نفیس اور متبرک مجموعہ شائع کیا ہے ارباب ذوق کی طرف سے شکریہ کے مستحق ہیں۔

انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج وزوال کا اثر از مولانا سید ابوالحسن علی ندوی تقطیع متوسط ضخامت ۳۱۴ صفحات، طباعت وکتابت بہتر قیمت مجلد للعہ چار روپیہ بارہ آنہ پتہ:- مکتبہ اسلام گوئن روڈ لکھنؤ۔

اسلام کسی خاص فرقہ یا گروہ۔ یا کسی ایک مخصوص ملک وقوم کا نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کا صالح ترین نظام اجتماع وزندگی ہے اور جس طرح اس نظام کا داعی آخرالزماں رحمۃ للعالمین تھا اسی طرح یہ نظام بھی دنیا کے سب انسانوں کے لئے سرتا سر خیر وبرکت تھا جن خوش نصیب لوگوں نے اس پیغام ربانی کو قبول کیا قرآن مجید میں ان کو " امۃ وسطا" اور " شہداء علی الناس" کے لقب سے سرفراز فرما کر اس حقیقت کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ جس دولت ونعمت سے وہ خود

شاد کام و بہرہ اندوز ہوتے ہیں اب ان کا فرض ہے کہ وہ اس کو دوسروں تک بھی پہنچائیں چنانچہ جب مسلمانوں نے اس پر عمل کیا تو دنیا میں یکایک انقلاب عظیم پیدا ہوگیا، فاسد تہذیب و تمدن اور جاہلانہ نظامِ اجتماع کی جگہ صالح اور عادل نظام قایم ہوگیا۔ اور سب نے اس سے فائدہ اٹھایا لیکن آخر جب قیادت مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر اقوامِ یورپ کے ہاتھ میں پہنچ گئی تو جاہلیت کا غلبہ پھر اسی طرح ہوگیا۔ چنانچہ ہر سلیم الطبع اور بے تعصب انسان محسوس کر رہا ہے کہ اگرچہ انسان مادی ترقی کے اعتبار سے آج اس اونچی سطح پر ہے جہاں اس سے پہلے کبھی نہیں تھا لیکن چونکہ معاشرہ کی بنیاد سرتا سر لادینی افکار پر ہے اس لئے یہ ترقیات کسی وقت بھی بنی نوع انسان کی ہلاکت و بربادی کا سبب بن سکتی ہیں۔ زیر تبصرہ کتاب میں فاضل مصنف نے جو ہندوستان کے ممتاز عالم و مفکرِ اسلام مشہور صاحب قلم اور عربی اور اردو دونوں زبانوں کے نامور ادیب ہیں، آغازِ اسلام سے اب تک کی اسی داستان کو بڑی خوبی اور عمدگی کے ساتھ بیان کیا ہے اگرچہ کتاب اپنے مقصد کے لحاظ سے تبلیغی ہے۔ لیکن جو کچھ لکھا گیا ہے خالص علمی اور تاریخی حقایق و واقعات کی بنیاد پر مستند حوالوں کے ساتھ لکھا گیا ہے۔ اس بناء پر اس کی حیثیت ایک بلند پایہ علمی اور تاریخی کتاب کی بھی ہے۔ فاضل مصنف نے پہلے مشرق و مغرب کے ملکوں کی تاریخ کا وسعتِ نظر کے ساتھ جائزہ لے کر یہ بتایا ہے کہ چھٹی صدی عیسوی میں یعنی اسلام کی دعوت کے آغاز میں انسانی معاشرہ۔ اجتماعی۔ تہذیبی اور اخلاقی سیاسی و مذہبی اعتبار سے کس درجہ زبوں حال تھا پھر یہ دکھایا ہے کہ جب اسلام آیا تو اس نے کس طرح ایک ایک شعبۂ زندگی کی اصلاح کی اور اس اصلاح کے کیا نتایج ہوئے، اس کے بعد جب مسلمان خود انحطاط و زوال کا شکار ہوگئے تو اس سے انسانی معاشرہ کو کیا کیا عظیم نقصانات پہنچے اور کیوں پہنچے اصل کتاب عربی میں تھی جو ممالک عرب میں بڑی مقبول ہوئی اور ہاتھوں ہاتھ لی گئی۔ زیر تبصرہ کتاب اسی کا اردو قالب ہے مگر ترجمہ نہیں۔ بلکہ خود مستقل بالذات لکھی ہوئی، کتاب صرف مسلمانوں کے پڑھنے کی نہیں بلکہ عمرانیات و اجتماعیات کے ہر طالب علم کو اس کا مطالعہ کرنا چاہیے کہ جس طرح وہ افلاطون کے نظریۂ جمہوریت، اور ارسطو کے نظریۂ ریاست و مملکت پر غور کرتے ہیں اسی طرح اسلام کے نظریۂ

اجتماع و تمدن پر غور کرنا ان کا علمی فریضہ ہے:

مینا بازار | مرتبہ و مصححہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی استاد عربی و فارسی الہ آباد یونیورسٹی تقطیع کلاں ضخامت ۱۳۱ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ پتہ:- منیجر اسرار کریمی پریس الہ آباد

اب تو غالباً کم لوگ اس کتاب کے نام سے واقف ہوں گے۔ لیکن ایک زمانہ تھا جب کہ کتاب "وقائع نعمت خان عالی" "انشائے ابوالفضل" اور "سہ نثر ظہوری" کی طرح یہ کتاب ادبیات فارسی کے نصاب درس میں شامل تھی۔ اور گھر گھر پڑھی جاتی تھی۔ اکبر نے جس زنانہ بازار کی طرح نو ڈالی تھی اس کتاب میں اسی کے حالات اس طرح بیان کئے ہیں کہ ہر دوکاندارنی مثلاً عطار، حلوائی، گل فروش۔ سبزی فروش وغیرہن اس کی اپنی شخصیت اور اس کی دکان اور دکان کی چیزوں کی نقاشی اس عہد کی مروجہ زبان و انداز بیان میں کی گئی ہے۔ ڈاکٹر محمد احمد صاحب نے اسی رسالہ کو محنت اور توجہ سے اڈٹ کر کے شایع کیا ہے شروع میں ایک مفصل مقدمہ ہے جس میں کتاب کی وجہ تسمیہ کی تحقیق۔ مصنف کی تعیین وغیرہ کے مسئلہ کی تحقیق کی ہے اور پھر اصل متن کے بعد رسالہ کا اردو ترجمہ مع تشریحی نوٹوں کے لکھا ہے۔ اب یہ کتاب اس لایق ہے کہ کالجوں اور مدارس عربیہ کے اعلیٰ نصاب فارسی میں شامل کی جائے۔

مقالہ در مسئلہ وحدت الوجود | مرتبہ ڈاکٹر محمد احمد صدیقی تقطیع خورد ضخامت ۲۳ صفحات طباعت و کتابت بہتر پتہ:- مطبع اسرار کریمی الہ آباد۔

شیخ اکبر حضرت محی الدین ابن العربی جو اکابر صوفیائے اسلام میں سے ہیں اپنے نظریۂ وحدت الوجود کی وجہ سے مخالفوں کے ہدف مطاعن ہیں۔ شیخ کی حمایت میں جن علماء نے کتابیں لکھیں انھیں میں ایک عالم شیخ مکی نے اب سے ساڑھے چار سو برس پہلے سلطان سلیم خاں بن بایزید خاں کے حکم سے ایک رسالہ فارسی زبان میں لکھا تھا۔ اتفاق سے ڈاکٹر محمد احمد صاحب کو اس رسالہ کا ایک ناتمام نسخہ کہیں سے دستیاب ہو گیا۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اس کو مختصر تشریحی نوٹوں کے ساتھ اڈٹ کر کے شائع کر دیا۔ یہ رسالہ وہی ہے جو اگرچہ مختصر ہے لیکن اس سے اصل موضوع بحث کے موافق اور مخالف دونوں

قسم کے مختلف علمی پہلو سامنے آجاتے ہیں۔ اس حیثیت سے جن حضرات کو اس موضوع کے ساتھ دلچسپی ہے یہ رسالہ ان کے مطالعہ کے لائق ہے۔

اسلامی عقائد اور سائنس | از مولوی عزیز احمد قاسمی بی۔ اے جامعہ تقطیع خورد ضخامت ۵۶ صفحات کتابت وطباعت بہتر قیمت ۸؍ پتہ :- ادارہ ...

سائنس کے کسی طالب علم نے لائق مصنف سے بعض اسلامی عقائد کے بارہ میں چند سوالات کئے تھے یہ رسالہ انھیں سوالات کے جوابات پر مشتمل ہے۔ جن میں وجود باری۔ تجسیم الٰہ اور بعض صفات باری پر سائنس کی زبان میں گفتگو کی گئی ہے۔ اس موضوع پر انگریزی زبان میں ضخیم مجلدات موجود ہیں اور علمائے سائنس و فلسفہ نے خود ان مسائل پر بڑی دادِ تحقیق دی ہے تاہم اردو میں بھی سائنس کے طلبار کو انھیں کے اندازِ فہم وفکر کے مطابق ذات باری تعالیٰ سے متعلق اسلامی عقائد کو سمجھانے کے لئے یہ رسالہ بھی بہت مفید ہوگا۔

برہان

جلد ۳۳ شمارہ ۶

دسمبر ۱۹۵۴ء مطابق ربیع الثانی ۱۳۷۴ھ

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

نظرات

مدارس عربیہ کے لئے ایک لمحۂ فکر

از

(سعید احمد اکبرآبادی)

(۴)

حدیث قرآن مجید کے بعد حدیث کا مرتبہ ہے اور احکام و مسائل کے استنباط کی دوسری اصل ہے۔ اس بنا پر علوم دینیہ میں اس کی اہمیت اس حد تک ہے کہ دینی تعلیم کا کوئی تصور اس کے بغیر مکمل ہو ہی نہیں سکتا۔ اس کی تعلیم کی غرض و غایت کیا ہے؟ اس کا جواب معلوم کرنے کے لئے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ حدیث ہے کیا؟

چونکہ حدیث سے یہاں مراد وہ تمام روایات ہیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابۂ کرام سے متعلق ہم تک پہنچی ہیں جن کو اصطلاحاً آثار کہتے ہیں اس بنا پر حدیث بنفسہٖ ایک اصلِ شریعت بھی ہے اور تاریخ بھی۔ وہ ایک مستقل حکم بھی ہے اور احکامِ قرآنیہ کی توضیح و تشریح بھی اور چونکہ اسلام ایک عالم گیر اور آخری دین الٰہی ہے اور زندگی کے ہر شعبہ کے لئے ہر زمانہ اور ہر مکان کے واسطے۔ ہر گروہ اور ہر قوم کے لئے اس میں یکساں آسان اور لیسیر العمل احکام موجود ہیں اس بنا پر حدیث کو ان تمام احکام کا منبع ہونا چاہیئے۔ انسانی نظر و فکر، اور انسانی مزاج و طبیعت، خواہ تہذیب و ترقی کی کسی منزل میں ہو۔ اور انسان کی حیاتِ اجتماعی و تمدنی سے متعلق افکار و نظریات میں خواہ کیسا ہی انقلاب و تغیر ہو لیکن اگر اسلام دینِ قیم ہے تو بے شبہ صرف اسی کا ایک نظریہ ایسا ہونا چاہیئے جو دنیا کے تمام افکار و نظریات کے بالمقابل ایک بُنیانِ مرصوص کی طرح قائم رہے اور ظاہر ہے کہ یہ نظریہ قرآن میں مل سکتا ہے یا حدیث

میں اور چوں کہ قرآن کی حیثیت ایک متن کی ہے اس بنا پر انسان کی حیاتِ اجتماعی سے متعلق اسلام کے افکار و نظریات کا سراغ وضاحت اور عملی تمثیلات کے ساتھ حدیث میں ہی مل سکتا ہے! چنانچہ ایسا ہی ہے بھی!

حدیث کی یہ حیثیت ذہن نشین کرنے کے بعد یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ حدیث کی تعلیم کی غرض و غایت کیا ہونی چاہیے یعنی یہ کہ ایک ہمہ گیر اور جامع نقطۂ نظر کے ساتھ اسلامی احکام و مسائل کے اصل سرچشمہ تک ہماری رسائی ہو سکے۔ علاوہ بریں ہم کو یہ حقیقت بھی نہ بھولنی چاہیے کہ حدیث جہاں تشریعی حیثیت رکھتی ہے۔ ساتھ ہی وہ تاریخِ تشریع اور طریقِ تشریع بھی ہے، یعنی اس سے جہاں خاص خاص مسائل کے متعلق احکام مستنبط ہوتے ہیں جو کتبِ فقہ میں مدون و مرتب ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اگر آئندہ زمانہ میں کبھی کسی وقت کچھ ایسے مسائل پیش آئیں جو عہدِ نبوت میں یا عہدِ صحابہ میں پیش نہیں آئے تھے تو ان کے لئے از روئے قرآن و حدیث کیا احکام ہوں گے۔ اسی بنا پر محدثین نے۔ تحقیقِ مناط، تخریجِ مناط اور تنقیحِ مناط کی بحثیں کی ہیں اور استنباطِ احکام و مسائل کے جو اصول کتبِ اصول فقہ میں مذکور و مدوّن ہیں ان کی بنیاد۔ جہاں تک حدیث کا تعلق ہے، حدیث کے اسی پہلو سے ہے،

ظاہر ہے کہ حدیث کا مطالعہ اگر اس نقطۂ نظر کے ساتھ کیا جائے تو کوئی شبہ نہیں کہ وہ قرآن کے ساتھ مل کر انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا ایک ایسا جامع۔ ہمہ گیر اور مکمل قانون و نظام بن جاتی ہے کہ کوئی شعبۂ حیات اس کی رہنمائی سے محروم نہیں رہ جاتا۔

لیکن افسوس ہے کہ ہمارے مدارسِ عربیہ میں حدیث کی تعلیم جس انداز پر ہوتی ہے وہ اس مقصد کو پورا نہیں کرتی۔ کیونکہ اس میں حسب ذیل نقائص ہیں۔

(۱) سب سے پہلا نقص جس کی طرف شروع میں بھی اشارہ کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ حدیث کو بحیثیت اصلِ احکام کے نہیں پڑھایا جاتا۔ بلکہ اس کو فقہ کے تابع کر کے پڑھایا جاتا ہے۔ استاذ جس مسلکِ فقہ کا پابند ہے وہ احادیث کی تاویل و توجیہ اسی کے مطابق کرے گا۔

(۲) حدیث میں صرف عبادات یا ایمان وعقائد کے ابواب پر تمام زورِ تبحر وکمال خرچ کر دیا جاتا ہے اور اس کا حاصل بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ استاذ جس مسلکِ فقہ کا پابند ہے اس کو دوسرے مسالک پر ارجح وافضل ثابت کرے۔ عام طور پر مدارس میں صحاح ستہ ایک ہی سال میں پڑھائی جاتی ہیں؛ مگر اس طرح کہ سال کا ایک بڑا حصہ چند ابواب میں ختم ہو جاتا ہے اور باقی دنوں میں قرأۃ علی الشیخ یا قرأۃ الشیخ کی صورت میں تمام کتابیں ختم کر دی جاتی ہیں۔ پھر مدارس میں حدیث کے امتحان کے جو پرچے ہوتے ہیں ان کو دیکھئے تو وہی چند لگے بندھے سوالات ہیں جو گھوم پھر کر آگے پیچھے آتے رہتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا سب سے عظیم نقصان یہ ہے کہ ایک عالمِ قرآن وحدیث کو اپنے تہذیب یافتہ اور ترقی پذیر دور میں جس قدر وسیع النظر، دقیقہ رس اور نکتہ شناس ہونا چاہیے وہ نہیں ہوتا اور بزمِ علوم وفنون میں بیٹھ کر وہ اسلام کی نمائندگی کرتے میں جھجک محسوس کرتا ہے۔

(۳) احادیث کے درس میں زیادہ زور کلامی مباحث پر صرف کیا جاتا ہے یا عبادات سے متعلق فقہی مسائل پر۔ مثلاً یہ کہ ایمان میں تشکیک ہوتی ہے یا نہیں، وہ زیادت اور نقصان کو قبول کرتا ہے یا نہیں۔ امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنی چاہیے اور آمین بالجہر کہنی چاہیے یا نہیں؟ لیکن اجتماعی زندگی سے متعلق سینکڑوں ہزاروں نہایت اہم نفسیاتی اور اخلاقی نکتے ہیں جو تبنی صادق ومصدوق کی زبانِ حق ترجمان سے ادا ہوئے ہیں ان کی طرف کوئی دھیان تو کیا دیا جاتا۔ ان کی طرف ذہن کا انتقال بھی نہیں ہوتا۔ علوم وفنونِ جدیدہ اور عصرِ حاضر کے افکار ونظریات نے اجتماعی زندگی کے ان پہلوؤں کو آج ابھار کر اس طرح دنیا کے سامنے پیش کر دیا ہے کہ اب یہی افکار انسانی سوسائٹی کے نظامِ حیات کی اہم بنیاد قرار پا رہے ہیں اور ان کی وجہ سے دنیا کا نقشہ ہی بدلتا چلا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے علما کو چونکہ انسانی فکر وشعور کے اس انقلابِ عظیم اور اس کے محرکات کی خبر ہی نہیں ہے اس بنا پر نہ یہ مسائل ان کے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں اور نہ ان کو قرآن وحدیث میں ان مسائل کا حل تلاش کرنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ مثلاً کارل مارکس نے سالہائے دراز کی محنت اور غور وفکر کے بعد اقتصادیات میں ایک نیا نقطۂ خیال ایجاد کیا جس کو Dynamic Economy (متحرک اقتصادیات) کہتے ہیں۔ اس فلسفہ کا جو بنیادی پس منظر ہے یعنی یہ کہ سرمایہ کی تقسیم مساویانہ ہونی

چاہئے اور محنت اور سرمایہ کے معاوضہ میں توازن ہونا چاہئے ورنہ اگر ایسا نہیں ہوگا تو طبقاتیت پیدا ہوگی اور اس کی وجہ سے دنیا کا امن وامان اور انسانی زندگی کا سکون تباہ و برباد ہو جائے گا۔ یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کو خود اسلام بھی تسلیم کرتا ہے۔ کارل مارکس نے جس حقیقت کو سینکڑوں صفحات میں بیان کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے "کاد الفقر یکون کفرا" فرما کر تین چار لفظوں میں زیادہ جامعیت کے ساتھ بیان فرما دیا ہے۔ فقر کیا ہے؟ کفر سے کیا مراد ہے؟ اور فقر کفر پر کس طرح منتج ہوتا ہے؟ یہ تین سوالات ہیں اگر قرآن وحدیث کی روشنی میں اور اقتصادیات و معاشیات کی مروجہ زبان میں ان کا جواب دیا جائے تو ایک بہت ضخیم کتاب تیار ہو سکتی ہے جو بلاشبہ کارل مارکس کی "کیپٹال" سے زیادہ ٹھوس، واقعی اور نفس لامری حقایق پر مشتمل ہوگی! بہرحال گذارش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ اگر اسلام واقعی تمام دنیا کا ایک صالح ترین نظام حیات ہے تو حدیث کے ایک طالب علم کو اپنے زمانہ کے ان تمام معاملات و مسائل کا جو اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن وحدیث کی روشنی میں ان مسائل کا جو حل ہے ان کا علم اس طرح ہونا چاہئے کہ وہ اس حل کی فوقیت دوسرے افکار پر ثابت کر سکے اور علمی طور پر اس حل کی صداقت کا دوسروں کو یقین دلا سکے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس کے ذریعہ حدیث کے درس کا ایک جامع اور ہمہ گیر فائدہ حاصل ہو سکتا ہے۔

(۴) ہر حدیث کے دو جزو ہوتے ہیں ایک سند اور ایک متن۔ دونوں اپنی جگہ بہت اہم ہیں لیکن مدارس میں درس حدیث کا جو طریقہ مروج ہے اس میں صرف متن سے اعتنا کیا جاتا ہے اور سند کو شایستہ التفات نہیں سمجھا جاتا۔ یہاں تک کہ ہمارے فارغ التحصیل طلبا راویوں کے نام کے علاوہ ان کے حالات سے بالکل واقف نہیں ہوتے۔ اصول حدیث کی ایک دو کتابوں میں نقد وجرح کے جو اصول وہ پڑھتے ہیں ان کے استعمال کی نوبت شاذ ونادر ہی ہوتی ہوگی۔

علاوہ بریں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم افصح العرب والعجم تھے، اوتیت جوامع الکلم، آپ کا نشانِ امتیاز تھا۔ اس بنا پر آپ کے ارشادات بھی فصاحت و بلاغت کے جواہر ریزے، بلکہ حق تو یہ ہے کہ خود دلیلِ نبوت ہیں۔ لیکن درس میں احادیث کے اسی وصفِ لفظی کی طرف توجہ نہیں کی جاتی، ہم نے

حضرت الاستاذ مولانا السید انور شاہ کو دیکھا ہے کبھی کبھی صرف ایک حدیث کے کسی ٹکڑہ کی بلاغت پر گھنٹوں تقریر فرماتے تھے اور اس وقت رد ائے انور پر عجب وجد و کیف کا عالم ہوتا تھا بہر حال ضرورت ہے کہ :-

(۱) درس حدیث کی مدت بجائے ایک سال کے دو سال کی جائے۔

(۲) اصول حدیث پر کسی ایک کتاب پڑھانے کی بجائے۔ لکچروں کا انتظام کیا جائے جو اس موضوع کی بہت سی کتابوں کا خلاصہ ہوں۔

(۳) درس حدیث کے نصاب میں مشکوٰۃ کے بعد صحیح بخاری اور موطاً امام مالک لفظاً لفظاً پوری پڑھائی جائیں۔ یعنی شروع سے آخر تک ان کا درس یکساں زور اور قوت کے ساتھ ہو۔

فقہ | علوم دینیہ میں قرآن و حدیث کے بعد تیسرا نمبر فقہ کا ہے فقہ اس مجموعۂ احکام کا نام ہے جو قرآن و حدیث یا اجماع و قیاس سے مستنبط ہوتے ہیں اگر فقہ کی تعلیم کا مقصد صرف ان احکام کا معلوم کر لینا ہے تو اس میں شبہ نہیں کہ ابتدا سے لے کر انتہا تک جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں وہ سب اس مقصد کی تحصیل میں ممد و معاون ہوتی ہیں۔ لیکن اگر فقہ کی تعلیم کا مقصد ان احکام کے وجوہ استنباط اور ان کے دلائل کا علم حاصل کرنا بھی ہے تو ظاہر ہے کہ یہ مقصد کما حقہ حاصل نہیں ہوتا۔ احناف پر عام اعتراض ہے کہ وہ قیاس کو روایت کے مقابلہ میں ترجیح دیتے ہیں۔ اور ہماری کتب درسیہ میں اکثر و بیشتر جو استدلال کیا جاتا ہے اس سے اس اعتراض کی تردید تو کیا ہوتی اور کچھ تقویت ہی ہوتی ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ "ہدایہ" کتب فقہ میں نہایت عظیم الشان اور بلند پایہ کتاب ہے لیکن ضرورت ہے کہ اس کا استاذ بجائے فقط مدرس ہونے کے وسیع النظر اور صاحب ذوق عالم ہو جو مسائل و احکام کے سرچشمۂ استنباط پر گفتگو کر کے مسئلہ کی اصل بنیاد کو استوار کر سکے۔ علاوہ بریں فقہ کی تعلیم کا ایک مقصد تفقّہ پیدا کرنا بھی ہونا چاہیے تاکہ وہ زندگی کے نو بنو مسائل و معاملات میں مسلمانوں کی رہنمائی کر سکے اور ظاہر ہے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب کہ امور ذیل کی رعایت کی جائے۔

(۱) طالب علم کسی ایک امام کے مسلک فقہ سے واقفیت پر ہی قناعت نہ کرے بلکہ اس کو کم از کم ائمہ اربعہ کے مسالک سے مع ان کے دلائل کے واقفیت ہونی چاہیے۔

(ب) طالب علم کو فقہ کا مطالعہ بحیثیت ایک مقلد کے نہیں بلکہ بحیثیت ایک طالبِ تحقیق کے کرنا چاہیے، اور اس وقت اس کے دماغ کو ہر قسم کی عصبیت سے آزاد ہونا چاہیے۔

علاوہ بریں مدارس میں عام طور پر عبادات کے حصہ پر فقہ کی تعلیم ختم ہو جاتی ہے۔ عبادات کے ساتھ معاملات کا بھی درس ہونا ضروری ہے اور بعض ابواب مثلاً کتاب العتق، یا کتاب الحدود" آج کل ان کی ضرورت نہیں ہوتی اگر ان ابواب کو مختصر کر دیا جائے جس سے طالب علم کو ان مسائل کا بھی کچھ علم ہو جائے تو مناسب ہوگا۔

اصول فقہ | علومِ دینیہ میں اگرچہ اس کا نمبر چوتھا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک نہایت اہم علم ہے اور اس سے واقفیت اور اس میں کمال و مہارت پر ہی ایک عالم دین کی مذہبی رہنمائی اور معاملات و مسائل کے کشود کار کا دار و مدار ہے۔ اس علم کی تدریس کے لئے جو کتابیں درسِ نظامی میں شامل ہیں ان کی اہمیت اور افادیت سے انکار نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ بات نہ بھولنی چاہیے کہ ایک عالم دین میں اجتہادی صلاحیت اور شریعت سے متعلق ایک وسیع نقطۂ نظر پیدا کرنے کے لئے صرف اس فن کا پڑھا دینا کافی نہیں ہے۔ احکام کی دلیلیں دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک لِمّی اور ایک اِنّی۔ اصول فقہ کی بحث دلیل انی تک محدود رہتی ہے۔ حالانکہ استنباط احکام و مسائل کے لئے جس قدر اس کا جاننا ضروری ہے اسی طرح اسرار و رموزِ شرائع اور منصوص احکام شریعت محمدیہ کے اسرار و حکم کا جاننا بھی ضروری ہے۔ اس سلسلہ میں حضرت شاہ ولی اللہؒ کی حجۃ اللہ البالغہ۔ اگر تمام نہیں تو اس کے ابوابِ متعلقہ کا درس ضروری ہے

علاوہ بریں ہمارے مدارس میں صرف فقہ حنفی کے اصول پڑھائے جاتے ہیں۔ لیکن ایک عالمِ دین میں مزید بصیرت۔ اور استخراج و استنباط احکام کی مزید صلاحیت پیدا کرنے کی غرض سے ضرورت ہے کہ وہ دوسرے ائمہ کے اصولِ فقہ سے واقف ہو۔ اس سلسلہ میں امام شافعی کی کتاب الام کے شروع میں ایک رسالہ "الرسالۃ فی اصول الفقہ للشافعی" چھپا ہوا ہے اور اس کے علاوہ ایک اور کتاب "منہج الاصول" بڑے کام کی ہیں۔

علم الکلام | یہ علم بھی دینی نصابِ درسی کا ایک اہم جز ہے لیکن اب جدید علوم و فنون اور فلسفہ کی غیر معمولی

ترقی کی وجہ سے یہ قدیم علم کلام اپنی افادیت کھو چکا ہے۔ یہ علم معتزلہ کا رد کرنے کے لئے ایجاد کیا گیا تھا لیکن اس علم کی درسی کتابوں پر اگر ایک سرسری نگاہ ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس سے بجائے فائدہ کے نقصان زیادہ پہنچا ہے، معتزلہ کے جواب میں عام طور پر جو روش اختیار کی جاتی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ آخر میں معاملہ نقلی دلائل پر ہی آکر ختم ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہی مسائل ہیں جن پر حافظ ابن تیمیہ حافظ ابن قیم۔ امام غزالی۔ علامہ ابن رشد۔ شاہ ولی اللہ رحمہم اللہ رحمۃ واسعۃً نے کلام کیا ہے اور زیادہ قوت۔ اور یقین انگیزی کے ساتھ کیا ہے اور ان حضرات کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ زمانہ مابعد میں فلسفہ اور سائنس کی غیر معمولی ترقی فلسفۂ یونان کی جس عمارت کو منہدم کرنے والی تھی ان حضرات نے وہ کام خود اپنے زمانہ میں کر دکھایا۔ جب فلسفۂ یونان کی عمارت منہدم ہو جاتی ہے تو ظاہر ہے معتزلی افکار کے لئے سہارا ہی کیا رہ جاتا ہے۔ مثلاً اشیا کا حسن و قبح عقلی ہے یا شرعی؟ خیر و شر کی حقیقت کیا ہے۔؟ ذات باری کی صفات عین ذات ہیں یا غیر ذات! وجود کی کیا حقیقت ہے! وجود واجب سے کیا مراد ہے! علم کسے کہتے ہیں! اعراض جو قائم بالغیر ہوتے ہیں کیا وہ دو زمانوں میں باقی نہیں رہ سکتے؟ اور کیا اس بنا پر ان کا وزن نہیں ہو سکتا! بعث و حشر کی کیا حقیقت ہے؟ کیا روح کا اعادہ بدن اول میں ہوگا۔ یا مثل بدن اول میں! جزا اور سزا کی کیا حقیقت ہے؟ ایمان کا عمل سے کیا تعلق ہے! عمل ایمان کا شرط ہے یا شطر" یا اور اسی طرح کے سیکڑوں مسائل و مباحث ہیں جن پر فلسفہ اور سائنس کی روشنی میں نہایت عمدہ۔ موثر اور یقین افروز گفتگو ہو سکتی ہے اور اس سے قرآن مجید کی تائید ہی ہوگی نہ کہ تردید۔

اس بنا پر علم کلام کے نصاب میں آج کل جو کتابیں پڑھائی جاتی ہیں ان کو یک قلم نکال دینے کی ضرورت ہے اور ان کی جگہ امام غزالی کے رسائل مثلاً "المنقذ من الضلال"، "المضنون به علی غیر اهله" حافظ ابن تیمیہ کا رسالہ "القیاس الشرعی" یا ان کے بعض اور رسالے جو ان کے "مجموعۃ الرسائل" میں چھپے ہوئے ہیں۔ حافظ ابن قیمؒ کی کتابوں کے انتخابات۔ یا تفسیر کبیر امام رازی کے بعض خاص خاص ٹکڑے ان کا انتخاب کر کے ان کو علم کلام کے درس میں شامل کرنا چاہیے۔ یہ انتظام اس وقت تک کے لئے کرنا ہوگا

جب تک کہ جدید علم کلام مرتب نہ ہو۔ جس کی بڑی ضرورت ہے اور جس کے لئے مواد کی کوئی حد نہیں ہے اس جدید علم کلام میں طریق بحث بھی جداگانہ ہوگا اور دلائل و براہین بھی نئے۔ اسلوبِ بیان بھی اور ہوگا۔ اور مسائل بھی بعض نئے ہوں گے جن کی پہلے زمانہ میں اگرچہ کوئی اہمیت نہیں تھی۔ لیکن آج کل ان کی بڑی اہمیت ہے اور جن کو طے کئے بغیر آج کوئی نظامِ زندگی بھی استوار و پائدار نہیں ہو سکتا، مثلاً آج وجودِ باری پر زیادہ طویل و مفصل گفتگو کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ سائنس کے بڑے بڑے علما خود اس کے اقرار و اعتراف پر مجبور ہو گئے ہیں۔ آج ایک دین کے لئے سب سے بڑا مرحلہ یہ ثابت کرنا ہے کہ اس کے روحانی اندازِ حیات کا انسان کی مادی زندگی کے نظم و ترتیب سے کیا تعلق ہے اور وہ اقدار بجائے خود بہت اہم ہونے کے باوجود انسان کی مادی زندگی اور اس کے مختلف پہلوؤں پر کیا اثرات ڈالتے ہیں؟ وقت کا تقاضا ہے کہ ان مسائل پر جذباتی نہیں بلکہ علمی انداز میں گفتگو کی جائے۔ تاکہ جس طرح ہر انسان خدا کا وجود تسلیم کرنے پر فطرتاً مجبور ہو گیا ہے اسی طرح اس خدا کے بخشے ہوئے نظامِ زندگی کو بھی ماننے پر مجبور ہو جائے۔

(دریائے جیحون اور دریائے سیحون
کے صوبے اور ممتاز شہر)
اسبیجاب
شاش
توںکت
ایلاق
سیحون
اخسیکث
فرغانہ
خجندہ
سمرقند
بخارا
اُشروسنہ
دریائے صغد
نسف
فربر
آمل
صغانیان
واشجرد
جیحون
خراسان
ترمذ
بدخشان
ختل
مستشرق لے اسٹرینج کی کتاب ممالک
خلافتِ شرقیہ سے یہ نقشہ ماخوذ ہے

اسلامی دنیا چوتھی صدی ہجری میں

(ایک سیاح کے مشاہدات)

ملک مشرق[1]

از

(جناب ڈاکٹر خورشید احمد صاحب فارق ایم اے استاد ادبیات عربی دہلی یونیورسٹی)

ملک کا افتتاح سیاح ان الفاظ میں کرتا ہے:- یہ تمام ملکوں سے زیادہ مہتم بالشان ملک ہے، یہاں اکابر و علماء ہر ملک سے زیادہ ہیں، منافع، تجارت اور خوبیوں کا گہوارہ ہے، علم و ادب کا مستقر ہے، اسلام کا محکم ستون اور اس کا سب سے بڑا قلعہ ہے۔ یہاں کا بادشاہ سارے بادشاہوں سے افضل ہے، یہاں کا لشکر سب لشکروں سے بہتر ہے، یہاں کے لوگ نہایت بہادر اور صائب الرائے ہیں، اس ملک کا نام بہت اونچا ہے اور یہاں دولت کی فراوانی ہے، یہاں کے باشندوں کے بارے میں حضرت عمرؓ کو لکھا گیا تھا: "ان کا لباس خود و زرہ ہے، وہ سوکھا گوشت کھاتے ہیں اور برف پیتے ہیں"۔ یہاں کثرت سے آباد متمدن قصبے اور گاؤں ہیں، سرسبز باغ، گھنے گنجان درخت اور پانی سے پُر دریا اور نہریں ہر طرف موجود ہیں، قدرتی وسائل فراواں ہیں، مذہبی زندگی نقائص سے پاک ہے، انصاف کا جھنڈا ایک ایسی حکومت کے ہاتھوں بلند ہے جو ہمیشہ فاتح اور کامران رہتی ہے اور جس کو ہرانے ہمیشہ کے لئے قایم کیا ہے۔ اس ملک میں فقیہوں کو بادشاہ کا درجہ حاصل ہے اور یہاں کے اموں کی لیاقت اس پایہ کی ہے کہ دوسرے ملکوں پر حکومت کرتے ہیں منگولوں کے مقابلہ میں یہ ملک

---

[1] سیاح نے مشرق کا اطلاق ماوراء النہر اور خراسان پر کیا ہے۔ یہ سارا علاقہ سامانی سلاطین کے زیر نگیں تھا انھوں نے ۲۷۹ھ سے ۳۸۹ھ تک حکومت کی۔

۱۱

ایک سدِ آہنی ہے اور غز حملہ آوروں کے سامنے ایک مضبوط ڈھال، بازنطینی حکومت اس کی سطوت وصولت کا لوہا مان چکی ہے، مسلمان اس کی خوبیوں پر فخر کرتے ہیں، راسخ فی العلم فضلاء بڑی کثرت سے یہاں موجود ہیں اور ایک بڑی تعداد حاجیوں کی ہر سال حرمین جاتی ہے۔ ابوزید بلخی نے اپنی کتاب میں اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ خراسان، سجستان، ماوراء النہر۔ لیکن ہم نے اس کو دو علاقوں میں بانٹا ہے: ایک دریائے جیحون کا مشرقی علاقہ اور دوسرا مغربی، مشرقی علاقہ کو ہم نے علاقہ ہیطل کے نام سے یاد کیا ہے کیوں کہ سب سے پہلے ہیطل بن ہام بن سام بن نوح نے اس کو آباد کیا تھا اور مغربی حصہ کو علاقہ خراسان کے نام سے تعبیر کیا ہے کیوں کہ ہیطل کے بھائی خراسان نے اس کو آباد کیا تھا۔[1]"

علاقہ ہیطل

سیاح نے اس علاقہ کو دس صوبوں میں تقسیم کیا ہے جن کے نام منگولی ترکستان کی طرف سے یہ ہیں: فرغانہ۔ اسبیجاب۔ شاس۔ اُشرُوسنہ۔ صُغد بخارا۔ ایلاق۔ کشّ نسف۔ صَغانیان۔

علاقہ ہیطل کا تعارف

"یہ علاقہ تمام ملکوں سے زیادہ زرخیز اور نفع بخش ہے، کسی دوسرے ملک میں لوگوں کو دین کی ایسی سمجھ بوجھ نہیں ہے اور نہ علم سے ایسی رغبت ہے، نہ دین نقائص سے ایسا پاک ہے، یہاں کے باشندے بہادری میں بے مثال ہیں، دشمن سے جہاد میں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں، غازی بہادر، شہسوار ملک کے گوشہ گوشہ میں موجود ہیں، اور کوئی شہر رباطات یا چھاؤنیوں سے خالی نہیں ہے۔ کسی قوم کے دل کینہ اور بغض سے ایسے صاف نہیں ہیں اور نہ کوئی قوم نماز باجماعت کو

---

[1] مقدسی صفحہ ۲۶۰-۲۶۱

کو اتنا محبوب رکھتی ہے، اسلام یہاں سرسبز و شاداب ہے اور بادشاہ خوب طاقتور ہے، باشندے خوش حال و پاکباز ہیں، فیاض و مہمان نواز ہیں اور اہلِ عقل کی تعظیم کرتے ہیں، ملک میں امن و عافیت ہے، فقہاء اپنے فن میں ماہر ہیں، مالدار اپنی دولت کی طرف سے مطمئن ہیں، پیشہ ور تک پڑھے لکھے ہوتے ہیں، غریب اپنا گذارہ بآسانی کر لیتے ہیں، شاذونادر ہی یہاں قحط پڑتا ہے، ملک میں منبر شمار سے زیادہ ہیں، صغد جیسا جنت نظیر علاقہ، اور سمرقند و خجند جیسے دل کش اور شاندار شہر یہاں آباد ہیں، ملک میں علمی ادارے بہت ہیں، علم و ادب کے امام، تصوف اور فلسفہ کے مشائخ اور بڑے بڑے ذی اقتدار لوگ موجود ہیں، مدبر اور اربابِ حکومت بیدار مغز ہیں، نہ یہاں کوئی بدعت نظر آتی ہے اور نہ ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جن سے لوگوں پر ظلم ہو، نفیس دھاتوں کی کانیں ملک میں موجود ہیں، انگور اور پھل خوب ہیں، غلاموں اور کنیزوں کی بہتات ہے، درس و تدریس کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے، ادب اور حدیث نویسی سے لوگوں کو خاص دلچسپی ہے پانی ہلکا اور زود ہضم ہے۔ بایں ہمہ صفات یہاں برائیاں ظاہر ہونے لگی ہیں، سود خوری بڑھ رہی ہے اور ہر قسم کے مفسدہ پردازانہ پہنچنے لگے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی حالت بغداد جیسی یا اس سے بھی بدتر ہو جائے گی اور اسلام کا شاداب پودا کمہلا جائے گا۔ (مقدسی صفحہ ۲۶۱)

اہم شہر

۱۔ اَخُسیکَت: — یہ فرغانہ کا صدر مقام تھا، باغوں، مرغزاروں اور نہروں سے گھرا ہوا۔ شہر کے گرد فصیل تھی اور کئی نہریں بہت سے خوشنما حوضوں کو بھرتی ہوئی شہر سے ہو کر گذرتی تھیں فصیل کے باہر ایک دوسرا شہر تھا جو دس گیارہ میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس بیرونی شہر میں قہندز[1] تھا

---

[1] قُہُندُز۔ کوہ انداز کا معرب ہے۔ قہندز اس قلعہ کو کہتے جو کسی علاقہ کے سب سے بڑے شہر کی فصیل میں واقع ہوتا اور جس میں حاکم کی رہائش گاہ اور سرکاری دفاتر ہوتے۔ ماوراء النہر اور خراسان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں قہندز ہوتا تھا چونکہ ماوراء النہر اور خراسان ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے اصلی وطن تھے، یہاں بھی اس قسم کے قلعے بنائے گئے۔ دہلی میں تغلق آباد کے قلعہ، پرانے قلعہ اور لال قلعہ پر قہندز کا اطلاق ہوتا ہے، کیونکہ یہ سب شہر کے اندر تھے، اور (بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

ایک سد آہنی ہے اور غز حملہ آوروں کے سامنے ایک مضبوط ڈھال، بازنطینی حکومت اس کی سطوت وصولت کا لوہا مان چکی ہے، مسلمان اس کی خوبیوں پر فخر کرتے ہیں، راسخ فی العلم فضلاء بڑی کثرت سے یہاں موجود ہیں اور ایک بڑی تعداد حاجیوں کی ہر سال حرمین جاتی ہے۔ ابوزید بلخی نے اپنی کتاب میں اس کو تین حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ خراسان، سجستان، ماوراء النہر۔ لیکن ہم نے اس کو دو علاقوں میں بانٹا ہے: ایک دریائے جیحون کا مشرقی علاقہ اور دوسرا مغربی، مشرقی علاقہ کو ہم نے علاقہ ہیطل کے نام سے یاد کیا ہے کیوں کہ سب سے پہلے ہیطل بن ہام بن سام بن نوح نے اس کو آباد کیا تھا اور مغربی حصہ کو علاقہ خراسان کے نام سے تعبیر کیا ہے کیوں کہ ہیطل کے بھائی خراسان نے اس کو آباد کیا تھا۔[1]"

علاقہ ہیطل

سیاح نے اس علاقہ کو دس صوبوں میں تقسیم کیا ہے جن کے نام منگولی ترکستان کی طرف سے یہ ہیں: فرغانہ۔ اسبیجاب۔ شاس۔ اُشروسنہ۔ صُغد سنجارا۔ ایلاق۔ کش نسف۔ صَغانیان۔

علاقہ ہیطل کا تعارف

"یہ علاقہ تمام ملکوں سے زیادہ زرخیز اور نفع بخش ہے، کسی دوسرے ملک میں لوگوں کو دین کی ایسی سمجھ بوجھ نہیں ہے اور نہ علم سے ایسی رغبت ہے، نہ دین نقائص سے ایسا پاک ہے، یہاں کے باشندے بہادری میں بے مثال ہیں، دشمن سے جہاد میں ہمیشہ مصروف رہتے ہیں، غازی بہادر، شہسوار ملک کے گوشہ گوشہ میں موجود ہیں، اور کوئی شہر رباطات یا جہادی نوں سے خالی نہیں ہے۔ کسی قوم کے دل کینہ اور بغض سے ایسے صاف نہیں ہیں اور نہ کوئی قوم نماز باجماعت کو

---

[1] مقدسی صفحہ ۲۶۰-۲۶۱

کو اتنا محبوب رکھتی ہے، اسلام یہاں سرسبز و شاداب ہے اور بادشاہ خوب طاقتور ہے، باشندے خوش حال و پاکباز ہیں، فیاض و مہماں نواز ہیں اور اہلِ عقل کی تعظیم کرتے ہیں، ملک میں امن و عافیت ہے، فقہا اپنے فن میں ماہر ہیں، مالدار اپنی دولت کی طرف سے مطمئن ہیں، پیشہ ور تک پڑھے لکھے ہوتے ہیں، غریب اپنا گذارہ باآسانی کر لیتے ہیں، شاذ و نادر ہی یہاں قحط پڑتا ہے، ملک میں منبر شمار سے زیادہ ہیں، صغد جیسا جنت نظیر علاقہ، اور سمرقند و خجند جیسے دل کش اور شاندار شہر یہاں آباد ہیں، ملک میں علمی ادارے بہت ہیں، علم و ادب کے امام، تصوف اور فلسفہ کے مشائخ اور بڑے بڑے ذی اقتدار لوگ موجود ہیں، مدبر اور اربابِ حکومت بیدار مغز ہیں، نہ یہاں کوئی بدعت نظر آتی ہے اور نہ ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں جن سے لوگوں پر ظلم ہو، نفیس دھاتوں کی کانیں ملک میں موجود ہیں، انگور اور پھل خوب ہیں، غلاموں اور کنیزوں کی بہتات ہے، درس و تدریس کا سلسلہ دن رات جاری رہتا ہے، ادب اور حدیث نویسی سے لوگوں کو خاص دلچسپی ہے پانی ہلکا اور زود ہضم ہے۔ باایں ہمہ صفات یہاں بُرائیاں ظاہر ہونے لگی ہیں، سود خوری بڑھ رہی ہے اور ہر قسم کے مفسدہ پرداز پہنچنے لگے ہیں، مجھے اندیشہ ہے کہ اس کی حالت بغداد جیسی یا اس سے بھی بدتر ہو جائے گی اور اسلام کا شاداب پودا کمہلا جائے گا۔ (مقدسی صفحہ ۲۶۱)

اہم شہر

۱۔ اَخسیکَت :- یہ فرغانہ کا صدر مقام تھا، باغوں، مرغزاروں اور نہروں سے گھرا ہوا۔ شہر کے گرد فصیل تھی اور کئی نہریں بہت سے خوشنما حوضوں کو بھرتی ہوئی شہر سے ہو کر گذرتی تھیں فصیل کے باہر ایک دوسرا شہر تھا جو دس گیارہ میل کے رقبہ میں پھیلا ہوا تھا۔ اس بیرونی شہر میں قُہندز[1]

[1] قُہندُز - کوہ انداز کا معرب ہے۔ قُہندُز اس قلعہ کو کہتے جو کسی علاقہ کے سب سے بڑے شہر کی فصیل میں واقع ہوتا اور جس میں حاکم کی رہائش گاہ اور سرکاری دفاتر ہوتے۔ ماوراء النہر اور خراسان کے تقریباً ہر بڑے شہر میں قُہندز ہوتا تھا چوں کہ ماوراء النہر و خراسان ہندوستان کے مسلمان بادشاہوں کے اصلی وطن تھے، یہاں بھی اس قسم کے قلعے بنائے گئے۔ دہلی میں تغلق آباد کے قلعہ، پرانے قلعہ اور لال قلعہ پر قُہندز کا اطلاق ہوتا ہے، کیوں کہ یہ سب شہر کے اندر تھے، اور

(بقیہ حاشیہ بر صفحہ آئندہ)

(حاکم کا قلعہ اور دفاتر) اور بازار تھے، جامع مسجد اور اکثر عمارتیں داخلی شہر میں تھیں۔ اخسیکت نعمتوں سے مالا مال تھا، اشیاء سستی تھیں، مگر آب و ہوا ٹھنڈی تھی، باشندے اکھڑ اور بے باک تھے[1]

۲۔ خُجَندہ:۔ صوبہ فرغانہ کا دوسرا دلکش اور نزہت بخش شہر تھا جس کی نظیر آب و ہوا کی لطافت اور مناظر کی دل کشی میں سارے ہیطل میں نہ تھی۔ شہر کے وسط سے ایک نہر گذرتی تھی۔ شاعر اور ادیب اس کی تعریف میں رطب اللسان تھے[2]

۳۔ اَسْبیجاب (معجم البلدان یاقوت۔ اسفیجاب) یہ صوبہ اسبیجاب کا صدر مقام اور نہایت اہم شہر تھا۔ اس کی فصیل کے باہر ایک دوسرا شہر آباد تھا۔ یہاں تجارت کے بڑے بڑے گودام تھے اور بزازوں کا ایک مشہور بازار تھا۔ شہر کی فصیل میں چار دروازے تھے اور ہر دروازہ پر ایک رباط[3] چھاؤنی تھی۔ ایک رباط کا نام رباط قراتکین تھا جہاں قراتکین نامی سردار نے ایک بازار وقف کیا تھا جس کی آمدنی ہر ماہ سات ہزار درہم تھی (تقریباً چار ہزار روپے)۔ اس روپے سے غریبوں کو کھانا دیا جاتا تھا۔ سیاح نے کچھ لوگوں سے سنا کہ رباطات کی تعداد ایک ہزار سات سو ہے۔ بہر حال یہ اہم سرحدی مقام تھا جہاں منگولی چھاپہ ماروں سے مقابلہ کے لئے ہر وقت فوج تیار رہتی تھی۔ بیرونی شہر کے گرد بھی فصیل تھی۔ اندرونی شہر میں ایک قہندز تھا جو ویران ہو چکا تھا۔ یہاں کے لوگ قحط سے ناواقف تھے۔ پھل اتنے زیادہ اور متنوع تھے کہ ان کی کوئی قدر و قیمت نہ تھی۔ نہایت نزہت بخش اور عمدہ شہر تھا۔ باشندوں سے کسی قسم کا خراج یا ٹیکس نہیں لیا جاتا تھا۔ زندگی بڑی پر لطف تھی مگر یہاں کے باشندے صاف دل ہونے کے باوجود خود پسند اور شوریدہ سر تھے، اپنے مذہب پر بہت اتراتے تھے، شہر

(باقی حاشیہ صفحہ گذشتہ) یہاں حاکم کی رہائش گاہ اور سرکاری دفاتر واقع تھے۔ بالعموم قہندز کسی مرتفع جگہ یا ٹیلے پر بنایا جاتا تھا۔ تاج العروس، معجم البلدان یاقوت۔

[1] مقدسی ص ۲۷۱ [2] مقدسی ص ۲۷۲

[3] دشمن کی سرحد پر ان چھاؤنیوں یا بیرکوں کو کہتے جہاں جہاد کے ذریعہ تقرب خدا حاصل کرنے والے رضاکاروں کی ایک جماعت رہتی تھی۔ یہ لوگ عبادت و ریاضت میں مصروف رہتے، حکومت کی طرف سے ان کو مفت راشن ملتا، اور گھوڑے تیار رکھے جاتے۔ خطرہ کے وقت یہ دشمن کا مقابلہ کرتے اور اپنے علاقہ کے مسلمانوں کی حفاظت کرتے۔ تاج العروس۔ مقریزی بیان رُبُط۔ غالباً چوتھی صدی ہجری میں رباط کا اطلاق صوفی خانقاہوں، لنگر خانوں اور مسافر خانوں پر بھی ہونے لگا۔ سیاح نے اس لفظ کا زیادہ تر استعمال اصلی معنی میں کیا ہے

کے مقابلہ میں دیہات کے لوگ بہتر تھے، شہر کے لوگ درندوں کی طرح بے رحم تھے، اور گاؤں کے لوگ بکری کی طرح مسکین۔[1]

[اس شہر اور صوبہ کی خوبیوں اور پھر تباہی کے بارے میں معجم البلدان کا مصنف یاقوت رقم طراز ہے:- اسفیجاب ماوراء النہر کے ممتاز ترین شہروں میں تھا اور ترکستان کی حدود میں واقع تھا، اس کے زیر عمل ایک بڑا علاقہ اور بہت سے گاؤں تھے جو شہروں کی شان رکھتے تھے۔ یہ دنیا کے ان شہروں میں تھا جن کو خدا نے نہایت سرسبز و شاداب، نزہت بخش اور آباد بنایا ہے۔ جس کی زمین نہایت زرخیز ہے، جس میں باغوں اور مرغزاروں کی کثرت ہے، جہاں دریا اور نہریں رواں ہیں اور جہاں گلستاں اور چمنستان قدم قدم پر ہیں۔ سوائے اسفیجاب کے ماوراء النہر یا خراسان میں کوئی ایسا شہر نہ تھا جس میں باشندوں سے خراج یا ٹیکس نہ لیا جاتا ہو، یہ ایک بڑا سرحدی مقام تھا اور اس کے باشندوں کو خراج سے اس لئے معاف کر دیا گیا تھا کہ وہ خراج کی رقم سے ہتھیار اور شہر میں قیام کی دیگر ضروریات مہیا کر سکیں، آبادی، زرخیزی، دل کشی اور شادابی میں یہی حال ان شہروں کا تھا جو اس کے آس پاس تھے جیسے طراز، صبران، سانیکث اور فاراب بہت زمانہ نہیں گذرا تھا کہ اس حسین صوبہ کو حوادث کے طوفانوں نے تہ و بالا کر دیا، پہلی تباہی خوارزم شاہ محمد بن تکش بن الپ ارسلان کے ہاتھوں آئی، اس نے ملوک الخانیہ کو تباہ کر کے ماوراء النہر کے ملک پر قبضہ کیا، یہ سلاطین مل کر اس ملک کے مختلف حصوں اور سرحدوں کو محفوظ و منضبط کئے ہوئے تھے، جب وہ سب تباہ کر دئے گئے تو ملک جو نہایت وسیع تھا اور جس کی سرحدیں ترکمانوں اور غزوں کے حملوں کی زد میں تھیں، اس کے قابو سے باہر ہو گیا اور وہ اس کی حفاظت و تنظیم نہ کر سکا تب اس نے اپنے ہاتھوں سے سرحدی شہروں کو غارت کر دیا اور اپنے لشکر سے لٹوا دیا، نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں کے باشندے جلا وطن ہو گئے اور سب کچھ چھوڑ کر نکل پڑے اور حال یہ تھا کہ ان کی گردنیں مڑی ہوئی تھیں اور حسرت و یاس سے وہ اپنے گھروں، کھیتوں اور باغوں کی طرف دیکھتے جا رہے تھے

---

[1] مقدسی ص ۲۷۲ - ۲۷۳

یہ باغ و چمن اور یہ مرغزار و منازل کس مپرسی کے عالم میں پڑے رہے، آنکھیں ان کو دیکھ کر روتی تھیں، دلوں میں ان کے نظارہ سے ہوک اُٹھتی تھی، محل کھنڈر ہو گئے، مکانات اُجڑ گئے اور ان رواں دواں نہروں کا سرچشمہ دریائے سیحون حیران و سرگشتہ ہر سمت بہ نکلا، نہ اس کو استعمال کرنے والا کوئی تھا نہ ضبط میں لانے والا۔ اس کے بعد سنہ ۶۱۶ ہجری میں دوسری تباہی آئی جس کی نظیر جب سے زمین و آسمان بنے، اس عالم میں نہیں ملتی اور یہ تاتاریوں کی اس ملک میں یورش تھی، جب وہ چین سے آئے۔ خدا کبھی ان کا ساتھ نہ دے۔ تو انھوں نے اس ملک میں جو تھوڑی بہت آبادی تھی۔ اس کو بھی فنا کے گھاٹ اُتار دیا جیسا کہ انھوں نے دوسری قوموں کے ساتھ کیا تھا ان کی یورش کے بعد ان تباہ حال باغوں اور ان بلند محلوں میں ویرانوں اور گری ہوئی دیواروں کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔[۱] . .]

۴۔ بنکث:۔ یہ وسیع و عریض شہر شاش کا صدر مقام تھا، یہاں کے مکان کشادہ تھے، کمتر ہی کوئی گھر ہوگا جس میں باغ، اصطبل اور انگور کی بیلیں نہ موجود ہوں۔ اس شہر میں خوبیاں اور برائیاں تقریباً مساوی تھیں۔ بہت سی سہولتوں کے ساتھ یہاں فتنہ و فساد کا دروازہ بھی کھلا تھا، بعض حصے خوب آباد تھے اور بعض اُجڑے ہوئے تھے، اگر ایک طرف اچھے شہری تھے تو دوسری طرف ڈکیتی اور راہزنی بھی ہوتی تھی، باشندے سنی تھے مگر نہایت متعصب، جو لوگ خود محفوظ اور طاقتور تھے وہ شوریدہ سر اور فوجی مطلب کے تھے، نیک لوگ بھلائی اور راستی کی طرف مائل تھے تو مفسد اعمالِ قبیحہ میں سرگرم تھے، لوگوں کو علم و ادب سے دلچسپی تھی مگر اپنے مذہب و مسلک پر پھولے نہیں سماتے تھے اور اختلاف رائے کے دشمن تھے، کمان سازی میں ماہر تھے مگر کمانوں کے سرے کمزور ہوتے تھے، خوبصورت تھے مگر سرد مہر، تیز فہم تھے مگر احمقوں کی بھی کمی نہ تھی، سخاوت کے ساتھ تند خو بھی تھے، سردی سخت پڑتی تھی، پھل وافر تھے، معاش کے وسائل محدود اور تنگ تھے مگر چیزیں سستی تھیں، شہر تین میل سے زیادہ لمبا اور اسی قدر چوڑا تھا، شہر کی فصیل سے باہر یکے بعد دیگرے دو[۲] اور شہر آباد تھے اور ہر ایک میں قلعہ اور فصیل تھی، اکثر بازار بیرونی شہروں

---

[۱] معجم البلدان، مصر ۱/ ۲۳۰-۲۳۱

میں تھے، اندرونی شہر میں قہندز (حاکم کا قلعہ اور دفاتر) اور جامع مسجد تھی۔[1]

۵۔ تُونکَث:۔ صوبہ ایلاق کا صدر مقام اور بنکث سے رقبہ میں نصف تھا۔ شہر میں ایک قُہندُز تھا، شہر کی فصیل کے باہر ایک دوسرا شہر آباد تھا، کچھ بازار اندرونی شہر میں تھے کچھ بیرونی میں، شہر میں سے ہو کر ایک نہر بہتی تھی، جگہ پر لطف و خوش آیند تھی، ضرورت کی سب چیزیں مہیا تھیں۔[2]

۶۔ بُونجکَث (یاقوت۔ بُنجیکَت):۔ صوبہ اُشْروسنہ کا صدر مقام اور اہم شہر تھا، اس کے باشندوں کی تعداد بہت تھی، شہر کو ہر طرف سے باغ گھیرے ہوئے تھے، مکانات خوش نما تھے یہ شاش کے شہروں سے ملتا جلتا تھا مگر یہاں کے باشندے شاش کی نسبت زیادہ صاف دل اور خوش زبان تھے، شہر کے اندر قہندز تھا اور اس کے دو دروازے تھے، شہر کی فصیل کے باہر ایک اور شہر آباد تھا جس میں داخل ہونے کے چار بڑے راستے تھے، شہر میں ہو کر چھ نہریں گذرتی تھیں، دریائے سیحون شہر کو چھوتا ہوا گذرتا تھا۔ باغوں، مرغزاروں اور کھیتوں نے شہر کو رشکِ فردوس بنا دیا تھا۔[3]

۷۔ سمرقند:۔ یہ عظیم الشان شہر صوبہ صغد کا صدر مقام اور صوبہ ہائے ہَیطَل کا دارالسلطنت تھا، بہت پرانا اور عمدہ شہر تھا، غلاموں کی بہت بڑی منڈی تھی، مکانات مٹی اور لکڑی سے بنے تھے، شہر میں ہر جگہ ایک گہری نہر کا پانی رواں دواں تھا، درخت اور باغ حدِ نظر تک تھے، تجارت کا بڑا زبردست مرکز تھا، مشرق و مغرب سے سامانِ تجارت یہاں آتا تھا، شہر میں بڑے بڑے مالدار اور تاجر آباد تھے، عیش و آرام کی زندگی بسر کرنے کے ذرائع وافر تھے، درس و تدریس کا خوب چرچا تھا، اور تمام رائج علوم کے فاضل موجود تھے، باشندے سُنّی، اولوالعزم اور صاحب رائے تھے، گرمی کے موسم میں یہاں جنت کا لطف آتا تھا مگر جاڑے بہت سخت تھے، باشندے مردِ دہر تھے، پردیسیوں کے ساتھ مروت اور ہمدردی سے پیش نہ آتے تھے، مغرور، خود پسند اور ریاکار تھے، حاکموں

---

[1] مقدسی صـ۲۷۶ [2] مقدسی صـ۲۷۶ [3] ایضاً

سے بغاوت کرتے رہتے تھے، کنیزیں پاکباز ہوتی تھیں، مگر غلام بدچلن تھے، شہر دریائے صغد کے
کنارہ قلعہ میں آباد تھا جس کے چار دروازے تھے، شہر کی فصیل کے باہر ایک دوسرا شہر آباد تھا
جس کے آٹھ بڑے راستے تھے، شہر کا سب سے آباد و پر رونق حصہ باب الطاق تھا، جامع مسجد
اندرونی شہر میں قہندز کے پاس تھی اور اکثر بازار بیرونی شہر میں تھے، شہر کے گرد ایک خندق تھی اور
اس پر سے ہو کر سیسے کا ایک موٹا نل شہر میں جاتا تھا جس سے شہریوں کو پانی ملتا تھا، اس کے ماتحت
قصبے اور گاؤں متمدن و معمور تھے، اور سارا علاقہ شاداب باغوں، اور نہروں سے گل زار بنا ہوا تھا۔

۸۔ **نموجکث** (یاقوت۔ بومجکث) یہ بخارا کا صدر مقام اور شاہ ہیطل (سامانی سلطان)
کا پایۂ تخت تھا، یہاں کی مٹی سیاہ تھی گھر متعفن اور بازار چوڑے چکلے تھے، اس لحاظ سے یہ فسطاط سے
مشابہ تھا، مکانوں کی تنگی، عمارتوں کی ساخت اور مضافات کی دل کشی میں یہ دمشق سے ملتا جلتا
تھا۔ یہ شہر ایک وسیع میدان میں واقع تھا اور اس کی آبادی ہر روز افزوں تھی، شہر کی فصیل کے پیچھے
ایک قہندز تھا جس میں شاہی خزانے اور قید خانے تھے، جامع مسجد شہر میں تھی، اس کے متعدد
صحن تھے، نہایت صاف، شہر کی ساری ہی مسجدیں خوش نما اور شاندار تھیں، بازار عمدہ تھے، شہر
کی فصیل سے باہر ایک دوسرا شہر تھا جس سے دس راستے نکلتے تھے، بادشاہ کا محل ایک کھلے
میدان میں قہندز کے سامنے واقع تھا، دریا شہر کو چیرتا ہوا نکلتا تھا، شہر میں بہت سے حوض تھے
پانی میٹھے کنوؤں سے بھی لیا جاتا تھا، سیاح لکھتا ہے: "میں نے سارے ملک مشرق میں اس شہر
سے زیادہ پھلتا پھولتا اور گنجان آباد کوئی دوسرا شہر نہیں دیکھا" پردیسیوں کے لئے مبارک تھا، کاروبار
کرنے والوں کے لئے نہایت نفع بخش، یہاں کے کھانے لذیذ اور صحت بخش تھے، حمام صاف ستھرے،
سڑکیں چوڑی، مکانات اور عمارتیں خوش نما تھیں، روزگار اور رزق آسانی سے مل جاتا تھا، پانی زود
ہضم تھا، پھلوں کی بہتات تھی، مسجدیں نمازیوں سے بھری رہتی تھیں، علم و مناظرہ کی مجلسوں سے
لوگوں کو خاص دلچسپی تھی، عام لوگ بھی فقہ اور ادب میں درک رکھتے تھے، جہاد کے ذریعہ تقرب خدا
حاصل کرنے والے سرفروشوں کی تعداد بہت تھی، جہلا اور ان پڑھوں کی تعداد کم تھی، راسخ فی العلم

فضلا بہت تھے، وعظ گوئی خام علم لوگوں کی بجائے فقیہ و مفسر کرتے تھے، یہاں نہ خراج لیا جاتا تھا نہ عشر، بادشاہ کے انصاف کی گود رعایا کے لئے کھلی ہوئی تھی اور سب امن و عافیت کی زندگی بسر کرتے تھے، ان خوبیوں کے ساتھ یہاں یہ خرابیاں تھیں:- مکانات تنگ تھے، آگ بہت لگتی تھی، شہر کے کوچے، گلیاں اور مکان پانی کی نکاسی کا صحیح انتظام نہ ہونے سے بدبودار تھے، مچھروں کی خوب تولید ہوتی تھی، گرمی و سردی دونوں سخت پڑتی تھی، کنوؤں کا پانی کھاری تھا، سرائیں اور آرام گاہیں تکلیف دہ تھیں، مکانوں کی قیمت بہت زیادہ تھی، امرد پرستی کا رواج تھا، باشندے خلیق و ملنسار نہ تھے، بہت سے ایسے لوگ باہر سے آگئے تھے جنہوں نے برائیاں پھیلانا شروع کردی تھیں، جو بد معاملہ تھے، اور نماز باجماعت کو ضروری نہیں سمجھتے تھے، اس کے علاوہ شاہی دوستوں اور مقربوں کا ایک گروہ پیدا ہوگیا تھا جو دیباج و ریشم پہنتا تھا، سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا اور دینی امور کو حقارت کی نظر سے دیکھتا تھا[۱]،

۹- کُش:- بڑا شہر تھا، اس کے باہر یکے بعد دیگرے دو شہر آباد تھے، اندرونی شہر مع قُہندز کے اُجڑ چکا تھا لیکن اس کی جامع مسجد میں نماز ہوتی تھی، اس کے باہر والا شہر خوب آباد تھا، حکومت کے دفاتر اندرونی شہر سے باہر تھے، بازار بیرونی شہروں میں تھے، بخارا کے مکانوں کی طرح یہاں کے مکان بھی لکڑی اور مٹی سے بنائے گئے تھے، شہر سے ہو کر دو بڑی نہریں گذرتی تھیں، شہر ہر لحاظ سے اچھا تھا، بس خرابی یہ تھی کہ یہاں وبائیں پھیلتی رہتی تھیں[۲]۔

۱۰- نَسَف:- اس کو نخشب بھی کہتے تھے، عمدہ شہر تھا، اس کا قُہندز ویران ہو چکا تھا، مگر فصیل سے باہر کا شہر جو ایک مُسطح میدان میں واقع تھا خوب آباد تھا، شہر کو چیرتی ہوئی ایک نہر نکلتی تھی جس کے کنارہ حکومت کے دفاتر تھے، جامع مسجد بیرونی شہر میں بازاروں کے قریب تھی، یہاں عمدہ انگور خوب ہوتے تھے، اور دور دور تک لہلہاتے کھیت تھے، شہر عمدہ اور بڑا تھا مگر پانی کی قلت تھی، کیونکہ نہر کا پانی بعض اوقات ٹوٹ جاتا تھا، باشندے شوریدہ سر شریر مزاج تھے اور پولیس کے لئے موزوں تھے[۳]

۱۱- صَغَانیان:- نہایت معمور و سرسبز صوبہ تھا جس کے صدر مقام کا نام بھی صَغَانیان تھا، خدا

---

۱ مقدسی صفحہ ۲۸۰-۲۸۱ ۲ مقدسی صفحہ ۲۸۲ ۳ مقدسی صفحہ ۲۸۳

کی بہت سی نعمتیں اور سہولتیں یہاں موجود تھیں، علاقہ میں پینے کا پانی اُن دریاؤں سے آتا تھا جو جیحون
میں گرتے تھے، سال کے بعض حصّوں میں جیحون میں باڑھ آجانے سے شہر کی رسد منقطع ہو جاتی تھی،
صغانیان کا علاقہ ترمذ کے مضافات تک پھیلا ہوا تھا، اس علاقہ میں میدان اور پہاڑ دونوں تھے
اس کی سرحد پر ایک ترکی قوم آباد تھی جس کو کمیجی کہتے تھے، علاقہ میں سولہ ہزار گاؤں تھے، اور جب بادشاہ
وقت پر کوئی دشمن حملہ کرتا تو یہاں سے دس ہزار جوان مع جانوروں اور خرچ کے بطور کمک بھیجے جاتے تھے
شہر کے بازار ڈھکے ہوئے اور خوش نما تھے، روٹی سستی تھی گوشت اور پانی افراط سے تھا، ہر گھر
میں نہروں سے کاٹ کر پہنچے لائے گئے تھے جن سے گھر کی ضرورت کے علاوہ گھر کے باہر کے باغ بھی سیراب
ہوتے تھے، جامع مسجد بازار کے وسط میں تھی، سارے صوبہ اور شہر کے مضافات میں مرغزار اور پھل والے
درختوں کے گنجان باغ تھے، یہاں مختلف قسم کے پرندے بھی تھے، جن کا شکار کیا جاتا تھا، اور جنگلی جانور
کی شکارگاہیں بھی خوب تھیں، سردی کا موسم نہایت خوشگوار ہوتا تھا، بارش خوب ہوتی تھی اور جاڑوں
میں پہاڑ برف سے ڈھک جاتے تھے، یہاں کی گھاس بہت اونچی اٹھتی تھی، اس قدر کہ گھوڑا مع سوار
کے اس میں چھپ جاتا تھا، باشندے سنی تھے، پردیسیوں اور نیک لوگوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت
سے پیش آتے تھے، البتہ عالم کم تھے اور فقیہانہ ہونے کے برابر، اس صوبے کے سارے ہی شہر، قصبے
اور گاؤں آباد، سرسبز اور خوش آیند تھے[1]۔

جیحون پر واقع ہونے والے علاقے

دریائے جیحون ملک مشرق کو پھاڑتا ہوا نکلتا تھا اور بحیرۂ خوارزم میں گرتا تھا، اس پر متعدد
صوبے اور شہر آباد تھے اس سے بہت سی شاخیں نکلتی تھیں اور چھ دریا اس میں گرتے تھے۔

صوبے:- خوارزم - قوادیان - خُتّل -

ضلعے:- ترمذ - کالِف - نویدہ - زمّ - فربر - آمُل -

---

[1] مقدسی ص ۲۸۳

خوارزم

یہ صوبہ دریائے جیحون کے دونوں بازوؤں پر پھیلا ہوا تھا، اس کا سب سے بڑا شہر اور صدر مقام علاقہ ہیطل والے بازو پر تھا اور دوسرا صدر مقام علاقہ خراسان والے بازو پر تھا۔ ان دونوں شہروں کے باشندے زبان، رسم ورواج، عادات واخلاق میں ایک دوسرے سے مختلف تھے، اس لمبے چوڑے صوبہ میں بہت سے شہر آباد تھے جن کے مکانات بازنطینی طرز پر قطار اندر قطار بنائے گئے تھے، اور یہی انداز باغوں کا بھی تھا۔ یہاں عرق انگور نکالنے کے کثرت سے کولھو تھے، لہلہاتے کھیت شاداب باغ اور پھل خوب تھے، اور ضروریات زندگی بہتات کے ساتھ مہیا تھیں، تجارت نفع بخش تھی، باشندے تیز فہم تھے، علم وادب کا چرچا تھا، سیاح لکھتا ہے "میں نے فقہ، ادب اور قرآن کا کوئی معمولی امام بھی ایسا نہ دیکھا جس کا کوئی خوارزمی شاگرد نہ ہو اور جس نے شہرت اور مرتبہ حاصل نہ کیا ہو" باایں ہمہ یہ لوگ روکھے تھے، نہ خوش زبان تھے، نہ خوش لباس، نہ خوش مذاق، نہ خوش اخلاق، ان کی روٹی چھوٹی، اور فرسخ بڑے تھے۔ خدا کی نوازش سے سارا ملک زرخیز اور ارزاں تھا، قرآن نہایت صحیح پڑھتے تھے، یہاں خوب ضیافتیں ہوتی تھیں، اور لوگ خوش خوراک تھے وہ نہایت بہادر بھی تھے اور لڑائی میں بے جگری سے لڑتے تھے، خوارزم کی لمبائی ایک سو چالیس میل اور اسی قدر چوڑائی تھی۔ مکان قطار اندر قطار تھے، نہریں اور دریا پانی سے خوب بھرے رہتے تھے، بکریاں بہت پالی جاتی تھیں اور مچھلیاں خوب کھائی جاتی تھیں۔ اس کا سب سے بڑا صدر مقام جو جیحون کے ہیطل والے علاقہ میں واقع تھا کاث تھا اور دوسرا صدر مقام جس کا محل وقوع علاقہ خراسان میں تھا جرجانیہ کہلاتا تھا[1]

کاث

اس کو شہرستان بھی کہتے تھے دریائے جیحون کے شرقی کنارہ پر واقع تھا، جامع مسجد بیچ

---

[1] مقدسی صہ ۲۸۴

بازار میں تھی، اس کے ستون سیاہ پتھر کے قدِ آدم اونچے تھے جن پر لکڑی کے ستونوں کی ایک اور قطار تھی، حکومت کے دفتر شہر کے وسط میں تھے، یہاں ایک خندق بھی تھا جو دریا کی باڑھ سے اجڑ گیا تھا، شہر سے کئی نہریں گذرتی تھیں، عمدہ جگہ تھی، علماء اور ادیب موجود تھے، ذرائع معاش آسان تھے، ضروریات زندگی مہیا تھیں، تجارت فروغ پر تھی، معمار نہایت ماہر تھے، قرآن خواں اہلِ عراق سے زیادہ صحیح اور پُر الحان قرارت کرتے تھے، باشندوں کی شکل وصورت اچھی تھی اور معلومات وسیع تھے، شہر طغیانی کی زد میں رہتا تھا، جلد جلد باڑھ آنے سے آبادی کنارہ سے برابر دور ہوتی جارہی تھی، شہر اَردَبیل[1] سے زیادہ گندا تھا، بہت سی نالیاں سڑکوں پر کھلی تھیں، زیادہ تر لوگ راستوں پر قضائے حاجت کرتے تھے، پاخانہ اور کوڑا گڑھوں میں بھر دیتے اور پھر اس کو شہر کے باہر ڈلوا دیتے تھے، سڑکوں پر گندگی کی ایسی ریل پیل تھی کہ پردیسی صبح کا اجالا ہونے سے پہلے باہر نہیں نکل سکتا تھا، باشندے گندگی کو روندتے ہوئے مسجدوں میں چلے جاتے تھے، ناشایستہ، کج خُلق اور پُرخور تھے، باہر کے آدمی کا دل اس شہر میں نہیں لگتا تھا۔[2]

جُرجانیّہ

یہ جیحون کے غربی کنارہ پر خوارزم کا دوسرا صدر مقام تھا، دریا ہر طرف سے شہر کو چھوتا ہوا گذرتا تھا، حکومت نے لکڑی اور ایندھن کے ڈاموں سے دریا کا رخ مشرق کی طرف پھیر دیا تھا اور اب وہ صرف ایک طرف سے شہر کو چھوتا ہوا گذرتا تھا، دریا سے نئی نہریں کاٹ کر نکالی گئی تھیں، شہر تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کر رہا تھا، شہر کے ایک دروازہ پر جس کا نام باب الحَجّاج تھا خلیفہ مامون نے ایک محل بنوایا تھا جس کا دروازہ حسن ودلربائی میں سارے خراسان میں بے نظیر تھا، مامون کے لڑکے علی نے اس محل کے سامنے ایک دوسرا محل تعمیر کرایا تھا جس کے سامنے ایک بڑا میدان بُخارا کے میدان سے مشابہ تھا، اس میدان میں بکریاں بیچی جاتی تھیں۔[3]

---

[1] اَردَبیل۔ صوبۂ آذربیجان کا ایک مشہور شہر تھا۔ [2] مقدسی ص۲۸۷-۲۸۸ [3] مقدسی ص۲۸۹

قوادیان

اس صوبہ کے بارے میں سیاح نے چند مجمل باتیں لکھی ہیں جن سے یہاں کی زندگی اور تمدن کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لکھتا ہے: قوادیان چھوٹا صوبہ تھا، جیحون اور صوبہ صغانیان کی سرحد سے ملتا تھا، اس صوبہ میں تین نہایت آباد شہر تھے، جن کے بیچ سے ہوکر دریا نکلتے تھے اور جیحون سے ہم کنار ہو جاتے تھے یہاں بہت سے پہاڑ تھے، سارا صوبہ آب وہوا اور معاشی وسائل کے لحاظ سے اچھا تھا۔[1]

ختل

بڑا صوبہ تھا جہاں بہت سے شہر تھے، صوبہ صغانیان سے زیادہ شاندار اور لمبا چوڑا تھا شہر صغانیان کے شہروں سے تعداد میں زیادہ تھے، اور تمدنی نعمتیں بھی وہاں سے زیادہ مہیا تھیں۔ یہ صوبہ سندھ کی سرحد پر واقع تھا، اس کے صدر مقام کا نام ھلبک تھا، یہ شہر صغانیان (صدر مقام صوبہ صغانیان) سے چھوٹا تھا، جامع مسجد شہر کے وسط میں تھی، پینے کا پانی نہروں سے آتا تھا، عمدہ گھوڑے پائے جاتے تھے، پھل خوب تھے اور دیگر تمدنی نعمتوں کی بھی کمی نہ تھی۔ صوبہ کے سب شہر آباد اور خوش حال تھے۔[2]

ضلعے

۱۔ ترمذ:۔ جیحون پر واقع ہونے والے شہروں میں سب سے بڑا شہر تھا، خوب صاف ستھری اور خوش آیند جگہ تھی، بازاروں میں اینٹوں کا فرش تھا، شہر فصیل میں تھا، فصیل کے باہر مزید آبادی تھی جس میں مکانوں کے علاوہ لوگ خیموں میں بھی رہتے تھے، بیرونی بستی میں ایک قہندز تھا جامع مسجد فصیل میں تھی، شہر شرقی وغربی دونوں کناروں پر آباد تھا، یہاں دریا خوب بھرا ہوا تھا اور اس کا پانی شہر کے دونوں بازوؤں تک پھیلتا تھا، کشتیاں ایک کنارہ سے دوسرے تک دوڑتی پھرتی تھیں، شہر کی اہمیت ایک بڑے گھاٹ کے طور پر تھی، کیوں کہ یہاں سے دونوں طرف کے قافلے دریا پار کرتے تھے۔[3]

۲۔ نوبدہ:۔ دریا کے شرقی کنارہ پر ایک چھوٹا شہر تھا، جامع مسجد شہر کے وسط میں تھی، سمرقند

---

[1] مقدسی ص۲۸۹۔۲۹۰ [2] مقدسی ص۲۹۰ [3] مقدسی ص۲۹۱

سے جو قافلے آتے تھے وہ اس شہر سے دریا عبور کرتے تھے[1]

۳۔ کالف :۔ بغداد اور واسط کی طرح یہ شہر جیحون کے دونوں کناروں پر واقع تھا، مغربی کنارہ پر ذوالقرنین نامی ایک رباط (سرائے یا چھاونی) تھا جس میں مسجد تھی، اور مشرقی کنارہ پر ایک دوسرا رباط تھا جس کا نام ذوالکفل تھا، سیاح نے لکھا ہے کہ کالف کے علاوہ جیحون کے ساحل پر کوئی جگہ اتنی موزوں نہ تھی جہاں دونوں بازوؤں پر شہر آباد ہو سکتا، وجہ یہ تھی کہ یہاں دریا کا کنارہ سخت اور ابھرا ہوا تھا۔ یہاں سے قافلے دریا پار کیا کرتے تھے[2]

۴۔ زمّ :۔ ساحل دریا پر بڑا شہر تھا، بازاروں کے وسط میں جامع مسجد تھی، بازار ڈھکے ہوئے تھے، شہر کی ضرورت کا پانی دریا سے آتا تھا، جس زمانہ میں غلہ خرمن ہوتا دریا کا پانی شہر کے وسط تک چڑھ آتا تھا۔ یہاں بھی قافلے دریا پار کرتے تھے[3]

۵۔ فربر :۔ علاقۂ ہیطل میں لگ بھگ تین میل دریا سے ہٹ کر آباد تھا، یہاں زراعت یا گاؤں کم تھے، زراعتی محصول ہلکا تھا، انگور نہایت لذیذ ہوتے تھے، پانی کی قلت تھی، شہر میں ایک آباد قہندز تھا اور کئی اچھے رباط تھے۔ جامع مسجد شہر کے دروازہ پر تھے، یہاں ایک رباط تھا (نصر بن احمد کا بنوایا ہوا) جہاں مسافروں کو کھانا کھلایا جاتا تھا، یہاں سے بھی قافلے دریا پار کرتے تھے[4]

۶۔ آمل :۔ علاقۂ خراسان میں دریا سے تقریباً تین میل ہٹ کر واقع تھا، خوب آباد جگہ تھی، اس نواح کے سارے ہی شہر آباد تھے، اور زندگی کی ضروریات سے مالا مال، شہر کے آس پاس بہت سے گاؤں تھے، زراعتی محصول بھاری تھا، پانی کی افراط تھی، بازار ڈھکے ہوئے تھے، اعلیٰ قسم کے انگور کثرت سے پیدا ہوتے تھے، جامع مسجد ایک ٹیلے پر تھی، شہر میں شیریں پانی کے بہت سے کنوئیں تھے۔ اس شہر سے بھی قافلے دریا پار کرتے تھے[5]

---

[1] مقدسی ص۲۹۱ [2] مقدسی ص۲۹۱ [3] مقدسی ص۲۹۱ [4] مقدسی ص۲۹۱

[5] مقدسی ص۲۹۱-۲۹۲

تاریخی حقایق

از

جناب مولانا محمد ظفیر الدین صاحب مفتاحی - دار العلوم معینیہ ساسخہ (مونگیر)

(۲)

یہ بزرگ زمانہ کے حالات سے بڑے تنگ دل رہتے تھے، فرماتے ہیں

"اس زمانہ میں جو لوگ پنج وقتہ نماز با جماعت پڑھ لیا کرتے ہیں۔ وہ ولی ہیں کہ اس زمانہ میں بے دینی بہت ہے"

مطلب یہ تھا کہ یہی غنیمت ہے، ورنہ کوئی پابندی سے باجماعت نماز پڑھنے کے لئے بھی تیار نہیں۔ آج خود سیکڑوں پیر اور پیرزادے ہیں۔ جو نماز سے کوسوں دور ہیں۔ صرف مرید آباد میں بادل ناخواستہ پڑھ لیا کرتے ہیں۔ تاکہ مریدین کی جماعت میں وقار کم نہ ہونے پاتے۔ اور لوگ بزرگ اور خدا رسیدہ سمجھنے پر مجبور ہوں۔

جو لوگ احکام دین سے روگردانی کرتے اور غلط قسم کا عذر پیش کرتے شاہ سلیمان تونسوی ان کو بڑی ملامت فرماتے، چنانچہ کچھ لوگوں نے روزہ کے لئے خشکی کا عذر پیش کیا تو فرمایا

"دنیادار رمضان المبارک کے روزے نہیں رکھتے، بلکہ یہ کہتے ہیں کہ ہمیں خشکی ہوتی ہے، یہ بات نفس کی گمراہی اور شیطان کے غلبہ کی بنا پر ہے"[1]

اسی طرح آپ نے ان لوگوں کی غلطی کو آشکارا کیا جو عملیات میں غلو پیدا کر لیتے ہیں چنانچہ فرماتے ہیں

"سالک کو چاہئے کہ عملیات میں وقت کو ضائع نہ کرے، ایسے مشغلے راہِ فقر کے ڈاکو اور رکاوٹیں ہیں، اصلی مقصود خدا کا یاد کرنا ہے . . . . . ذکر جہر یہ کلمہ لا الہ الا اللہ سب

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۶۳۶

اوراد و وظائف سے بہتر ہے؛ چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے "افضل ذکر لَا اِلٰہَ اِلَّا اللّٰہ ہے"[1]

آپ اندازہ لگائیں شاہ صاحب کو سنتِ نبیؐ سے کیسا عشق تھا، کوئی کام جو سنت کے خلاف ہوتا دیکھا اس پر خاموش نہ رہ سکے، اپنا فریضہ ادا کرتے چلے گئے، تاویل سے کہیں بھی کام نہیں لیا۔ سیدھے سادے دین کو پیچیدہ بنانے کی کبھی بھی سعی نہیں فرمائی، اسی کا نام محبتِ رسول صلعم ہے

ایک دفعہ فرمایا

"تم اپنے پیر سے جس قدر امداد چاہتے ہو، اور کائنات کے کاموں میں اس کا جس قدر دخل خیال کرتے ہو، یہ سب باتیں اس کے احاطۂ اختیار سے باہر ہیں، اللہ پر صحیح بھروسہ رکھو، سوائے اس کے کسی سے التجا نہ کرو، اسی سے عرض مدعا کرو، اور اسی پر اعتماد رکھو"[2]

آہ اب یہ صاف گوئی پیروں میں کہاں باقی رہی؟ اب تو کچھ پیر یہ سمجھانے کی سعی کرتے ہیں کہ جو کچھ کر سکتے ہیں ہم یا ہمارے سلسلہ کے بزرگانِ دین ہی کر سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حکومت کی باگ ڈور انہی ولیوں کے ہاتھوں میں دے رکھی ہے، اور اسی کا نتیجہ ہے کہ پیروں کی قبریں پرستشگاہ بن گئیں، ان کی پوجا ہونے لگی، پھول چڑھنے لگے، چادروں سے ڈھکی جانے لگیں، اور حد یہ ہے کہ قبر کو پیرا در پیرزادے سجدہ کرنے لگے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُون۔

شاہ محمد سلیمانؒ نے علماء کو بھی تنبیہ کی اور فرمایا

"علماء کی گمراہی خود انہی تک محدود نہیں رہتی، عوام بھی اس کا شکار ہو جاتے ہیں، ایک عامی کی گمراہی خود اسی تک رہتی ہے، لیکن ایک عالم کی بے راہ روی سے عوام بھی متاثر ہو جاتے ہیں، علماء نہ تو جنت میں تنہا جاتے ہیں نہ دوزخ میں، دونوں جگہ کثیر جماعت ان کے ساتھ ہوتی ہے لہٰذا علماء کو چاہیے کہ علم پر عمل کریں"[3]

اب اخلاص کے ساتھ یہ صاف گوئی عنقا ہوتی جا رہی ہے، اگر کوئی تنقید کرتا ہے بھی تو علماء کی صرف تذلیل و توہین کے ارادے سے، اخلاص مفقود ہوتا ہے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۶۳۷ [2] ایضاً ص ۶۳۸ [3] ایضاً ص ۶۳۹

ایک جگہ شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں

"علم بغیر عمل، اور عمل بغیر صحیح عقیدۂ اہل سنت و جماعت، کوئی فائدہ نہیں پہنچاتا"[1]

جو بات فرمائی اس کے صحیح ہونے میں کس کو شبہ ہو سکتا ہے؟

ایک دفعہ آپ نے فرمایا تھا

"پہلے زمانہ میں قاضی صاحب نسبت ہوتے تھے، اب رشوت خور ہیں"[2]

پھر رشوت خوری کی مذمت فرماتے ہیں۔

"جو کوئی حرام کھاتا ہے، اس کا رزق تنگ ہو جاتا ہے، اور وہ عاجز ہو جاتا ہے، چنانچہ دیکھتے نہیں کہ چور (جو حرام مال کھاتا ہے) ہمیشہ ذلیل و خوار ہوتا ہے"[3]

اب ایسی صاف گوئی کہاں باقی رہی؟ برائیوں کا رات دن ارتکاب ہوتا ہے، لوگ دیکھتے ہیں، مگر اکثر لوگوں کی زبان تک نہیں ہلتی، وہ بڑی آسانی سے برائیوں کو برداشت کر لیتے ہیں، اور اپنی ذمہ داری بھول جاتے ہیں۔

شریعت کے معاملہ میں آپ بہت سخت گیر تھے، فرمایا کرتے تھے۔

"جو شخص چاہتا ہے کہ حق تعالیٰ کا محبوب ہو جائے، اسے چاہیئے کہ ظاہر اور باطن میں شریعت کی متابعت کرے، چنانچہ قرآن پاک میں فرمایا گیا ہے اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ"[4]

ایک دفعہ فرمانے لگے

"کہ اگر اصحاب نبی صلی اللہ علیہ وسلم بالفرض اس وقت موجود ہوتے، تو اس زمانہ کے لوگوں کو کافر کہتے اس لئے کہ انھوں نے شریعت کا اتباع چھوڑ دیا ہے، اور مخلوق ان کو دیوانہ کہتی، اس لئے کہ ان کے افعال و اخلاق شریعت کے مطابق ہوتے"[5]

آپ نے موجودہ دور کے لوگوں کے اعمال و اخلاق کا معیار جس طرح واضح فرمایا ہے، اس میں کوئی شبہ نہیں۔ صحابۂ کرامؓ کا نقشِ قدم اب کہاں باقی رہا؟ دین کے معاملہ میں سستی عام بات ہے، کتاب و

---

[1] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۶۲۱ [2] ایضاً صفحہ ۶۲۲ [3] ایضاً صفحہ ۶۲۳ [4] ایضاً صفحہ ۶۲۴

سنت کی پیروی جیسی چاہئے وہ لگ بھگ ناپید ہو رہی ہے ؎

تجھے آبار سے اپنے کوئی نسبت ہو نہیں سکتی   کہ تو گفتار وہ کردار، تو ثابت، وہ سیارا

شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ اکثر یہ قصہ سنایا کرتے تھے کہ

"ایک مرتبہ جب سکھوں نے ملتان کا محاصرہ کیا، تو ایک بزرگ حضور رسول مقبول صلعم کی خدمت میں امداد کے طالب ہوئے۔ خواب میں رسول اللہ صلعم نے ارشاد فرمایا "مری امت نے مری پیروی چھوڑ رکھی ہے"[1]

کاش آج کے مسلمان سوچتے کہ سنت کی پیروی کتنی اہم چیز ہے، اور اتباعِ سنت کے ترک سے قوم اور ملک کو کس قدر نقصان ہے؟ افسوس یہ احساس بھی باقی نہ رہا۔

لکھا ہے کہ حکومت کے باب میں ان کا خیال حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ کے اس خیال کے مطابق تھا۔

"کہ حکومت کفر کے ساتھ چل سکتی ہے لیکن ظلم و ناانصافی کے ساتھ نہیں"[2]

یہ بات اپنی جگہ بہت درست ہے، کفر و فسق حکمراں کی ذات تک محدود ہوتا ہے مگر ظلم و جور اور ناانصافی سے ملک تباہ و برباد ہو جاتا ہے، پبلک اپنے حقوق سے محروم ہو جاتی ہے، کمزور اور نہتے جور و ظلم کے شکار بنائے جاتے ہیں، کھلی بات ہے ایسی حالت میں حکومت کیوں کر چل سکتی ہے،

انگریزوں نے ظلم اور ناانصافی کی تو باوجود اپنی زبردست طاقت کے ہندوستان سے گئے، کل اگر آزاد بھارت اور پاکستان کے حکمراں بھی ظلم و جور اور ناانصافی پر تُلے رہے تو یہ بھی حکومت کی گدی سے محروم ہو کر رہیں گے۔

مگر ساتھ ہی حضرت شاہ سلیمان صاحب رحمۃ اللہ علیہ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

"ظالم حکمراں کا مسلط ہونا، لوگوں کی بداعمالی کی دلیل ہے،" "اعمالکم عمالکم" پر ان کا اعتقاد تھا، اور اپنی مجلسوں میں اسی پر اصرار کیا کرتے تھے، کہا کرتے تھے کہ جب خدائے تعالیٰ کسی ملک کو

---

[1] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۶۲۵ [2] ایضاً صفحہ ۶۲۹

تباہ کرنا چاہتا ہے تو اس کو ظالم حاکموں کے قبضہ میں دے دیتا ہے، یہ شعران کے وردِ زبان رہتے

چو خواہد کہ ویراں کند عالمے ۔۔۔ نہد ملک در پنجہ ظالمے

بقومے کہ نیکی پسند د خدائے ۔۔۔ دہد خسروِ عادل و نیک رائے

(رب العزت جب کسی ملک کو تباہ و برباد کرنا چاہتا ہے تو اس پر ظالم کو تسلط دے دیتا ہے اور جو قوم نیک خو اور حق پرست ہوتی ہے، اس کا حکمران رب العزت عادل و نیک شخص کو بناتا ہے)

بلا شبہ سارے مصائب اور پریشانیاں اعمال و اخلاق کی پستی اور کتاب و سنت سے بے پروا ہی کا نتیجہ ہیں ۔ کاش مسلمان اس راز کو سمجھتے اور اس پر یقین کر کے عمل کی درستی کی فکر میں لگ جاتے ۔

شاہ سلیمان صاحبؒ نے اس پر بڑا زور دیا ہے ایک جگہ فرماتے ہیں

"ہر بلا اور مصیبت جو انسانوں پر نازل ہوتی ہے، ان کے اعمالِ ناشائستہ کا نتیجہ ہوتی ہے، چنانچہ حدیث شریف میں آیا ہے "اعمالکم عمالکم" یعنی تمہارے کردار تمہارے حاکم ہیں اگر تمہارے اعمال نیک ہوں گے، تو تمہارے حاکم بھی اہلِ اسلام میں سے اور عادل ہوں گے اور اگر اس کے برعکس ہوں گے تو حاکم بھی کافر اور جابر ہوں گے"[1]

ضرورت ہے کہ مصیبت زدہ اور پریشان حال لوگ اس اعتقاد کو دل میں جگہ دیں، اور اپنی اصلاح اپنے سے شروع کر دیں، دوسروں کو گالیاں دینے سے زیادہ مفید یہی شکل ہو گی، کسی جماعت کو کوسنا مصائب کے پہاڑ کو نہیں ٹال سکتا، جو لوگ حکومت سے انصاف کی درخواست کرتے ہیں وہ اپنی جگہ درست کرتے ہیں کہ یہ ان کا شہری حق ہے مگر ساتھ ہی بنیادی اصلاح کی طرف توجہ دینے کی زیادہ ضرورت ہے۔

شاہ سلیمان صاحب تونسوی رحمۃ اللہ علیہ غیر قوموں سے خواہ مخواہ اُلجھنے کو پسند نہیں فرماتے تھے، ان کی خواہش تھی کہ ہندوؤں کے ساتھ بھی خوشگوار تعلقات رکھے جائیں ۔ چنانچہ لکھا ہے کہ آپ اپنے مریدوں کو ہدایت فرماتے ۔

"اپنے مذہب، اپنے تمدن، اور اپنی شریعت پر قائم رہو، لیکن ساتھ ہی ساتھ دوسرے مذاہب

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص ۶۹۴ [2] ایضاً ص ۶۵۱

کے ساتھ اچھا برتاؤ کرو۔ اپنے تعلقات میں کبھی بدمزگی پیدا نہ ہونے دو ——— سالک کو چاہئے کہ کسی کو رنج نہ پہنچائے۔ بلکہ ساری مخلوق سے صلح رکھے"[1]

جو لوگ مسلمان عالمانِ دین کو تنگ نظر کہتے ہیں، یا دیندار طبقہ کو غیر مذاہب والوں کا دشمن سمجھتے ہیں، وہ آنکھیں کھولیں اور اس "ہدایت نامہ" کو بغور پڑھیں اور پھر فیصلہ کریں۔

دنیا کو یقین کرنا چاہئے کہ اسلام دوسروں کا دشمن ہرگز نہیں ہے ہاں وہ گمراہ اور بھٹکے ہوئے لوگوں کو رشد و ہدایت کی البتہ تاکید کرتا ہے، اور وہ بھی نرمی سے، سختی سے نہیں، جبر و تشدد اس مذہب میں خواہ مخواہ قطعاً جائز نہیں۔

شاہ سلیمان تونسویؒ فرمایا کرتے تھے

"اہلِ دنیا "سفید چشم" اور بے وفا ہوتے ہیں، جب ان پر کوئی مصیبت آتی ہے، تو پیر و فقیر کی تلاش میں پھرتے ہیں، اور آہ وزاری کرتے ہیں، لیکن ویسے بلا مطلب وہ کبھی فقراء کی طرف متوجہ نہیں ہوتے۔"

اس سلسلہ میں آپ یہ حکایت بیان فرماتے تھے۔

"ایک مرتبہ شیخ سعدیؒ حضرت خواجہ فریدالدین عطارؒ کی ملاقات کے لئے گئے، شیخ عطارؒ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا ——— تو امیروں سے دوستی رکھتا ہے میں تجھ سے نہیں ملتا

شیخ سعدیؒ کو سخت صدمہ ہوا چھ ماہ تک وہاں رہے، پھر حضرت شیخ فریدالدین عطارؒ نے بلا کر حاضری کا شرف بخشا۔"[2]

ہمارے اس زمانہ کے خاندانی پیرزادے اور پیر صاحبان نیز علماء کرام اس واقعہ کو پڑھیں اور بصیرت حاصل کریں جن کا حال یہ ہے کہ اگر کوئی غریب مولوی ان کی خانقاہ میں ملنے چلا گیا، تو کبر و نخوت سے ان کی پیشانی پر بل پڑ گیا، اس سے اس طرح ملے گویا کوئی اجنبی اچھوت آگیا ہے، اور اگر کوئی امیر یا امیرزادہ آگیا، تو ان کی پیشانی تمتما گئی، اٹھ کر ہنستے ہوئے بغل گیر ہوئے، اور تپاک سے ان کو جگہ دی، اور پھر تھوڑی دیر کے لئے

---

[1] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۱۹۵ [2] تاریخ مشائخ چشت صفحہ ۲۵۶

دل دماغ سب اس دولت مند آدمی کے آگے جھکے رہے، اے کاش اس ذہنی غلامی کا ہمارے پیرادر پیرزادوں کو احساس ہو۔

اس سلسلہ میں خود شاہ تونسوی رح کا ایک دلچسپ واقعہ سننے کے لائق ہے، لکھا ہے، کہ ایک مرتبہ نواب محمد صادق خاں نے خواجہ مہاروی رح کے صاحبزادوں سے جرمانہ وصول کیا، شاہ تونسوی رح کو خبر ہوئی تو بڑا صدمہ ہوا، اور نواب صاحب سے خط وکتابت بند کر دی، نواب صاحب کو اس کا احساس ہوا، تو انھوں نے کچھ لوگوں کو معافی کی درخواست لے کر آپ کی خدمت میں بھیجا۔ اتفاق سے خواجہ مہاروی رح کے صاحبزادے بھی موجود تھے، ان کو بھی اس وفد کے ساتھ کر دیا، چنانچہ صاحبزادے نور احمد صاحب وفد کے ساتھ خواجہ تونسوی رح کی خدمت میں حاضر ہوئے، اور ان سے نواب صاحب کے یہاں چلنے کی درخواست کی۔ پہلے تو ٹالا۔ مگر جب صاحبزادے صاحب کا اصرار ہوا تو فرمانے لگے

"صاحبزادے صاحب آپ کو اس کام کے لئے یہاں تشریف لانا ہرگز ہرگز مناسب نہ تھا، آپ کی خاطر تو میں نواب صاحب سے ناراض ہوا تھا، . . . . اب آپ ہی خود تشریف لائے ہیں ——— صاحبزادہ صاحب نے جواب دیا، قبلہ کیا کریں مجبور و لاچار ہو کر آئے ہیں۔ ہماری گذران اس ملک میں ہے ——— خواجہ صاحب رح نے فرمایا نہیں نہیں۔ وہ تمہارے ملک میں ہے اور اس کی گذران تمہارے ملک میں ہے، خداوند کریم کا بھی لحاظ چاہئے، آپ کے والد صاحب قطب الاقطاب تھے، آپ خدا کے دروازہ کو چھوڑ کر اہلِ دنیا کے پاس التجا لے جاتے ہیں؟"[1]

موجودہ دور کے سجادہ نشین حضرات اس واقعہ کو غور سے پڑھیں اور اگر کوئی بھولا ہوا سبق یاد آ جائے تو دعائیں دیں ——— اور پھر اپنے کو پہچانیں، دولت پرستی کسی بھی پیر اور پیرزادہ کو زیب نہیں دیتی۔

؎ بھٹکے ہوئے آہو کو پھر سوئے حرم لے چل   اس شہر کے خوگر کو پھر وسعتِ صحرا دے

خواجہ شاہ سلیمان تونسوی رح بڑی خوبیوں کے مالک تھے اور بڑی اصلاح فرمائی، ۷ صفر ۱۲۶۷ھ کو پیدا ہوئے۔ آپ کے ایک خلیفہ حافظ محمد علی صاحب رح کا واقعہ ہے۔

---

[1] تاریخ مشائخ چشت ص۵۵۹

"ایک مرتبہ حیدرآباد میں حضرت شاہ یوسف کے مزار پر حاضری کا اتفاق ہوا، تو دیکھا کہ وہاں طوائفوں کا ناچ ہو رہا ہے، آپ کو اس قدر غصہ آیا، کہ محفل میں پہنچ کر مشائخ کو للکارا ——— یہ بال تمہاری ڈاڑھی کے نہیں ہیں۔ بلکہ زنار کے تار ہیں، اولیاء اللہ کے مزاروں پر ایسا فسق و فجور ہوتا ہے، اور تم دیکھتے ہو ہے،"

دینی حمیت و غیرت اسی کا نام ہے، منکر پر خاموشی پسند نہیں فرمائی گئی، بلکہ علی الاعلان دیکھنے والوں کو ڈانٹا گیا، اس حق گوئی کی اس دور میں بڑی ضرورت ہے۔ سننے میں آیا ہے یوپی کے بعض مزارات پر آج بھی یہی رسم قبیح انجام دی جاتی ہے۔ جو پیرزادے اس میں مبتلا ہیں ان کو توبہ کرنا چاہئے، اور پھر آئندہ سے پرہیز اور اجتناب کا عزم بالجزم۔

لہ تاریخ مشائخ چشت ص۲۶۷

عہدِ مصحفی کے ادبی رجحانات

از

(جناب ڈاکٹر خواجہ احمد فاروقی صاحب ایم۔ اے پی ایچ ڈی ریڈر دہلی یونیورسٹی دہلی)

مصحفی نے تین تذکرے لکھے ہیں: تذکرہ ہندی، ریاض الفصحا اور عقد ثریا۔ ید بیضا اور نوادر ازل جو مشیر احمد صاحب علوی نے دریافت کی ہیں، قطعی طور پر جعلی کتابیں ہیں۔

تذکروں پر جو اعتراضات عمومی طور پر کئے گئے ہیں وہ یہ ہیں:

(۱) "جانب داری اُن کا شعار تھا اور خود ستائی اُن کا مقصود۔"

(۲) اِن تذکروں میں تحقیق و تنقید نہیں، محض انتخابِ کلام ہے۔

(۳) اِن کی تدوین میں تاریخ نگاری کے اصول پر عمل نہیں کیا گیا۔

(۴) اِن سے شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور نشیب و فراز کا اندازہ نہیں ہوتا۔

(۵) اِن میں نقل در نقل ہے اور بعض صورتوں میں ماخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔"

یہ اعتراضات صرف ایک حد تک صحیح ہیں، لیکن زیادہ تر ان تذکروں سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔ ان کو پڑھتے وقت ہمیں اس دور اور عہد کے اصولِ تذکرہ نگاری پر نظر رکھنا چاہیے۔ اور ساتھ ہی، یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ مشرق اور مغرب میں کس قسم کا اختلافِ مذاق، فطری طور پر موجود ہے۔ ہر زمانہ اور ہر ملک کے ادب کو اس کی تاریخیت سے قطع نظر کرکے، ایک ہی فیتے سے ناپنا کسی طرح بھی صحیح نہیں۔

تذکرہ، فنِ سیرت کی ایک شاخ ہے۔ لیکن فنِ سیرت نہیں۔ اس لئے اس میں ایجاز و اختصار کا ہونا لازمی ہے۔ اس زمانے کے لکھنے والے زیادہ تر پُرمعنی واقعات ہی کو پیش کرتے تھے اور شاعر کی تصویر محض چند لکیروں سے کھینچتے تھے۔ اس کے علاوہ مشرق کا ایک اصول (اچھا، یا بُرا، ابھی اس سے بحث نہیں) یہ بھی تھا کہ "محتسب را درونِ خانہ چہ کار"! وہ بزرگوں کی عیب جوئی کو حتی الوسع

ناپسند کرتے تھے اور سیرت نگاری کا موجودہ نظریہ "طشت از بام افگندن" اُن کے لئے بالکل اجنبی تھا۔

مغرب میں بھی عہدِ وکٹوریہ تک "سرایں شیشہ فرو بند" کے اصول پر عمل رہا ہے۔ لوگ اس پر آمادہ نہیں تھے کہ بائرن کے نجی خطوط شائع کئے جائیں۔ ٹینی سن نے اسی لئے خفا ہو کر کہا تھا کہ "پبلک کو بائرن کی آشفتہ مزاجیوں اور بے راہ رویوں کے جاننے کا کیا حق ہے۔ اس نے دنیا کو پاکیزہ کلام اور افکارِ نغز دیئے ہیں اہلِ دنیا کو اسی سے مطمئن ہو جانا چاہئے۔ اور بس"۔

مجھے حیرت ہوتی ہے یہ دیکھ کر کہ مصحفی نے ان پابندیوں کے باوجود اپنے تذکروں میں کس طرح بے مثل معلومات کا خزانہ جمع کر دیا ہے۔ اُن سے ریزہ چینی آسان نہیں ہے۔ بڑی محنت اور بہت غور و فکر کی ضرورت ہے۔ لیکن اگر ہم یہ محنت گوارا کر لیں تو مصحفی اور عہدِ مصحفی کا ایک نقشہ ہماری آنکھوں کے سامنے کھنچ جائے گا۔ میں نے ذیل کی سطور میں صرف ایک پہلو کو لیا ہے، یعنی مصحفی کے زمانے کی ادبی محفلیں'۔ اور اُن کا معیار' اور میرے اصلی مآخذ مصحفی کے تذکرے ہی ہیں۔

اصل موضوع کی طرف رجوع کرنے سے قبل ایک بات اور عرض کر دوں جو مصحفی کے مآخذ سے متعلق ہے تاکہ ان کی مورخانہ حیثیت واضح ہو جائے۔

ہمارے تذکروں پر ایک عام اعتراض جیسا کہ میں نے ابھی عرض کیا یہ ہے کہ اُن میں مآخذ کا ذکر نہیں ہوتا۔ مصحفی کے سلسلے میں یہ اعتراض کلیتاً صحیح نہیں ہے۔ افسوس ہے انھوں نے میر کے تذکرہ نکات الشعرا کا حوالہ نہیں دیا۔ حالانکہ اُن کے تذکرے میر کے اسکول ہی سے متعلق ہیں۔ لیکن مولوی عبدالحق صاحب کی یہ رائے بھی صحیح نہیں کہ انھوں نے صرف میر حسن، گردیزی، اور قدرت اللہ شوق کے حوالے دیئے ہیں۔ ہاتف، ثبات، نکہت، اور ذکا کے بیان میں انھوں نے والہ داغستانی کے تذکرہ ریاض الشعرا کا ذکر کیا ہے۔ مردم دیدہ کا حوالہ انھوں نے حاکم کے بیان میں دیا ہے۔ اسی طرح آصف کے بیان میں انھوں نے آزاد کے "خزانۂ عامرہ" کا ذکر کیا ہے۔

اس گفتگو سے میرا مقصد یہ ہے کہ مصحفی نے نقل در نقل نہیں کی، انھوں نے حوالے دیئے ہیں۔ اور جس بات کی تحقیق نہیں ہوئی اس کے متعلق صاف لکھ دیا ہے کہ مجھے نہیں معلوم۔ اُن کی رائیں بڑی حد

تک محققانہ، متوازن - اور معتدل ہیں - ان تذکروں پر ایک اور عام اعتراض یہ ہے کہ ان سے شاعری کے عہد بہ عہد ارتقا اور نشیب و فراز کا اندازہ نہیں ہوتا۔ لیکن مصحفی نے اپنے زمانے کے ادبی رجحانات اور میلانات کی طرف جابجا اشارے کئے ہیں - جو ادبی رفتار کے سمجھنے میں بہت مفید ہیں۔

حاتم کے بیان میں انھوں نے لکھا ہے کہ ولی کے دیوان کا دہلی آنا تاریخ کا اہم واقعہ ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ دہلی میں اردو شاعری کا باقاعدہ آغاز ۱۱۳۲ھ / ۱۷۱۹ء سے ہوا جب ولی کا دیوان دہلی پہنچا اور اسے اشتیاق نے ادب کے ہاتھوں پر لیا۔

گویا ولی ایک تاریخی ضرورت بن کر دہلی آئے تھے - یہاں کے شاعر اس گھریلو زبان میں شعر کہنا تو چاہتے تھے لیکن اُن کے سامنے کوئی اچھی اور قابلِ تقلید مثال نہیں تھی - : مصحفی کے الفاظ یہ ہیں :-

روزے پیشِ فقیر، شیخ حاتم نقل می کرد کہ

"در سنِ دویم فردوس آرام گاہ، دیوانِ ولی در شاہجہاں آباد آمدہ و اشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ با دو سہ کس کہ مرادِ ناجی و مضمون و آبرو باشد بنائے شعر ہندی را بہ ایہام گوئی نہادہ دادِ معنی یابی و تلاشِ مضمون تازہ می دادیم -

ولی کا کلام "زبان اور خیالات کا وہ آخری نقطۂ ارتقا ہے جسے تاریخ عرصے سے طے کر رہی تھی۔" اُن کا یہ کمال معمولی نہیں ہے کہ لوگ فارسی کو چھوڑ کر اردو میں لکھنے لگے :۔

"و اشعارش بر زبانِ خورد و بزرگ جاری گشتہ"

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدیوں کا بند ٹوٹ گیا ہے اور وہ شاعر جو اردو میں لکھنا کسرِ شان سمجھتے تھے۔ ریختہ کی طرف متوجہ ہو گئے حقیقت یہ ہے کہ تاریخی قوتیں ولی کے ساتھ تھیں - فارسی مغلوں کے زوال کے ساتھ زوال پذیر تھی اور اردو کا ستارہ عروج پر تھا۔

اردو اس وقت سیال حالت میں تھی - ابھی اس کے ادبی معیار قایم نہیں ہوئے تھے - لیکن جن لوگوں نے اس پر اپنے نام ثبت کر کے اس کا ایک معیار قایم کیا وہ فارسی شاعری ہی کے دل دادہ نہیں تھے بلکہ اُن کی ذہنیت، رجحانات، اور خیالات سب فارسی ہی نے تعمیر کئے تھے - اس لئے وہ شعرا نے

فارسی (اور خاص طور پر متاخرین شعرائے فارسی) سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ ایہام جو اتفاق سے ہندوستان کا سبزۂ خود رو بھی تھا، اسی راستے سے اُن کے کلام میں داخل ہوا ہے۔

ایہام کی مثالیں، ولی، داؤد، سراج، عزلت، آبرو، مضمون، حاتم، ناجی اور یک رنگ وغیرہ کے یہاں بہ کثرت ملتی ہیں۔ ان سے اردو شاعری کو نقصان پہنچا اور وہ کیف و لذت سے محروم ہوگئی۔ لیکن جلد ہی اس کے خلاف ردِ عمل بھی شروع ہوگیا۔ اور یہ غیر فطری التزام و تصنع مردود ٹھہرا۔ حاتم، ایہام گوئی کے بڑے علم بردار تھے لیکن وہ ۱۱۶۸ھ ۱۷۵۵ء میں اپنے کلام کا انتخاب دیوان زادہ کے نام سے کرنے پر مجبور ہوئے جو دورِ اصلاح میں سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے۔: مصحفی لکھتے ہیں:۔

"الحال کہ در دورۂ ما، زبانِ ریختہ بسیار بہ پاکیزگی و عمدگی رسیدہ، مشارٌ الیہ ہم مرتبۂ سخن تازہ گویاں فہمیدہ دیوانِ قدیم خود را از طاقِ دل افگندہ، دیوانِ جدید بہ زبانِ ریختہ گویانِ حال ترتیب داد و "دیوان زادہ" نامش گزاشتہ"

ایہام گوئی کے خلاف جو تحریک شروع ہوئی اس میں اس دور کے تمام اکابر شعرا شریک تھے۔ مصحفی نے میرزا مظہرؒ کے متعلق لکھا ہے۔

"در ابتدائے شوقِ شعر کہ ہنوز از میر و میرزا کسے در عرصہ نیامدہ بود و دورِ ایہام گویاں بود، اول کسے کہ ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ او ست"

ایہام کے متعلق خود مصحفی کی رائے یہ ہے "فقیر اشعار ایہام را دوست نمی دارد"

مصحفی نے دورِ ایہام گویاں اور دورِ اصلاح و ترقی کو، قدیم و جدید کے ناموں سے بھی یاد کیا ہے سکندر کے بیان میں لکھتے ہیں: "اکنوں ہم گاہ گاہ فکر شعر بطور قدیم و جدید می کند"

یہ اکابر شعرا جو اصلاح کے میدان میں گامزن تھے وہ فارسی پر فریفتہ تھے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ فارسی کے مطالب کو اردو کے لباس میں پیش کریں۔: مرزا مظہرؒ ہی کے متعلق لکھتے ہیں۔

"در دَورِ ایہام گویاں اول کسے کہ شعر ریختہ بہ تتبع فارسی گفتہ او ست" آگے چل کر ان کو "نقاش اول ریختہ" کہا ہے۔

ان کوششوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسی کا چراغ ٹمٹمانے لگا اور سب لوگ نو عروسِ ریختہ ہی کے خط و خال پر مرنے لگے۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"رواج شعرِ فارسی در ہندوستان بہ نسبت ریختہ کم است در ریختہ ہم فی زمانا بپایہ اعلیٰ فارسی رسیدہ"

اس کے علاوہ مصحفی نے دو اور رجحانات کا بھی ذکر کیا ہے اول "تلاشِ مالمیانہ" اور دوسرا "مسلسل گوئی" و غزل در غزل گفتن"۔ یہ رجحانات میر اور جرأت کے یہاں موجود ہیں۔

مصحفی نے مرزا احسن علی احسن کے ذکر میں "احتیاطِ محاورہ" اور "صحت زبان" پر زور دیا ہے اور ان اجزا کو "قوتِ شاعری" میں شامل کیا ہے۔

مصحفی کا خیال یہ ہے کہ شاعری بغیر درویشی کے ممکن نہیں ہے اور حقیقت بھی یہ ہے کہ ولی سے اصغر گونڈوی تک اردو پر تصوف کا گہرا اثر رہا ہے۔ اُن کے الفاظ یہ ہیں:۔

"والحق کہ درویشی و شاعری دوش بدوش راہ می رود"

مصحفی صرف الفاظ کے ہیر پھیر کو بلند شاعری نہیں سمجھتے انھوں نے "معنی تازہ" اور "خیال رسا" کو بھی اپنے تذکروں میں اہمیت دی ہے اور اس کو شاعری کا جزوِ اعظم سمجھا ہے۔ ساتھ ہی ساتھ اُن کا خیال یہ بھی ہے کہ شعر گوئی کے لئے آسائشِ طبیعت اور فراغِ خاطر کی ضرورت ہے گویا اگر ایک صناع اور شاعر کو معاشی آسودگی حاصل نہیں ہے تو وہ ادب کی خدمت نہیں کر سکتا۔ حیران کے بیان میں لکھتے ہیں:

"از بسکہ اوقاتش صرف معاشِ دنیاداری شدہ دمی شود اکثر در مشاعرہ بہ ہنگام خواندن عذر کم مناسبتیٔ طبع بہ شعر کردہ، والحق کہ دروغ نباشد، چراکہ ایں فن بے تعلقی بسیار می خواہد"

مصحفی شعر کی جمالیاتی بنیادوں سے بھی ناواقف نہیں ہیں اور اس پر یقین رکھتے ہیں کہ اچھی اور بڑی شاعری بغیر تجربہ اور فکر کی مدد کے نہیں کہی جا سکتی۔ تاباں کے متعلق اُن کا خیال ہے کہ اُن کا "نہال قامتِ رعنائی" لوگوں کے شیرازۂ جان سے تیار ہوا تھا اور رنگین کے یہاں جو رنگینی ہے اس کا راز یہ ہے کہ اُن کی طبیعت عشق باز تھی:

"چوں مزاجش عشق باز افتادہ، اکثر قطعہ ہائے خوب خوب و غزل و نامہ ہائے نغز نغز بہ سلکِ

تعلم کشیدہ":

میر سوز کے متعلق لکھتے ہیں۔

"کمال ہائے ایں بزرگ ماورائے کمال شاعری و درویشی بسیار اند، چنانچہ در تیر اندازی و سواریِ اسپ و نوشتنِ خط نستعلیق و شفیعا و نازک بندی و نزاکت فہمی شعر، و آداب صحبت ملوک و سلاطین، و ظرافتِ طبع، و خندہ روئی و مذامت پیشگی و تحقیل معاش و گفتن کلمۃ الخیر در حق دیگرے ..... نظیر خود ندارد۔"

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اچھا اور بڑا شاعر "جامع جمیع علوم غریبہ" ہوتا تھا جیسا کہ میر درد کے کمالِ موسیقی، جولاں کی کمال تیر اندازی، حکیم کی کمال تاریخ دانی اور رضا کی طغرا نویسی سے ظاہر ہے۔ اور یہی کمال ان کے اندر استغنا اور بے پروائی بھی پیدا کر دیتا تھا۔

میر سوز کے حال میں لکھتے ہیں:

"دبایں ہمہ استغنائے مزاج کہ خاصہ شعراست نظیر خود ندارد"

اس زمانے میں مختلف طبقے گیسوئے اردو کی مشاطگی میں مصروف تھے۔ مصحفی نے معمار، آتشباز، حجام، سپاہی، قلندر، صوفی، امرا، ورد سا سب ہی کا ذکر کیا ہے اور یہ سب ہی اردو کے شیدا و فریفتہ تھے مصحفی نے یہ بات صراحت سے لکھی ہے کہ اس وقت فارسی، مغلوں کے سیاسی زوال کے ساتھ انحطاط پذیر تھی اور اردو کا ستارہ عروج پر تھا۔ تاریخی توتیں اس کے ساتھ تھیں۔ اور شعرائے فارسی شرفا کی زبان چھوڑ کر اس عوامی بولی کو منہ لگا رہے تھے۔ مصحفی لکھتے ہیں:

"در ریختہ فی زمانہ بپایۂ اعلیٰ فارسی رسیدہ"

مرزا مغل سبقت ایرانی تھے لیکن اب فارسی کو چھوڑ کر اردو ہی میں شعر کہتے تھے۔ لکھتے ہیں:

"بہ مقتضائے موزونیِ طبع، فکرِ شعرِ ہندی موافق رواج زمانہ کردہ"

مرزا زین العابدین نواب سالار جنگ کے فرزندوں میں تھے جن کے یہاں اٹھتے بیٹھتے فارسی ہی کا چرچا تھا لیکن اب یہ حال تھا کہ

"بہ سبب موزونیِ طبع، عشقِ شعر ہندی از طفولیت دامن گیرِ حال بود رفتہ رفتہ بہ سنِ ہفدہ سالگی۔۔۔۔ دیوانے ترتیب دادہ"

اردو کے فروغ میں مجالسِ سماع کو بھی خاص طور پر دخل ہے مصحفی نے عنایت اللہ کے بیان میں لکھا ہے:

"در مجلسِ سماع ہمیشہ در وجد و حال شریک یاران ست"

خواجہ میر درد کے حال میں لکھا ہے:

"ہر ماہ بتاریخ دویم بر مزار پدر خود مجلسِ غنا ترتیب می داد، آں روز ہمہ خورد و بزرگ شہر حاضر مجلسِ او می شدند"

اِن محفلوں میں فارسی کے ساتھ اردو کی غزلیں بھی پڑھی جاتی تھیں اور وہ عوام کے دل میں گھر کرتی جاتی تھیں۔ ان کے علاوہ میلے ٹھیلے بھی تھے جہاں اردو کی عوامی شاعری کو پھلنے پھولنے کے پورے مواقع تھے۔ مقصود کے بیان میں لکھتے ہیں:"

"کلامِ داہیلش را در ہنگامہ ہا و میلہ ہا می خوانند خصوصاً در ایامِ ہولی"

اس زمانے میں مشاعروں اور مراختوں کی جیسی بہتات ہوئی اس کی مثال تاریخ میں نہیں ملتی۔ مشاعروں کی موجودہ شکل ہندوستانی ہے اس کا اردو میں باقاعدہ رواج میر کے زمانہ سے شروع ہو گیا تھا۔ دلّی کے شاعروں نے باہم شعر کہنے کے لئے مجلسِ مراختہ قایم کی تھی، میر نکات الشعرا میں لکھتے ہیں: گاہ گاہ در مجلس مراختہ کہ ایں لفظ بروزنِ مشاعرہ تراشیدہ اند ملاقات می شود۔ غالباً اس زمانے کا سب سے قدیم مراختہ وہ ہے جو خانِ آرزو کے مکان پر منعقد ہوتا تھا اور جس میں سودا، میر، درد اور جرأت وغیرہ شریک ہوتے تھے۔

مصحفی کے زمانے میں یہ سلسلہ جاری رہا بلکہ اور بڑھ گیا انھوں نے حسب ذیل مقامات پر ان ادبی محفلوں کا ذکر کیا ہے:

(۱) اکبر کے بیان میں لکھتے ہیں:

"دراں ایام کہ فقیر در شاہ جہاں آباد، طرح مشاعرہ انداختہ اوّل برائے اصلاح شعر رجوع بفقیر آوردہ بود"

(۲) جواںؔ کے بیان میں لکھتے ہیں:

"پیش ازیں روزہائے کہ در حضور مشاعرہ بود بموجب ارشادِ والا بسر انجام غزلہائے طرحی، سعیٔ بلیغ بکار بردہ۔"

(۳) حجامؔ کے متعلق لکھا ہے:

"در اکثر مشاعرہ ہا موجبِ تحسین و آفرین یاران بودہ۔"

(۴) لالہ بالمکند حضورؔ کے بارے میں تحریر فرمایا ہے:

"روزے در شاہ جہاں آباد بخانہ لطف علی خاں ناطق مشاعرہ بود، غزل طرحی میر صاحب کہ ردیفش بعد قافیہ حرف "اُور" بہ معنی "طرف" تقرر داشت و ازیں جہت بعضے فصحا ور اخلافِ اُردو شمردہ پیرویش نکردند۔"

اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مشاعرے صرف اردو کی تبلیغ ہی کا ذریعہ نہیں تھے بلکہ ایک ایسا ادارہ بھی تھے جہاں زبان کا کھرا کھوٹا پرکھا جاتا تھا۔

(۵) حکیمؔ کے متعلق لکھا ہے: اکثر در مشاعرہ ہا می آمد۔

(۶) زارؔ کے بارے میں لکھا ہے: اکثر در مشاعرہ ہائے دہلی داخلِ صحبت می شد

(۷) مرزا سلیمان شکوہ کے ترجمے میں لکھا ہے:

"درایامے کہ حکم ترتیبِ مجلسِ مشاعرہ شدہ بود اکثرے از کاردانانِ ایں فن در حضور آمدہ حاضر می شدند۔"

(۸) مصحفیؔ نے مشاعرۂ صاحبِ عالم کے علاوہ "مشاعرہ پسر راجہ رام ناتھ" کا بھی ذکر کیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس وقت جب کہ مغلیہ سلطنت میں خاک اُڑ رہی تھی ادب کی محفلیں سونی نہیں ہوئی تھیں، اُن میں صوفی بھی شریک تھے اور سپاہی بھی، اور جب وہ باہم مل بیٹھتے تو غم روزگار

کو بھول جاتے تھے اور ایسے نامساعد حالات میں جب کہ ہر طرف افراتفری اور بدامنی تھی، ادب کی شمع کو اپنے دل کی گرمی اور تپش سے فروزاں رکھتے تھے۔

اردو کی مقبولیت کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ ان محفلوں میں ہر طبقہ، ہر مذہب اور ہر عقیدہ کے لوگ شریک ہوتے تھے۔ مردوں کے علاوہ عورتیں بھی شعر کہتی تھیں۔ ان میں طوائفیں بھی تھیں اور اس کے تاریخی اسباب تھے۔ اس زمانے میں عشق و محبت کے لوازم گھر کے بجائے بازار ہی میں نشو ونما پا سکتے تھے۔ بیوی صرف خاندان چلانے کا ذریعہ تھی اور طوائف جذباتی دنیا کی مالک، موخر الذکر کا درجہ سوسائٹی میں اتنا ذلیل نہیں تھا جیسا کہ آج ہے۔ لیکن مصحفی نے جہاں موتی بیگم طوائف کا ذکر کیا ہے وہاں گنا بیگم کا بھی جو عماد الملک کی بیوی تھی اور مختلف کمالات اور علوم سے بہرہ ور تھی۔ ادب اور سماج میں چولی دامن کا ساتھ ہے یہ خارجی موثرات ہی ادب کو رنگ روپ دیتے ہیں۔ مصحفی نے کہیں کہیں ان سماجی حالات کی طرف بھی اشارہ کیا ہے جو ادب پر اثر انداز ہوتے ہیں "ان ایام بے تمیزی" اور افراتفری میں دستکار، صناع، وضیع و شریف، مزدور اور کسان سب ہی پریشان اور مضمحل تھے۔ خالصہ کی زمین کم ہو جانے سے خود شاہی خاندان پر تین تین وقت کے فاقے گزرتے تھے اور سلاطین کی حالت فقیروں سے بھی بدتر تھی۔ نہ جسم پر کپڑا تھا اور نہ پیٹ میں روٹی: بقول مصحفی، یہ ہجو نہیں، حقیقت ہے:

فاقوں کی زبس مار ہے بے چاروں کے اوپر جو ماہ کہ آتا ہے وہ ماہِ رمضاں ہے
گل جائے زباں میری کروں ہجو گر اُن کی یہ تنگ معاشی کا سلاطیں کے بیاں ہے

جو امرا تھے اُن کے یہاں سے مہینوں تنخواہ نہیں ملتی تھی: بقول مصحفی ؎

ہر چند کہ ہم فاقوں سے جاں دیتے ہیں تن خواہ تو کب نعیم خاں دیتے ہیں

انگریزوں کے معاشی مظالم کا حال یہ تھا کہ بنگال اُن کے قبضہ میں چلا گیا تھا اور اس کی وجہ سے گویا ہماری اقتصادی شہ رگ کٹ گئی تھی۔ یوں سمجھیے کہ اگر بنگال و کرناٹک کے خزانے انگلستان نہ پہنچتے تو ان کا صنعتی انقلاب ہرگز ہرگز فروغ نہ پاتا۔ مصحفی کا کیا اچھا شعر ہے ؎

ہندوستان کی دولت و حشمت جو کچھ کہ تھی کافر فرنگیوں نے بہ تدبیر کھینچ لی

ان حالات میں امن و سکون کہاں؟ ہر طرف لوٹ مار اور غارت گری کا بازار گرم تھا۔ بقول مصحفی

ع بس قلعے کے نیچے ہی ٹک اک امن و اماں ہے

مفلسی تمام خرابیوں کی جڑ ہے، اس اقتصادی بدحالی اور معاشی اختلال کا اثر ہمیں اس زمانے کی جنسی محبت، سماجی زندگی اور ادبی روایات میں بھی نظر آتا ہے، مصحفی میر مہدی داغ کے ذکر میں لکھتے ہیں:

"قدم در راہ شاہد پرستی گذاشتہ، بر زنے اہلِ شوق وارفتہ بود، غافل ازیں کہ فراق ایں قوم فریبندہ اگر آدم را بکشتن دہد، سر موئے رحم بہ حالش نہ کنند ..... خو کردہ وصالش تاب جدائی نیاوردہ بر بستر بیماری افتاد۔ دریں اثنا خطے از مطلوب رسید، ایام وفاتش قریب رسیدہ بود کہ در خطِ جواب، ایں شعر حسب حالِ خود نوشتہ رواں کرد و بعد آں جانِ شیریں بہ جاناں سپرد۔ شعر ایں ست:

ازجاں رمقے بود کہ مکتوب تو آمد دیگر چہ نویسم خبرم خوب گرفتی

رسوا کے بیان میں لکھا ہے:

"چوں موٗمی الیہ بے شرب شراب یک ساعت، آرام نمی یافت، میزبان روزے یک طفل را، برائے آوردنِ شراب بہ احمد نگر کہ محلہ، بیرونِ شہر واقع شدہ فرستاد، چوں آمدنش دیر کشید، بالیتاں گفت کہ تا بیاید تا شراب آید، اندکے سیر باغ کنیم۔ بدیہہ از زبانش بر آمدہ

لڑکا گیا شراب کو، کاہے کی سیر ہو ہم گذرے اس شراب سے لڑکے کی خیر ہو

مصحفی آگے چل کر لکھتے ہیں:

"در روایت دیگر چنیں است کہ بر جوہری پسرے کہ شیفتہ او گردیدہ سودا باہم رسانیدہ بود در سیر باغ از دست او بہ شمشیر کشتہ شدہ"

مصحفی میر کے متعلق لکھتے ہیں:

کہ "گویند میر تقی میر در عالم شباب منظور نظر (خاکسار شاعر) بودہ"
تذکرہ کریم الدین میں ہے کہ میر نے خاکسار سے اصلاح لی ہے یہ بات بھی بہت دلچسپ ہے کہ میر نے اپنے تذکرہ میں خاکسار کی بہت برائی کی ہے۔

تصویر کا یہ دوسرا رخ نمایاں نہیں ہوگا اگر سعادت کا یہ واقعہ نہ لکھا جائے جس کا ذکر شاہ کمال نے اپنے نایاب تذکرہ مجمع الانتخاب میں بھی کیا ہے۔ مصحفی کے الفاظ یہ ہیں:-

"گویند روزے در مجلسے، دردانہ نام رقاصہ رقص می کرد اتفاقاً کفش نوئی ایشاں گم شد۔
ہرگاہ از مجلس برآمد کفش را نیافت ظرافتاً بدیہۃً از زبانش سرزد، ایں شعر ؎

سعادت، شب تماشے میں اگر تیرا نیا جوڑا گیا، تو جانے دے، دردانہ کے ٹھڑوں کے سر صدقے

مصحفی کے بیانات کی تائید سالار جنگ خان دوراں کے بیانات سے بھی ہوتی ہے انھوں نے سارنگی نواز، بین نواز، قوال، شکم نواز، نقال، امرد، اور طوائفین کا ذکر اس تفصیل سے کیا ہے کہ زمانے کی عشرت پسندیوں کا مرقع پیش نظر ہو جاتا ہے اور اس عہد میں جو نور و ظلمت کی آمیزش اور زہد و رندی میں مفاہمت تھی وہ سامنے آجاتی ہے۔

مصحفی نے ادبی چوری کے واقعات بھی نقل کئے ہیں۔ ہم صرف ایک واقعہ بیان کرتے ہیں جو دلچسپ ہے:

امام بخش خاں کشمیری ایک روز مصحفی کے پاس آئے اور فرمائش کی کہ اپنا تذکرہ دکھا دیجیے۔ انھوں نے سادگی سے دیکھنے اور پڑھنے کے لئے دے دیا۔ اور میر شاہ حسین حقیقت نے جو امام بخش کے ملازم تھے سارا مواد سرقہ کر لیا۔

"خان مذکور روزے بر مکان فقیر آمدہ بالحاح تمام مسودۂ خام تذکرۂ مرا کہ دریں مدت بہ ہیچ کس نہ نمودہ بودم از من طلب نمود من سادہ دل غافل از فطرت و بد ذاتی۔ کشمیریاں، سابقہ مروت شاہ جہاں آباد۔ و آدمیت را کار فرمودہ اجزائے مسودہ تذکرہ خود را حوالہ کردم۔ در عرصۂ یک دو روز خفیہ از حسن اشعار و احوال شعرائے دہلی وغیرہ کہ من بہ محنت تمام آں ہا را بہم

رسانیدہ بودم از دستِ "حقیقت بے حقیقت" نقل کنانید"

اس پر مصحفی کو بڑی ناگواری ہوئی اور انھوں نے حقیقت کی ہجو میں یہ قطعہ لکھا

ؔ جانتے ہیں سب کہ اک مدت سے یاں مصحفی کے تذکرے کا شور ہے

تذکرہ یہ جو حقیقت نے لکھا بے حقیقت مصحفی کا چور ہے

اس زمانے میں ایک عام مرض یہ تھا کہ شاگرد نے اگر شہرت حاصل کر لی ہے تو وہ استادی کی آزادی سے انکار کرتا تھا یا اپنے استاد سے بھی بڑے شاعر سے نسبت تلمذ ظاہر کرتا تھا۔

رقت کے بیان میں لکھا ہے: "مشقِ سخن از قلندر بخش جرأت کردہ لیکن بر زبانش چنین ست کہ من از جعفر علی حسرت کہ استاد جرأت ست استفادہ کردہ ام"

محشر کے متعلق لکھا ہے "روزے بہ صحبتِ کیمیا خاصیت خواجہ میر دردؔ نیز رسیدہ دبہمیں جہت خود را بہ شاگردیِ ایشاں متّہم سازد۔"

اس زمانے کے سماجی انحطاط کے متعلق جو کچھ بھی کہا جائے۔ لیکن ابھی انفرادی زوال مکمل نہیں ہوا تھا۔ وقت کی ان عام مایوسیوں میں شرافت اور وضع داری کی حیرت انگیز مثالیں بھی مل جاتی ہیں مصحفی نے اپنے شاگردوں کے معاملے میں اور معاصرین کے متعلق رائے دینے میں بڑی فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے۔ دوسروں کا ذکر کرتے میں خود ان کے خلوت کدۂ ذات کا حجاب بھی اٹھ گیا ہے، ہر جگہ انھوں نے اعلیٰ صفات ہی پر زور دیا ہے۔ اس زمانے میں قدر و منزلت کی معاشی اساس کمزور ہو چکی تھی، لیکن دہلی کی تہذیبی قدریں ابھی ذہنوں میں زندہ تھیں، اس لئے مصحفی، دہلی اور اہلِ دہلی کو لکھنؤ میں بھی یاد کرتے ہیں اور وہ میر کی طرح لکھنؤ کو اور اہلِ لکھنؤ کی زبان کو دہلی کے مقابلے میں فروتر سمجھتے ہیں۔ لیکن مصحفی میں میر کی سی مضبوطی اور ثباتِ قدم نہیں تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ لکھنؤ کا طبعی ماحول اُن کی شاعری میں آہستہ آہستہ دبے پاؤں آ رہا ہے۔ اسی لئے اُن کی شاعری دہلی اور لکھنؤ کے دوراہے پر کھڑی ہے۔ گویا وہ آتش کی شاعری کا مقدمہ یا اشاریہ ہے۔

تنقیدیں بھی اُن کے یہاں میر کی سی انتہا پسندی، خود اعتمادی اور اُن کے وہ حسین عیوب یعنی قطعیت اور پہلو دار طنز نہیں ہے۔ میانہ روی ہے جو بعض جگہ کمزوری کی سرحد تک پہنچتی ہے۔ تاہم اُن کے تذکرے اس زمانے کی فضا اور ادبی معیاروں کو سمجھنے میں بڑی مدد پہنچاتے ہیں۔ اور یہی ان کی اصلی قدر و قیمت ہے [illegible] ([illegible])

رشید یاسمی کا فلسفۂ اخلاق

از

(جناب لکشمی نرائن وششٹ تابش ایم - اے)

(۲)

مشہور و معروف ضرب المثل ہے کہ جو دوسروں کے لئے کنواں کھودتا ہے اس میں خود ہی گرتا ہے۔ (چاہ کن را چاہ درپیش) جو دوسروں کو نقصان پہنچانے کی سوچتا ہے وہ خود نقصان اٹھاتا ہے اور اپنے آپ کو رنج اور تکلیف کا موجب بناتا ہے نیکی کا بدلہ نیکی اور بدی کا بدلہ بدی ہی ہوتا ہے۔ اس لئے ہر انسان کے لئے ضروری ہے کہ وہ دوسروں کے واسطے کنوئیں کھود کر اپنا فائدہ متصور نہ کرے۔ اور انسانیت کا تقاضہ تو یہ ہے کہ دوسروں کا نقصان اپنا نقصان سمجھے ؎

ساعی کیفر گرفت کیفر بسیار سخت — حاسد پاداش یافت پاداشی بس عجیب

بندے نیکوست ایں از پی دیوانیاں — زانکہ بد، بد سگال شود ہم اور الضعیب

["شیر بہار"]

اقتصادیات کے مطالعہ سے پتہ چلتا ہے کہ آدمی کی آرزوئیں بے شمار ہیں۔ ابھی ایک پوری ہونے بھی نہیں پاتی کہ دوسری آرزو پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ آدمی خواہشات کا سمندر ہے۔ دنیا کا کوئی آدمی بھی اپنی تمام آرزوؤں کی تکمیل نہیں کر سکتا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے۔ کہ ان گنت آرزوؤں کو انسانی زندگی کے اتنے قلیل عرصہ میں پورا کیا جائے یعنی انسان کی زندگی تو چند روزہ ہے اور آرزوئیں لامحدود

با عمر چو آرزو و ہمی سنجیم — ایں بر سر خامہ داں بہ گرد و نست

عمرم بحساب ناید از خردی — وانگہ امل از حساب بیروں است

آں ذرہ و ایں چو کوہ الوند است — آں قطرہ و ایں چو رود جیحون است

["عمر و آرزو"]

بُرے خیالات سے بُرے کام ظہور میں آتے ہیں کیوں کہ اگر خیالات میں پاکیزگی ہے تو کاموں میں بھی افضلیت ہے آدمی ویسا ہی بنتا جاتا ہے جیسے اس کے خیالات و احساسات ہوتے ہیں خیالات ہی انسان کو بڑھاتے ہیں۔ نیک خیالات ہی انسان کو ترقی کی منزلیں طے کراتے ہیں اور گندے خیالات ہی انسان کو قعرِ مذلت میں ڈالتے ہیں۔ جس طرح ایک چنگاری سارے شہر کو خاکستر کر سکتی ہے اسی طرح سے ایک بُرا خیال تباہی کا باعث بن سکتا ہے۔ ہر چیز کی ابتدا چھوٹی ہوتی ہے اور اس کا نتیجہ بڑا ہوتا ہے

که از فکرِ بد بر دمد کارِ بد   چناں کز یکی دانه نخلی بلند
خیالی بر آرد ز جانی دمار   شراری رساند به شهری گزند

["اندیشۂ ناپسند"]

جب کوئی بات تمام بنی نوعِ انسان کی بہتری کے لئے کہی جاتی ہے تو اس سے ہر خاص و عام متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتے۔ اور اس کے خلاف جو بات اپنے فائدہ کے واسطے کہی جاتی ہے۔ اس کا کم اثر ہوتا ہے۔ جب معاملہ ذات پسندی تک پہنچ جاتا ہے۔ تو بات میں کم اثری آہی جاتی ہے۔ اسی واسطے تو بے غرض انسانوں کی باتوں میں زیادہ اثر پایا جاتا ہے۔ کیوں کہ وہ اپنی بھلائی سے بالاتر ہو کر کہتے ہیں۔ جب ایک پتھر تالاب میں پھینکا جاتا ہے تو آہستہ آہستہ اس کا اثر بڑھتا جاتا ہے ؎

بگوی آنچه پسندیده دانی و هرگز   گماں مدار که گفتار بے اثر گردد
ز بهرِ سودِ کساں گو، نه بهرِ شهرتِ خویش   که قولِ بے غرضاں در جہاں سحر گردد
سخن چو سنگی باشد فکندہ در شمری   که ہر زماں اثر آں بزرگتر گردد

["تاثیرِ سخن"]

سُستی موت اور چُستی زندگی ہے۔ امید اور کوشش دو ایسی چیزیں ہیں جو انسانی تگ و دو کو آسان کرنے میں مدد دیتی ہیں اور جن کی بدولت ہر مشکل سہل بن جاتی ہے اس لئے لازمی ہے کہ کاہلی کو ترک کر دینا چاہیئے۔ اور "کوششِ ناتمام" کے بل بوتے پر ہر کام کی بنیاد رکھنی چاہیئے کیوں کہ اُمید سے کام کرنے کی لگن لگی رہتی ہے ؎

تو نیز بہ پیچ تن آساں مشو کہ سعی و اُمید دو شہپر است کہ آساں کند ترا پرواز

["سعی و امید"]

جو کام دل اور جان سے کیا جاتا ہے اس میں سچی اور اصلی کامیابی ہوتی ہے۔ یہی تندہی وہ چیز ہے جو اعلیٰ مدارج طے کراتی ہے۔ کیوں کہ اصل میں اسی کام سے خوشی حاصل ہو سکتی ہے جو دل لگا کر کیا جائے کوشش کرنا انسان کا فرض ہے۔ اور کامیابی دینا خدا کے ہاتھ میں ہے۔ اگر کوئی آدمی کام کرتے کرتے مر جائے یا ناکامیاب رہے تو یہ بات اس کے لئے قابلِ فخر ہے "They never fail who die in a great cause" کیوں کہ اس کا فرض کام کرنے کا تھا اور اس نے اس فرض کو پوری ایمانداری اور جانفشانی سے نبھایا۔ لیکن اس کے خلاف جب آدمی محنت سے کام نہیں کرتا اور مر جاتا ہے۔ تو یہ اس کے واسطے شرم کی بات ہے۔ اگر انسان سے محنت کی لگام چھوٹ جائے تو اس کے ہاتھ میں "لوہا" بھی "نرم" ہو جاتا ہے ؎

بہر کار و حرفت کہ پیش آیدت دل و دستت اندر عمل گرم باد

اگر توسنِ ملک رام تو نیست چہ غم آہن اندر کفت نرم باد

چو کوشی و میری ترا فخر ہست چو حسبی و مانی ترا شرم باد

["کار"]

مور بڑا خوبصورت جانور ہے لیکن جب وہ اپنے پیروں کی طرف نظر بھر کر دیکھتا ہے تو شرمندگی کے آنسو ٹپ ٹپ گرنے لگتے ہیں (اسی طرح سے ہر آدمی میں کوئی نہ کوئی نقص ضرور ہوتا ہے صرف خدا کی ذات نقائص سے بالاتر ہے) رشید یاسمی نے "گوزن" کے مشہور قصہ کو بڑے لطیف پیرائے میں بیان کیا ہے۔ بارہ سنگا جب اپنی ٹانگوں کو دیکھتا ہے تو بے حد خوش ہوتا ہے اور اس کے ساتھ سینگوں کو دیکھ کر شرمندہ ہوتا ہے۔ اس قصّہ کو ختم کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ جو چیز ہمارے لئے فائدہ مند ثابت ہوتی ہے اُسے ہم ناپاک سمجھتے ہیں اور جو چیز ہمیں لذت بخشتی ہے۔ اسے ہم "عزیز" گردانتے ہیں۔

How ill do we judge what is best for us

یعنی ہم فائدہ دینے والی چیز کو نقصان دینے والی چیز خیال کرتے ہیں ؎

مارا پلید باشد ہر چہ مفید   مارا عزیز باشد ہر چہ لذیذ

["گوزن"]

اگرچہ اپنے عیب اپنی ذات سے چھپے نہیں رہتے لیکن انسانی آنکھ میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ وہ دوسروں کی عیب جوئی زیادہ کرتی ہے یعنی دوسروں کے عیب نکالنے میں بڑی ماہر ہے۔ اور اسے اپنے عیب نظر ہی نہیں آتے۔ جب اپنے عیب دوسروں کی نگاہ سے دیکھے جائیں تو حقیقت اس وقت کھلتی ہے۔ اس سے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب انسان صرف اپنے ہی عیبوں کو دیکھ کر دوسروں کو دیکھتا ہے تو اس کی نگاہ میں کوئی کبھی برا معلوم نہیں ہوتا ؎

نہ بینی جز خود خود را نہ بینی   کہ از تو نیست کس ہیچوں تو مستور
بچشم دیگراں بیں عیب خود را   کہ چشم تو بود از عیب خود کور

["عیب"]

اپنا کام اس خیال سے دوسرے کے سپرد کر دینا کہ وہ اسے اپنا کام جان کر کرے گا یہ بات دائرۂ امکان سے باہر ہے کیوں کہ جیسا کام خود کیا جاتا ہے ویسا دوسرا ہرگز نہیں کر سکتا۔ رشید یاسمی نے بھی بڑے پتہ کی بات کہی ہے کہ بیگانہ پر بھروسہ کر کے اپنا کام چھوڑ دینا اپنے آپ کو کمزور کر دینا ہے اس لئے دوسرے پر اعتماد نہ کیا جائے بلکہ خود اس کام کو کر لینا چاہئے ؎

کہ ہیچ چیز کساں را چناں ضعیف نہ کرد   کہ تکیہ کردن بر غیر خویش کرد ضعیف

["تکیہ بر غیر"]

حسرت موہانی فرماتے ہیں ؎

غیر کی جد و جہد پر تکیہ نہ کر کہ ہے گناہ   کوشش ذاتِ خاص پر ناز کر اعتماد کر

ہر طرح کے آدمیوں میں گھل مل کر آدمی بہت کچھ سیکھ سکتا ہے غرضیکہ آدمی ایک ایسا شیشہ ہے

جس میں اس کے عیب اور ہنر صاف طور پر نظر آتے ہیں۔ ہر انسان کی قدرتی چیزیں یا عادتیں یکساں اور ملتی جلتی ہیں۔ آئینہ میں جیسی چیز دیکھی جاتی ہے وہ ہو بہو ویسی ہی نظر آتی ہے اگر ایک کالا آدمی آئینہ میں اپنی شکل دیکھے اور اس آئینہ کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے تو اس میں آئینہ کا کوئی قصور نہیں بلکہ قصور اُس کی بدصورتی کا ہے اس لئے خوبصورتی اور بدصورتی کی بحث بے سود ہے اور ہر ایک کے واسطے لازم ہے۔ کہ وہ بُرے اور اچھے آدمی کے ساتھ مِلے جُلے اور تنہائی اس لئے تلاش نہ کرے کہ میں بُرے لوگوں میں بیٹھ کر بُرا ہو جاؤں گا۔ کیوں کہ یہ ضروری نہیں کہ ایک آدمی کے اندر بُرے آدمی کے ساتھ بیٹھنے سے بُری عادتیں گھر کر جائیں۔ بلکہ اگر وہ مضبوط ارادے اور نیک چال چلن کا آدمی ہے تو وہ بُرے آدمی کی بھی بُری عادتوں کو چھڑا سکتا ہے۔ انسان اچھی اور بُری عادتوں کا مجسّمہ ہے لیکن شرط بلند کردار کی ہے ؎

مجوی عزلت د با نیک و بد ہمی آمیز — کہ مردم آئینہ مردم است در ہر حال

از آں خصال کہ در خویشتن نہاں داری — ہمیشہ یابی در طبع دیگراں تمثال

چو آں سیاہ مشو کاندر آئینہ رخ خویش — بدید و بشکست آئینہ از شرم مثال

["آئینہ اخلاق"]

جو کچھ ہم کرتے ہیں وہ ہی ہمارے سامنے آتا ہے۔ جو ظلم و ستم ہمارے اوپر ہوتا ہے اس کا سبب ہم خود ہیں۔ ہمیشہ رہنے والی خوشی صرف خدا کی دین ہوتی ہے اُسی کی عنایت سے اُس خوشی میں کبھی زوال واقع نہیں ہوتا۔ یہ حقیقت ہے کہ کوئی چیز بغیر محنت اور مشکل کے حاصل نہیں کی جاسکتی ؎

آرے کہ ہر چہ بر سرِ ما میرود ز ماست — بر ما جفا کہ راند کہ بر ما ز ما جفاست

حلّے ندارد آدمی الّا ز خویشتن — آنکس کہ حد شکستن داند بگو کجاست

با ہر سرور و بہجت رنجی و محنتی است — آں بہجتی کہ کم نشود بہجت خدا است

["بزبل"]

وہ انسان، انسان نہیں جو بنی نوع کے لئے دردمندی۔ اور ہمدردی نہیں رکھتا۔ جس کا دل دوسرے کے دُکھ درد میں شریک نہ ہو اور جو اپنے بھائی کو مصیبت میں دیکھ کر اس کی مدد نہ کرے۔ انسان

کو درد مندی اور انسانیت کا پُتلا کہا گیا ہے۔ وہ انسان فرشتہ خصلت ہے جو دوسروں کے رنج اور راحت میں برابر شامل ہوتا ہے۔ جس کا دل غریبوں کی آہ سے بے چین ہو جاتا ہے۔ اور جو بے کسوں کی دل وجان سے اعانت کرتا ہے۔ وہ خود غرضی اور نفس پرستی کو بالائے طاق رکھ کر بے نواؤں کی حتی المقدور خدمت کرتا ہے اور اس کی درد مندی اور دردِ انسانیت دنیا کو خوشبو کی مانند مہکا دیتی ہے۔ وہ ہر ایک کے ساتھ نرمی اور شفقت کا سلوک کرتا ہے ایسے ہی نیک سرشت لوگوں پر دنیا کا نظام قایم ہے ؎

خرم آنکس کہ چوں در پہنِ دشتِ زندگی ماندۂ بیند بیاری سوی او پوید ہمی
کارہائے بے نوایاں را روا سازد بہ مہر دردہائے خستہ جاناں را دوا جوید ہمی
جوید و پوید چو شخصی، جوید و پوید بدرد گریہ و موید چو طفلی، گریہ و موید ہمی
گر ببیند وزد نبیند وزد ز بہرِ نفعِ خویش ور بگوید سر، برای سود خود گوید ہمی
طبعِ او ہر جا کہ باشد ہمچو ابر آرد نثار خلقِ او ہر جا کہ باشد ہمچو گل بوید ہمی

("خزاں")

کیلنڈر نئے سال کی خوشخبری دیتا ہے۔ اور جب ہم اس پر نظر ڈالتے ہیں تو بیتے ہوئے دنوں کی یاد انگڑائی لینے لگتی ہے۔ یعنی ہمارے سامنے ایّامِ گذشتہ کی ہلکی سی جھلک آجاتی ہے۔ ہم اسی گذشتہ ماحول میں بسیرا کرنے لگتے ہیں، ہمارے دلوں میں رنج اور خوشی کے سوئے ہوئے ارمان جاگ اُٹھتے ہیں اس واسطے مناسب یہی ہے کہ ہم گذرے ہوئے دُکھ درد کو یاد نہ کریں اور انھیں بالکل فراموش کر دیں اور جو آنے والے زمانے میں خوشی کے دن آئیں انھیں ہوشیاری سے کام میں لائیں اور اُن سے پورا فائدہ اٹھائیں۔ جب موقعہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ تو شہد بھی زہر میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ ممکن ہے کہ آج ایک چیز فائدہ مند ہے اور وہی کل نقصان دہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اس لئے موقعہ کو ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہئے۔ جو کچھ کیا جائے وہ موقعہ و محل دیکھ کر کیا جائے ؎

تقویم بشارت دہد از نو شدن سال وز خرمی و خوبی و فرخندگیٔ فال
گیتی ز پس گریہ و غم باز بہ خندد ہر رنج و غمی را طربی ہست بدنبال

آں بہ کہ فراموش کنیم اندہ یاریں — اکنوں کہ جہاں راہم دیگر شود احوال
آں بہ کہ غنیمت شمریم عشرت امروز — آگہ نتواں بود کہ چوں است سرانجام
ہر جام پُر از شہد کہ در وقت نہ نوشند — چوں وقت بشد، زہر شود شہد در آں جام

["اغتنامِ فرصت"]

افسوس اور ماتم کرنے سے کام نہیں چلتا۔ ہر مقصد کو حاصل کرنے کے لئے جوشِ عمل اور حسنِ تدبیر کی ضرورت پڑا کرتی ہے جو وقت جیسا گذر گیا اچھا ہوا۔ اب اس پر افسوس اور رنج ظاہر کرنا بے سود ہے اس لئے ضروری ہے کہ جو وقت باقی رہ گیا ہے اسے ٹھیک اور مناسب طریقوں سے استعمال کیا جائے کیونکہ وقت، اتنی تیزی سے گذر جاتا ہے کہ پتہ بھی نہیں لگتا۔ وقت بڑا قیمتی ہے۔ انسانی زندگی میں فرصت کے اوقات بہت کم ملتے ہیں اور یہ بات تسلیم شدہ ہے کہ ہر تکلیف کے بعد آرام اور ہر بہار کے بعد خزاں کا دور دورہ ہوتا ہے ؎

دریغ وقتِ گرامی، دریغ عمرِ عزیز — دریغ نوبت کوتاہ و فرصتِ ناچیز
گذشت فرصت و از کارِ خود پشیمانم — دریغ و درد کہ تدبیر خود نمی دانم
بہار بینم و صیف و خزاں و بہمن و دی — بگاہنامہ دروں گشتہ پی در پی
ولی ندانم از بس شتاب و سرعتِ عمر — کہ کی برفت بہار و خزاں بیامد کی
چنانکہ طی کنم اوراقِ گاہنامۂ خویش — مرا زماں کُند اوراقِ زندگانی طی
ہمیں نتیجہ بدست آمد از تجربۂ رسال — کہ ہر بہار خزانیش باشد اندر پی

["تقویم"]

زندگی متضاد چیزوں کا مجموعہ ہے۔ اُس میں پُھول بھی ہیں اور کانٹے بھی۔ انسان چونکہ سماج کا ایک ممبر ہے اس لئے اسے سر چھپانے کی جگہ ڈھونڈنا پڑتی ہے اور روٹی پانی کا دھندہ بھی کرنا ہوتا ہے اسی سے اس انسانی سماج کی رونق قایم ہے اس کے لئے دین، ملک و ملت کا نگہبان ہونا لازمی ہے ؎

زندگانی خار و خرما، نوش و نیش باہم است — گنج در ویرانہ پنہاں است و گُل اندر سر پیچ

آدمی را ہمچو مرغاں آشیانی درخورست
کاندر آں معروف گردد ماں و ناں مکتسب

آدمی را حفظِ دین وحفظِ ملک وحفظِ جفت
واجب است و کارہائے دیگر او مستحب

["خانہ"]

ایک جگہ اور فرماتے ہیں ؎

اے دل درزم مباش کہ تقویم گویدت
سالِ دگر ز عمر چو طے بعد گذشت

فرصت شمار باقی ایام و کار کن
فرصت دگر بدست نیاید اگر گذشت

["عمر گذشت زمانہ"]

"خواب وخور میں گذرنے والے سو سال سے وہ دن بہتر ہے۔ جو خیر و خوبی میں گذرے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر ایک دن کوئی ٹھوس کام کیا جائے تو وہ ان سو سال سے لاکھ درجہ اچھا ہے جو کہ فضول اور بے کار گذارے جائیں۔ ؎

روزی اگر بہ خیر گذری ہزار بار
بہتر ز سالہا است کہ در خواب و خور گذشت

["گذشت زمانہ"]

ہر آرام اور تکلیف کل کی وجہ سے ہے دنیا کی تمام چیزیں بوڑھی ہو جاتی ہیں لیکن کل ہمیشہ جوان ہی رہتی ہے اس لئے آج کا کام آج اور کل کا کل کرنا لازم ہے جس کی وجہ سے نظامِ زندگی قائم رہ سکے ؎

ہر آں رنج وہر آں راحت کہ مار است
ہمہ از بیم و از امید فردا ست

ہمہ چیز جہاں پیری پذیرد
بجز فردا کہ او ہموارہ برنا ست

"ہمیں امروز لیکن کارِ امروز
کہ فردا او برائے فردا ست"

["فردا"]

دنیا میدانِ کارزار ہے۔ عقل اور جسم اسے فتح کرنے کی تدابیر کرتے ہیں اور اسی لئے مصروفِ کار ہیں۔ اس دنیائے رنگ و بو میں عمل کی ایک بہت بڑی اہمیت ہے۔ عمل ایک ایسی سعادت مندی ہے جو روح کو آرام اور تن کو طاقت بخشتی ہے اگرچہ کام کرنے والا فنا ہو جائے لیکن کام باقی رہ جاتا ہے

کام کنندگان فانی ہیں اور کام غیر فانی حیثیت رکھتا ہے۔ کام انسانی زندگی کا سرمایہ ابدیت ہے۔ اور یہی اس کے بنتے نام و ناموس پیدا کرتا ہے اور اگر پوچھا جائے تو کام ہی زندگی ہے اور کام ہی پرستش۔ بغیر عمل کئے ہمارے قوا رشل ہو جاتے ہیں اور ہمارے اندر تساہل پسندی، جمود اور کسبل وغیرہ برائیاں پیدا ہو جاتی ہیں ؎

جہاں مصارف جدال و تنازع است و دراں | نہ خامشند عقول و نہ ساکنند اجسام
اگر بجنت بلندی بگیر دشش پستی | وگر بخواست سلامت بکایدش اسقام
سعادت بشر اندر عمل بود نہ خمول | نمایش ہنر اندر عمل بود نہ کلام
عمل مفرح روح و عمل مقوی تن | عمل معرف ذات و عمل محافظ نام

علامہ اقبال نے کہا ہے ع

عمل سے زندگی بنتی ہے جنت بھی، جہنم بھی

شرف فرماتے ہیں ؎

شرف اعمال کر اچھے کہ جو عقبیٰ میں کام آئیں | وہاں جنت نہیں دنیا سے جنت ساتھ جائے گی

"گیتا" کی تعلیم کا نچوڑ بھی عمل ہی ہے۔ اسی بنیاد پر شری کرشن جی نے ارجن (جنگ مہابھارت کا ہیرو) کو لڑنے پر آمادہ کیا اور تلقین کی کہ ترکِ عمل سے بہتر عمل کرنا ہے، پیہم عمل کرنا زندگی کا ثمرہ ہے، دل کو اسی وقت تسلی ہوگی جب "نشکام کرم" کیا جائے گا، ہر کام نفع و نقصان سے بے نیاز ہو کر خدا کے لئے کرنا چاہئے۔ ہر صورت میں کام سے وابستگی رکھنا ضروری ہے اور عمل نہ کیا جائے تو تن کا قیام ناممکن ہو جاتا ہے۔

خوش قسمت انسان وہ ہے جو متضاد چیزوں کے اثرات سے بالاتر ہو یعنی جس پر متضاد چیزوں کا اثر نہیں ہوتا۔ وہ نہ خوشی سے خوش ہوتا ہے اور نہ غمی سے غم زدہ۔ دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ اسے دماغی توازن حاصل ہو گیا ہے۔ وہ ہر طرح کے انسان کے ساتھ اپنے آپ کو اسی کے مطابق ڈھال لیتا ہے کیوں کہ وہ جانتا ہے کہ یہاں کے ہر پھول کے ساتھ کانٹا لگا ہوا ہے ؎

خرم آں دانا کہ از غم خاطرش را نیست بارے | باید و نیک جہاں بیقرارش نیست کاری
نہ ز رنجی دلخشی نہ ز محنتی بر جاں گزندی | نہ ز اندوہی خراشی، نہ ز غمی بر دل غباری
آرزوی گل نہ بندد، زانکہ در باغ زمانہ | نیک مے داند کہ باشد ہر گلی را پیش خاری
نہ گشاید خندہ بر روی مردِ شادکامی | نہ فشاند قطرہ در پیش مرد سوگواری
خندہ آری لیک بر کارِ جہان وعہدِ گیتی | کش نہ بر شادی ثباتی، کش نہ بر اندوہ قراری
ہر کجا اندوہ غم بیند بدانجا میگراید | زاندماں جوید حسابی وز غماں گیرد شمادی
گردی افسردہ یابد گرد وش خاطر فسردہ | در گلی پژمردہ بیند افتدش در دیدہ خاری
با نژنداں چوں نژندی، با حزیناں چوں حزینی | با غریباں چوں غریبی، با نگاراں چوں نگاری

"گیتا" نے بھی اُس آدمی کو "قائم العقل" بتایا ہے جو دشمنی، دوستی اور محبت، نفرت سے بے نیاز ہے اور یہ متضاد باتیں اس پر اثر انداز نہیں ہوتیں۔ بعض اوقات لوگ خود کام نہیں کرتے اور اس کا الزام اپنی تقدیر کے سر تھوپتے ہیں۔ خود ہاتھ پاؤں نہیں ہلاتے اور قصور قسمت کا بتاتے ہیں ؎

چو خود نہ کوشی و از بختِ کام تستانی | گر بخت نیاورد و آسماں نگذاشت

ایک طرف سے روپیہ کمایا جاتا ہے اور دوسری طرف خرچ ہو جاتا ہے یعنی آخرکار نفع نقصان برابر رہتا ہے ؎

ہر مایہ وہر فیض کہ بخشندہ بہ ما داد | زیں جیب بر آورد و بجیب دگر انداخت

کم جاننے والا شیخی بگھارتا پھرتا ہے اور اپنے برابر کسی کو نہیں سمجھتا لیکن عالم کی مثال ایسی ہے کہ جس طرح شاخ میں پھل لگ جاتا ہے تو وہ نیچے کی طرف جھک جاتی ہے۔ اسی طرح سے عالم میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو جاتی ہے۔ مشہور سائنسداں نیوٹن کا مقولہ کون نہیں جانتا؟ شیخی مارنا اور تھوڑا جاننے پر اکڑ دکھانا رذیلوں کا کام ہے ؎

کم ظرفی دل بیں کہ ز دانستنِ حرفی | صد ولولہ در گنبدِ افلاک درانداخت

بہت سے لوگ کسی آدمی کی ترقی کو ایک آنکھ نہیں دیکھ سکتے ان کا دل اس کی ترقی اور

شہرت پر گرفتار رہتا ہے اور وہ اسی خیال میں پریشان و سرگرداں رہتے ہیں ؎

حسد چہ میبری اے بے ہنر ز قرب عزیزیکے زکوئی دوست ترا دور کرد خوردن و باختن

اخلاق میں خیالات کا بڑا درجہ ہے اگر ہمارے خیالات میں مایوسی ہے تو ہم مایوس نظر آتے ہیں۔ اور اگر خوشی ہے تو ہم خوش نظر آتے ہیں۔ مایوسی اور امید کا انحصار خیالات پر ہے یعنی جیسی انسان کی طبیعت ہوگی ویسا ہی وہ انسان ہوگا اور گوتم بدھ کا بھی یہی فلسفہ ہے ؎

از جہاں جویا شدم تا مایۂ اندوہ چیست گفت ہر ذرّہ بپاسخ طبع ناخرسند تو

رشید یاسمی نے بعض ایسی چھوٹی اور پیاری نظمیں بھی لکھی ہیں جن کے اندر ان کا شاعرانہ فن نظر آتا ہے ان میں انھوں نے مختلف حقایق کو اُجاگر کیا ہے۔ واعظ کے طور پر نہیں بلکہ ایک شاعر کی حیثیت سے۔ وہ ایک انسان کی طرح زندگی کے نشیب و فراز پر غور و خوض کرتے ہیں اور عوام کو اس کے اسرار و رموز سے سیدھے سادے الفاظ میں واقفیت دلاتے ہیں۔ تشبیہات و استعارات میں انھوں نے وہ ابدی اقدار بیان کی ہیں جو کہ اس دنیا کے لوگوں کو عزیز ہیں اور جو ہمیشہ اچھی نظروں سے دیکھی جائیں گی۔ اس لئے نہیں کہ ان کو شعروں میں ادا کیا گیا ہے بلکہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر دائمی سچائیاں شعروں کا جامہ پہنے ہوئے ہیں۔ اسی لئے بے شک و شبہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کی اخلاقی شاعری میں ہوشمندی، دنیاداری اور جوشِ عمل کی خوبیاں ہیں جو رشید یاسمی کو جدید فارسی شعرا میں ممتاز درجہ دلاتی ہیں۔ ہمیں ان کی شاعری میں انسانی دل کی پکار سنائی دیتی ہے۔ انھوں نے انسانی زندگی کی عکاسی بڑی چابک دستی سے کی ہے، ہمارے پژمردہ دل کی کلی اسی سے کھلتی ہے اور ہم اپنے غمزدہ دل کی دوا اسی میں تلاش کرتے ہیں۔ اور اس حقیقت کو کون جھٹلا سکتا ہے کہ شاعر وہی مقبول عام ہوتا ہے جو عوام سے قریب ہو، جو ہمارے جذبات و احساسات کی صحیح ترجمانی کرے، جو ہمارے اوپر زندگی کی تلخیوں کے راز منکشف کرے، جو ہمارے دلوں کو چھوتی ہوئی باتیں کہے اور جو ہمیں نئی مسرت عطا کرے۔ رشید یاسمی کی شاعری میں یہ تمام خصوصیات موجود ہیں اور یہی "صفات قدسی" ان کے مستقبل کی درخشندگی کا اعلان کرتی ہیں جس سے کوئی بھی صحیح الدماغ انسان انکار نہیں کر سکتا۔

مرزا غالب نے کہا ہے ع

شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے

یہ واقعہ ہی نہیں بلکہ سچائی ہے کہ ان ابدی سچائیوں کے جوہر پر کھنے میں یاسمی کی شخصیت کا نقاب اُٹھ جاتا ہے۔ اور انھوں نے ان اخلاقی قدروں پر زور دیا ہے جو انھیں خود عزیز ہیں، جو انسان کو دوامی زندگی عطا کرتی ہیں اور جن پر انسانیت کی عمارت تعمیر کی گئی ہے۔ رواداری، نیکی، انسانی عظمت، دردمندی، خوداعتمادی، عاجزی، محنت، مشکل پسندی، اتحاد، انسان دوستی اور کشادہ قلبی وغیرہ ایسی خوبیاں ہیں جن پر دنیا کی تمام ترقیوں کا دار ومدار ہے اور جن کی بدولت انسان ہر مشکل مرحلے کو بہ آسانی طے کر سکتا ہے۔ ان باتوں سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ وہ امن اور شانتی کے حامی ہیں۔ ان کی شاعری دنیاوی امن قایم کرنے میں ممد و معاون ثابت ہو سکتی ہے، موجودہ زندگی کی تلخیوں کو کم کر سکتی ہے۔ اور جس کے مطالعہ سے دلی سکون حاصل کیا جا سکتا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں ان کی شاعری حلقۂ شام وسحر سے نکل کر جاوداں ہو گئی ہے۔ ان کی شاعری ہمیں کام کرنے کا جذبہ عطا کرتی ہے۔ زندگی واقعی جد و جہد کا نام ہے وہ ہمیں پیغام عمل کا درس دیتے ہیں۔ ان کا یہ پیغام صرف ایرانیوں کے لئے نہیں ہے بلکہ تمام دنیا کے لوگوں کے واسطے بھی ہے اور آفاقی کلچر کی تعمیر میں بھی ان کا حصّہ ہے جو آنے والی نسلوں کے لئے شمع راہ کا کام دے سکتا ہے اور جس سے دنیا سرسبز و شاداب ہو سکتی ہے۔

اس کے علاوہ انھوں نے عیب جوئی، ظلم، کاہلی، غیبت، بدگوئی اور بُرے خیالات جیسی برائیوں کو ترک کرنے کی تلقین کی ہے۔ کیوں کہ یہی وہ انسانی کمزوریاں ہیں جو اس کی ترقی میں حائل ہوتی ہیں اور اسے ذلیل کرتی ہیں۔ ان کے کلام کو پڑھنے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ بلاواسطہ یا براہ راست ہندوستان کے فلسفۂ اخلاق سے متاثر نظر آتے ہیں۔ وہ مذہبی رواداری کے علمبردار ہیں اور انسانیت اور محبت ان کا ایمان ہے یہی وجہ ہے کہ ان کی اخلاقی شاعری میں آفاقیت اور دُنیا دی زیر کی دونوں پائی جاتی ہیں، اور یہی وہ خوبیاں ہیں جو ان کی شاعری کی آب و تاب اور بوئے یاسمن میں کبھی کمی نہیں آنے دیں گی۔

ادبیات

اے باعثِ بہارِ دو عالم خدا گواہ
تھا گلستانِ دہر بیاباں ترے بغیر

از

(جناب نوآب دہلوی)

چھائی ہوئی تھی ظلمتِ عصیاں ترے بغیر — خوابِ گراں سے چونکے نہ انساں ترے بغیر
ممکن نہ تھا نجات کا ساماں ترے بغیر — حاصل ہوا کسی کو نہ عرفاں ترے بغیر
ملتی نہیں ہے دولتِ ایماں ترے بغیر

ختم الرسل، حبیبِ خدا صاحبِ کتاب — پیدا کبھی ہوا ہے نہ ہوگا ترا جواب
قرآن ہے گواہ کہ تو ہے وہ آفتاب — دنیا تمام تیری تجلی سے فیض یاب
ظلمت کدہ تھا عالمِ امکاں ترے بغیر

روزِ ازل سے ساقیٔ کوثر ترا لقب — بیٹھے تھے منتظر ترے میخوار سب کے سب
صدیوں سے بابِ میکدہ تھا بند روز و شب — جامِ مئے الست کو ترسے ہوئے تھے لب
سونی پڑی تھی محفلِ رنداں ترے بغیر

دھندلے تھے نقش قدرتِ پروردگار کے — رنگ اُڑ رہی جہاں میں تھے لیل و نہار کے
غنچے چٹک رہے تھے نہ نغمے ہزار کے — جھلسے ہوئے سموم سے دامن بہار کے
گل تھے چمن میں چاک گریباں ترے بغیر

پھیلا ہوا جہاں میں تھا دامانِ شیطنت — بدکاریوں کے زور نے پلٹی ہوئی تھی مت
تھا کون سا وہ عیب کہ جس کی پڑی نہ لت — انسانیت کی ناؤ تھی غرقابِ معصیت

دنیا میں رک سکا نہ یہ طوفاں ترے بغیر

بیٹی کی جان لینا تو ادنیٰ سی بات تھی
بیٹے کو تھی حلال جو زوجہ تھی باپ کی

بے رحم تھا مزاج تو خالت گری ہوئی
تھی حاصلِ حیات بہیمانہ زندگی

انسانیت سے دور تھے انساں ترے بغیر

رسیا برائیوں کے بھلائی سے بدگماں
دشمن تھا بھائی بھائی کا مل بیٹھنا کہاں

انسانیت تھی کچلی ہوئی اور زرد واں دواں
کیں تو نے آکے دہر میں شیرازہ بندیاں

اجزا تھے ملتوں کے پریشاں ترے بغیر

فیضِ کرم سے تیرے ہوئے صاحبِ وقار
مالک تھے بحر و بر کے تو تھے میں کوہسار

ایسے فقیر جن کا جہاں میں نہ تھا شمار
وہ بوریہ نشیں ہوئے عالم کے تاجدار

دنیا میں تھے جو بے سر و ساماں ترے بغیر

فرمان وہ خدا کا ہے تو نے کہی جو بات
بعد از خدا بزرگ فقط ایک تیری ذات

درسِ سلامتی ہے سراپا تری حیات
خلقت تری جہاں کے لئے باعثِ نجات

نازل ہوئی نہ رحمتِ یزداں ترے بغیر

دار الاماں جہاں کے لئے تیری بارگاہ
ہر بے پناہ کے لئے ہستی تری پناہ

اس میں کوئی مبالغہ ہے اور نہ اشتباہ
اے باعثِ بہارِ دو عالم خدا گواہ

تھا گلستانِ دہر بیاباں ترے بغیر

ممکن کہاں نواب جو رتبے بیاں کرے
ذی شاں وہ تو کہ رحمتِ عالم خدا کہے

دامن ترا جو چھوڑے ہدایت نہ پاسکے
عقبیٰ کی منزلیں ہوں کہ دنیا کے مرحلے

مشکل نہ ہوگی کوئی بھی آساں ترے بغیر

غزل

انتہا

(جناب آلم مظفرنگری)

جسے عزم سفر کی دُھن مذاقِ سعیٔ کامل دے
اسے منزل نہ کیوں بڑھ کر نویدِ عیشِ منزل دے

حقیقت ہر نقابِ زندگی سے رونما ہوگی
نظر کی قوتوں کو امتیازِ حق و باطل دے

مری قسمت میں لکھ دے لکھنے والے شورشِ طوفاں
جو ہیں دیوانۂ تسکیں انھیں تقدیرِ ساحل دے

ہر اک ذرہ تڑپ کر دے اُٹھے لَو بزمِ ہستی کا
مغنّی آنچ ایسی ہر نوائے سازِ محفل دے

فرازِ طور کی جانب وہ دیکھیں یہ کہاں ممکن
تسلّی جن نگاہوں کو تجلی خانۂ دل دے

زباں پر سب کی ہیں افسانہ ہائے سازِ پروانہ
کوئی ایسا بھی ہے جو دادِ سوزِ شمعِ محفل دے

کہوں کیا اور پروانوں کی لاشیں روندنے والے
خدا تجھ کو شعورِ عظمتِ آدابِ محفل دے

صدائے شوق کو دیر و حرم میں یوں نہ رسوا کر
جو دینی ہے انھیں آوازِ نزدیکِ رگِ دل دے

خدا کے واسطے اے جذبۂ توفیقِ گریہ تو
کوئی آنسو مجھے بھی دامنِ الفت کے قابل دے

کمالِ ہوش بن جاتا ہے خود دیوانہ پن اس کا
جسے بھی دعوتِ جوشِ جنوں شورِ سلاسل دے

سنبھل مجبورِ غم شاید خودی پر در جنوں تجھ کو
شعورِ عزم دے تابِ جگر دے ہمتِ دل دے

زوالِ آدمیت کا اثر جس پر نہیں ہوتا
الٰہی اس دلِ افسردہ کو احساسِ کامل دے

تہِ دریا میں بھی پایا نہ جو غواصِ دریا کو
کہاں ممکن آلم تجھ کو وہ موتی خاکِ ساحل دے

غزل

از

(جناب شارق میرٹھی ایم ۔ اے)

دل سوزشِ تمام ہے لب پر فغاں نہیں — اب زندگیٔ عشق کے لیے گراں نہیں

یہ چاندنی، یہ سرد ہوا، یہ کسی کی یاد — مجھ سے نہ پوچھ اب میں کہاں ہوں کہاں نہیں

یہ کہہ کے دل کو عشق نے بخشی حیاتِ نو — غم بھی ہے عارضی جو خوشی جاوداں نہیں

ہر شاخ ہر شجر پہ ٹھکانا ہے اب مرا — اچھا ہوا جو میرا کہیں آشیاں نہیں

جو لطف قہر میں ہے کہاں التفات میں — وہ مجھ پہ مہرباں ہیں مگر مہرباں نہیں

خونِ دل و جگر سے ہے آرائشِ چمن — جس میں لہو کا رنگ نہیں گلستاں نہیں

شارقؔ ہزار عیش فراواں نصیب ہو

بے کیف ہے حیات اگر دل جوا [illegible]

تبصرے

محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق از مولانا عبد الماجد دریابادی تقطیع کلاں ضخامت ۲۰۰ صفحات طباعت وکتابت اعلیٰ قیمت ۸ روپے
پتہ:- دار المصنفین اعظم گڈھ۔

مولانا محمد علی مرحوم ملتِ اسلامیۂ ہند کے کاروانِ گذشتہ کے ایک ایسے نامور سرخیل و میر کارواں تھے جن کی شخصیت میں قدرت نے بیک وقت دل و دماغ اور علم و عمل کے گوناگوں کمالات و صفات جمع کر دیئے تھے۔ ایک طرف انگریزی زبان کے صاحبِ طرز ادیب و انشا پرداز، شعلہ فشاں مقرر اور خطیب۔ بے انتہا ذہین۔ اور دوسری جانب اخلاق و فضائل کا پیکر حسین بہادر سپاہی۔ حد درجہ مخلص رضا کار۔ پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ دل حُبِّ نبوی و عشقِ الٰہی کا گنجینہ جس کا اظہار ان کی بات بات سے ہوتا تھا۔ زیر تبصرہ کتاب میں مولانا عبد الماجد صاحب دریابادی نے اپنے ۱۷-۱۸ سال کے ذاتی مشاہدات و تجربات کی روشنی میں مولانا مرحوم کی اسی حسین و دل کش شخصیت کا خاکہ اس طرح کھینچا ہے کہ مولانا مرحوم کی زندگی کے مختلف، پرائیویٹ اور پبلک گوشے نظروں کے سامنے اجاگر ہو جاتے ہیں۔ اور جن لوگوں نے مرحوم کی نسبت اب تک صرف یہ جانا تھا کہ محمد علی کون تھے؟ اب اس کتاب کے آئینہ میں وہ یہ بھی دیکھ سکتے ہیں کہ محمد علی کیا تھے؟ حقیقت یہ ہے کہ جس طرح مصور کی خوش نصیبی ہے کہ اس کے ذوقِ تصویر کشی کی تسکین کے لئے محمد علی جیسی حسین شخصیت بطور ایک موضوع کے مل گئی اسی طرح خود صاحب تصویر کی خوش قسمتی ہے کہ اس کی رو کشی کے لئے مولانا دریابادی ایسے کہنہ مشق و پختہ کار مصور کا خامۂ گلکار مل گیا۔ ان دونوں چیزوں کے اجتماع نے کتاب کو بڑا جاذب اور دل کش بنا دیا ہے۔ ایک صاحبِ ذوق کے لئے ناممکن ہے کہ ایک مرتبہ کتاب کو شروع کر کے اسے ختم کئے بغیر ہاتھ سے رکھ دے۔ معلومات، اسٹائل اور ترتیب ہر اعتبار سے یہ کتاب اردو زبان کے سوانحی

سرمایۂ ادب کا ایک قابلِ قدر شاہکار ہے، اللہ تعالیٰ مولانا عبدالماجد دریابادی کے قلم ندرت رقم کی عمر دراز کرے اور وہ اس کتاب کے باقی حصے بھی جلد از جلد شائع کرسکیں۔

اُردو عربی ڈکشنری

از مولانا ابوالفضل عبدالحفیظ بلیاوی۔ تقطیع متوسط۔ ضخامت ۸۰۴ صفحات، کتابت وطباعت اعلیٰ۔ قیمت مجلد ۶ روپے۔ پتہ: صغیر احمد صاحب دارالعلوم ندوۃ العلماء بادشاہ باغ لکھنؤ۔

اردو میں عربی اردو لغات تو متعدد ہیں۔ لیکن ایسا کوئی قابلِ ذکر لغت موجود نہیں ہے جو اردو سے عربی میں ہو۔ حالانکہ عربی زبان کے معلم اور متعلم دونوں کو اور اردو سے عربی میں ترجمہ کا کام کرنے والوں کو قدم قدم پر ایسے لغت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے۔ خوشی کی بات ہے کہ اس اہم ضرورت کی تکمیل کی طرف مولانا عبدالحفیظ صاحب بلیاوی نے توجہ فرمائی جو اس کام کے لئے جیسا کہ ان کی کتاب مصباح اللغات سے ظاہر ہے۔ ہر طرح موزوں ومناسب تھے۔ فاضل مرتّب نے صرف قدیم عربی کے الفاظ پر اکتفا نہیں کیا ہے۔ بلکہ جدید علمی وفنی مصطلحات جو اردو زبان میں رائج ہیں ان کے لئے بھی جدید عربی کے الفاظ لکھے ہیں۔ اس طرح یہ کتاب قدیم وجدید دونوں طرز کے معلمین ومتعلمین اور مترجمین کے لئے بڑی کارآمد اور مفید ثابت ہوگی، شروع میں عربی میں تذکیر وتانیث کے چند متداول احکام اور اس کے بعد عربی زبان میں مختلف چیزوں کے لئے مستعمل گنتیوں کی ایک فہرست دی ہے، امید ہے کہ اربابِ ذوق اور اصحابِ ضرورت دونوں اس کی قدر کریں گے اور اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

کتاب التوحید

مترجم مولانا ابوعبداللہ محمد بن یوسف السوزی۔ تقطیع کلاں ضخامت ۱۴۴ صفحات، کتابت وطباعت بہتر قیمت درج نہیں پتہ:۔ کارخانہ تجارت کتب آرام باغ۔ فریر روڈ۔ کراچی۔

شیخ محمد بن عبدالوہاب النجدی نے توحید، اس کی حقیقت، اس کے حدود اور اس کے بالمقابل شرک کی تعریف اور اس کے انواع واقسام پر ایک رسالہ لکھا تھا جو اہلِ علم کے طبقہ میں

مشہور ہے۔ یہ کتاب اسی رسالہ کا اردو ترجمہ ہے۔ ترجمہ صاف و سلیس اور رواں ہے شروع میں مترجم کے قلم سے شیخ کے حالات اور ان کے کارناموں کا تذکرہ ہے۔ اردو ترجمہ عربی متن کے ساتھ ساتھ ہے جس کی وجہ سے خود عربی رسالہ سے براہ راست استفادہ بھی کیا جا سکتا ہے:۔

(۱) عربی جماعتیں دربار رسالت میں۔ ضخامت ۴۸ صفحات قیمت ۸/

(۲) فضائل اُمّت محمّدیہ۔ از مولانا عاشق علی بلند شہری ضخامت ۶۰ صفحات قیمت ۸/

(۳) اصحاب صفّہ۔ از مولانا عاشق علی بلند شہری ضخامت ۸۴ صفحات قیمت ۶/

(۴) چھ باتیں۔ از مولانا عاشق علی بلند شہری ضخامت ۸۴ صفحات قیمت ۶/

پتہ:۔ انیس احمد صاحب بستی نظام الدین اولیا دہلی

منشی انیس احمد صاحب نے عام مسلمانوں میں دینی معلومات پیدا کرنے کی غرض سے چھوٹے چھوٹے رسالے شائع کرنے کے لئے ایک مکتبہ قائم کیا ہے یہ چاروں رسالے اسی سلسلہ کی کڑی ہیں۔ پہلے رسالہ میں عرب کی ان مختلف جماعتوں کا تذکرہ ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ قدس میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوئیں اور پھر واپس ہو کر انھوں نے اپنے اپنے علاقوں میں اسلام کی تبلیغ کی۔ اس کا مطالعہ تبلیغ کا کام کرنے والے حضرات کے لئے بہت مفید ہوگا۔ دوسرے رسالہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ از روئے قرآن وحدیث امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے فضائل و مناقب کیا ہیں اور ان فضائل کی روشنی میں اس امت کا فریضۂ زندگی اور اس کا منصب کیا ہے؟ تیسرے رسالہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ایک مخصوص جماعت جو اصحاب صُفّہ کہلاتی ہے اور جس نے دنیوی عُسرت و معاشی مصائب و آلام کے باوجود اسلام کی راہ میں عظیم الشان قربانیاں کیں۔ اس کے ایمان افروز واقعات وحالاتِ زندگی لکھے گئے ہیں۔ چوتھے رسالہ میں حضرت

مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کی روشنی میں کلمہ طیبہ، نماز، علم و ذکر، اکرام مسلم اور اخلاص نیت و تفریغ وقت کی حقیقت و اہمیت کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ چاروں رسالے اس لائق ہیں کہ جو مسلمان ضخیم و طویل کتابیں نہیں پڑھ سکتے وہ فرصت کے اوقات میں ان کا مطالعہ کرکے دینی و روحانی فائدہ حاصل کریں۔

رسولِ عربی از سید فرید الوحیدی صاحب تقطیع خورد ضخامت ۹۶ صفحات کتابت و طباعت بہتر۔ قیمت ۱۲ / پتہ:۔ قومی کتاب گھر۔ دیو بند ضلع سہارنپور

یہ کتاب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے چیدہ چیدہ گوشوں پر اسکولوں کے بچوں اور بچیوں کے لئے لکھی گئی ہے اس لئے زبان سہل اور آسان اختیار کی گئی ہے اور واقعات بھی سادہ منتخب کئے گئے ہیں۔ ہر سبق کے شروع میں سبق کے بعض مشکل الفاظ اور آخر سبق میں اس کے متعلق سوالات دئے گئے ہیں۔ کتاب اس لائق ہے کہ بچوں کے نصاب تعلیم میں شامل کی جائے۔

نئی راہ کا قرآن نمبر مرتبہ جناب ظل عباس عباسی صاحب تقطیع متوسط ضخامت ۱۷۰ صفحات کتابت و طباعت بہتر قیمت عہ / پتہ:۔ ۹ بیرجی گوونڈی بلاکس ناگپاڑہ مبئی ۸

اس نمبر میں ہندو پاکستان اور مصر و روس کے قدیم و جدید ارباب قلم کے وہ مقالات یک جا شائع کئے گئے ہیں جو ان حضرات نے قرآن مجید کی تعلیمات اس کی عظمت۔ اور اس کی تاریخی اہمیت کے مختلف گوشوں پر مستقل مقالہ کی شکل میں یا کسی تصنیف کے ضمن میں لکھے ہیں جن حضرات کے مقالات اس مجموعہ میں شامل ہیں ان میں رشید رضا مصر۔ جوہر طنطاوی، موسیٰ جار اللہ۔ ابو الکلام آزاد۔ عبید اللہ سندھی خاص طور پر لائق ذکر ہیں۔ اس طرح اس ایک نمبر کے مطالعہ سے قرآن مجید سے متعلق مختلف قسم کی معلومات بیک وقت حاصل ہو سکتی ہیں امید ہے کہ مسلمان اور دوسرے ارباب ذوق غیر مسلم بھی جناب مرتب کی اس محنت و کاوش کی قدر کریں گے اور نمبر کا مطالعہ کرکے اس سے فائدہ اٹھائیں گے۔

REGISTERED NO. D. 183

مختصر قواعد ندوۃ المصنفین دہلی

۱۔ **محسن خاص** جو مخصوص حضرات کم سے کم پانچ سو روپیہ یکمشت مرحمت فرمائیں وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنینِ خاص کو اپنی شمولیت سے عزت بخشیں گے ایسے علم نواز اصحاب کی خدمت میں ادارے اور مکتبۂ برہان کی تمام مطبوعات نذر کی جاتی رہیں گی اور کارکنانِ ادارہ ان کے قیمتی مشوروں سے مستفید ہوتے رہیں گے۔

۲۔ **محسنین** جو حضرات پچیس روپیے مرحمت فرمائیں گے وہ ندوۃ المصنفین کے دائرہ محسنین میں شامل ہوں گے۔ ان کی جانب سے یہ خدمت معاوضہ کے نقطہ نظر سے نہیں ہوگی بلکہ عطیۂ خالص ہوگا۔ ادارے کی طرف سے ان حضرات کی خدمت میں سال کی تمام مطبوعات جن کی تعداد تین سے چار تک ہوتی ہے۔ نیز مکتبۂ برہان کی بعض مطبوعات اور ادارہ کا رسالہ "برہان" بلاکسی معاوضہ کے پیش کیا جائیگا۔

۳۔ **معاونین :۔** جو حضرات اٹھارہ روپیے پیشگی مرحمت فرمائیں گے ان کا شمار ندوۃ المصنفین کے حلقہ معاونین میں ہوگا انکی خدمت میں سال کی تمام مطبوعاتِ ادارہ اور رسالہ برہان (جس کا سالانہ چندہ چھ روپیے ہے) بلاقیمت پیش کیا جائے گا۔

۴۔ **احبّا۔** نو روپیے ادا کرنے والے اصحاب کا شمار ندوۃ المصنفین کے احبّاء میں ہوگا۔ ان کو رسالہ بلاقیمت دیا جائے گا اور طلب کرنے پر سال کی تمام مطبوعات نصف قیمت پر دیجائیں گی یہ حلقہ خاص طور پر علماء اور طلبہ کے لئے ہے۔

قواعد رسالہ بُرہان

(۱) برہان ہر انگریزی مہینے کی ۱۵ تاریخ کو شائع ہوتا ہے۔

(۲) مذہبی، علمی، تحقیقی، اخلاقی مضامین اگر وہ زبان و ادب کے معیار پر پورے اتریں برہان میں شائع کئے جاتے ہیں۔

(۳) باوجود اہتمام کے بہت سے رسالے ڈاک خانوں میں ضائع ہو جاتے ہیں۔ جن صاحب کے پاس رسالہ نہ پہنچے وہ زیادہ سے زیادہ ۲۵ تاریخ تک دفتر کو اطلاع دیں۔ ان کی خدمت میں پرچہ دوبارہ بلاقیمت بھیجدیا جائے گا۔ اس کے بعد شکایت قابلِ اعتنا نہیں سمجھی جائے گی۔

(۴) جواب طلب امور کے لئے ۲ر آنہ کا ٹکٹ یا جوابی کارڈ بھیجنا چاہئے۔ خریداری نمبر کا حوالہ ضروری ہے۔

(۵) قیمت سالانہ چھ روپئے۔ دوسرے ملکوں سے ساڑھے سات روپے (مع محصول ڈاک) فی پرچہ ۱۰ر

(۶) منی آرڈر روانہ کرتے وقت کوپن پر اپنا مکمل پتہ ضرور لکھئے۔

مولوی محمد ادریس پرنٹر پبلشر نے جید برقی پریس میں طبع کرا کر دفتر برہان جامع مسجد دہلی سے شائع کیا